افکار

بہتر بینکاری کے لئے
"بہترین" کا انتخاب

کم تر پر اکتفا کیوں کیجیے،
جب بینکاری کی ضروریات کے لئے آپ "بہترین" کا انتخاب کر سکتے ہیں۔
انتخاب کے لئے چند اشارے:۔

- ایسے بینک کا انتخاب کیجئے جو جدید بینکاری کے اعلیٰ معیار اور انفرادی اور پرخلوص خدمات کی روایت رکھتا ہو۔
(اپنے دوستوں سے پوچھئے کہ یو۔بی۔ایل کے بارے میں اُن کی کیا رائے ہے)
- دیکھئے کہ اس بینک کا دائرۂ خدمت کتنا وسیع ہے۔
(دائرۂ خدمت کی وسعت میں یو۔بی۔ایل کی برابری مشکل ہے)
- یہ بھی دیکھئے کہ یہ بینک کتنا ترقی پسند اور توسیع پذیر ہے۔
(یو۔بی۔ایل کی شاخوں کی تعداد بڑھ کر غیر ممالک میں اب ۴۹ اور پاکستان میں ۱۴۰۰ سے زیادہ ہوگئی ہے اور ان میں برابر اضافہ ہو رہا ہے)
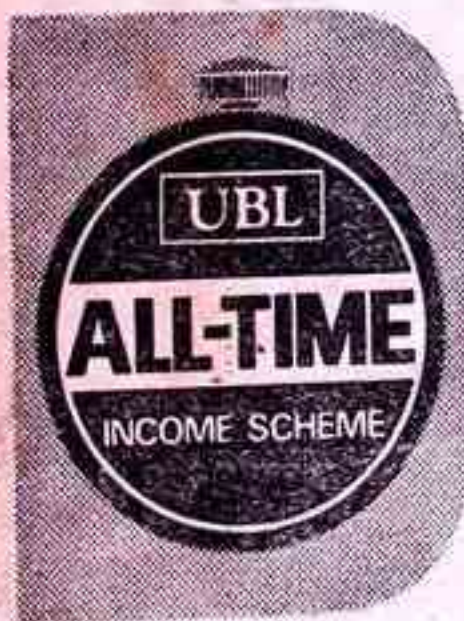
فیصلہ ان ہی باتوں کو سامنے رکھ کر کیجیے۔
بہرحال، اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ
بہتر بینکاری کے لئے "بہترین" بینک یو۔بی۔ایل ہی ہے۔

ترقی کی راہ میں آپ کا معاون

یو بی ایل

یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ

Paragon • 76 UBL-45 R
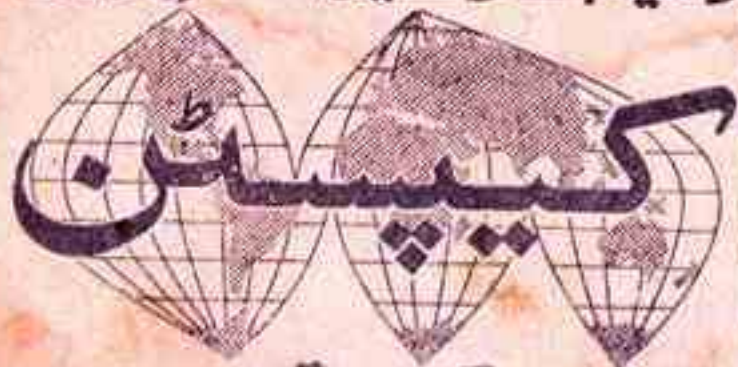
دنیا بھر میں اہلِ ذوق
کیپسٹن
طلب کرتے ہیں
CAPSTAN
FILTER
۴.۴۰ روپے میں ۳۰
۲.۲۰ روپے میں ۱۰

کچھ مشروبات محض ذائقہ ہیں اور کچھ محض رنگ
لیکن رُوح افزا بہار کی طرح خوشگوار
اور تازہ جیسے پھول

رُوح افزا دنیا کے ہر مشروب سے مختلف اور برتر، جسم کے نظام حرارت و برودت میں توازن و اعتدال پیدا کر کے گرمی کی شدت و تکلیف سے بچاتا ہے۔ ذائقہ، خوشبو، رنگ اور تاثیر میں کوئی مشروب اس کا ثانی نہیں۔ ۴۷ سال سے بے مثال اور مشرق و مغرب میں مقبول

جدید ٹیکنالوجی کا حاصل

نیا فِلپس آل ٹرانِسسٹر ٹی وی سیٹ

فلپس
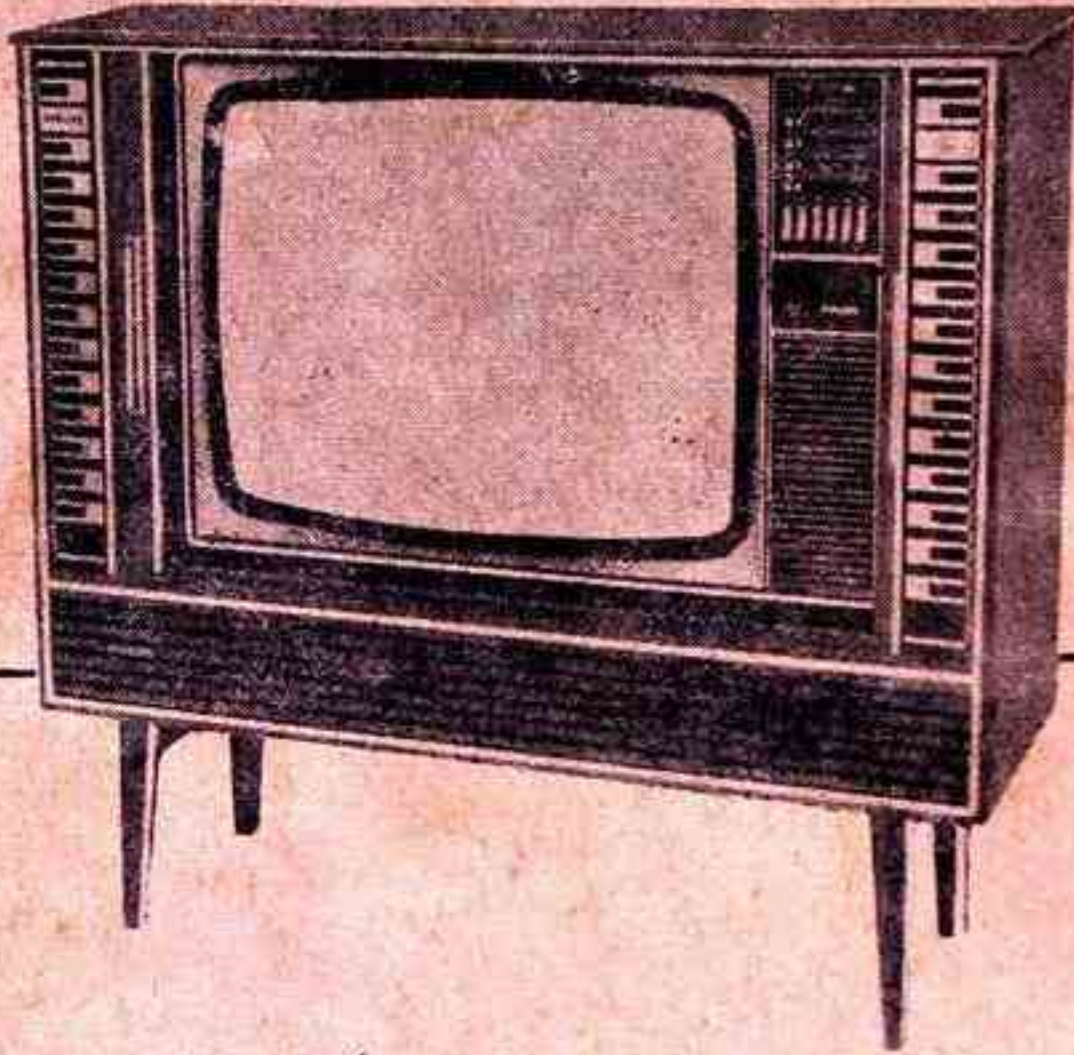
۲۰ انچ اور ۲۴ انچ آل ٹرانسسٹر ماڈل بمعہ سلائیڈنگ کنٹرول اور طلسمی دراز

فلپس کے نئے ٹی وی ماڈل، ۶ عظیم یورپی فلپس اداروں کے فنّی کمالات کا نتیجہ ہیں

فلپس ہالینڈ کی ڈائرکٹ
وژن پکچر ٹیوب

فلپس سوئٹزرلینڈ کے
ڈیزائن کیئے ہوئے خاص پرزے

فلپس سویڈن سے ٹیلیوژن
لہروں کی اعلیٰ انتخابی صلاحیت

فلپس آسٹریا کی مایۂ ناز
ایجاد "نف"

فلپس ٹی وی خرید کر آپ مستند گارنٹی
اور بعد از فروخت سروس کی ضمانت
بھی حاصل کرتے ہیں۔

فِلپس۔ دنیا بھر اور پاکستان میں بھی سب سے زیادہ فروخت ہونیوالا ٹی وی سیٹ

روزانہ لائف بوائے سے نہائیے
تندرست رہیئے۔ تازگی پائیے
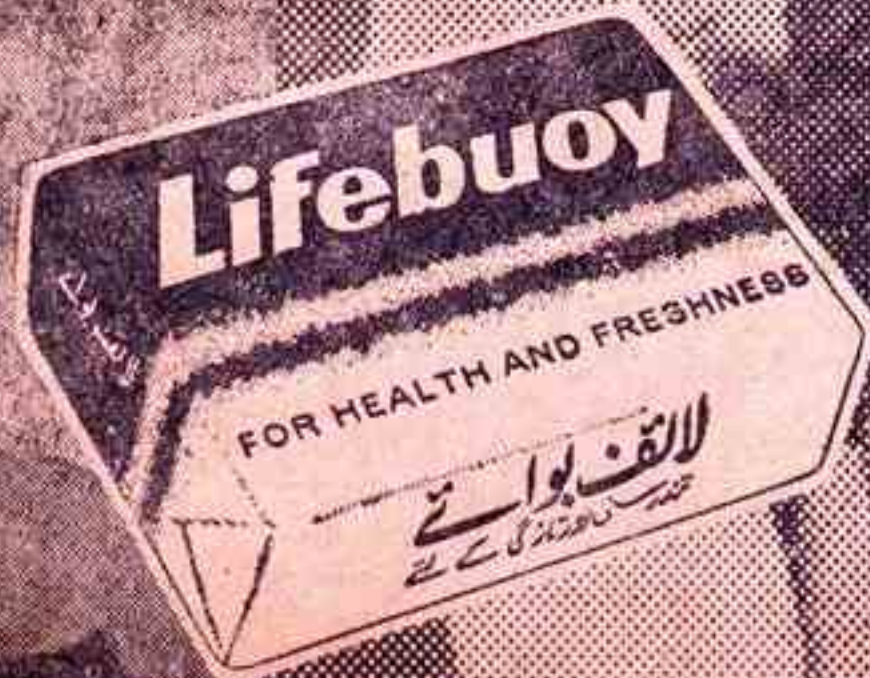
افکار

محکمۂ تعلیمات کراچی، لاہور، پشاور، کوئٹہ، راولپنڈی
جی ایچ کیو آرمی ایجوکیشن اور ایئر ہیڈکوارٹرز سے منظور شدہ

•

جاری شدہ ــــــــ ۱۹۴۵ء

ٹیلیفون نمبر ــــــــ ۲۱۴۰۷۹

کرشن چندر ایڈیشن

افکار

★

مدیر

صہبا لکھنوی

★

قیمت

آٹھ روپے

•

ــــــ زرِ سالانہ ــــــ

محصول ڈاک سے	رجسٹری سے	بیرونی ملکوں سے
۳۵/- روپے	۴۵/- روپے	۱۰ پونڈ - ۲۰ ڈالر

مکتبۂ افکار

رابسن روڈ - کراچی

ـــ برٹش فورڈ آفس ـــ

(۲۴- پارک ہل ڈرائیو - بریڈفورڈ دلڈ یارکس - یو کے)

ان گنت دستاویزی اشاعتوں کے بعد

افکار

کی ایک اور فخریہ پیشکش

برطانیہ میں اُردو

ایڈیشن

تکمیل کے آخری مراحل میں

ادبی رسالوں کی تاریخ میں پہلی بار افکار مستشرقین کا مستند جائزہ انگلستان میں مقیم ادیبوں، شاعروں، افسانہ نگاروں صحافیوں نثر کاروں اور اردو انجمنوں وغیرہ کی نمایندہ فہرست، برطانیہ میں صحافت کا ارتقا، بی بی سی کی اردو خدمات، انڈیا آفس لائبریری، برٹش میوزیم، مانچسٹر کے مخطوطات، فورٹ ولیم کالج، ایشیاٹک سوسائٹی، دہلی کالج، انجمن پنجاب کے علاوہ سندھی، بلوچی، پنجابی، پشتو اور کشمیری زبان وادب کی ترقی میں انگریزوں کے کام پر تحقیقی مضامین پیش کر رہا ہے۔

برطانیہ میں اردو ایڈیشن — آج اور ہمیشہ حوالہ کا کام دے گا —

نئے سالانہ ممبر۔ زرسالانہ ۴۵/ روپے (رجسٹری سے) بھیج کر یہ عظیم ومنفرد پیش کش رعایتی قیمت میں حاصل کر سکتے ہیں۔ معلومات کے لیے:

مکتبۂ افکار۔ رابسن روڈ کراچی

ترتیب

یادوں کے چنار

(شخصیت کی جھلکیاں)

دل کی وادیاں سو گئیں

(خطوط کے آئینے میں)

طلسم خیال

(کرشن چندر کی منتخب تخلیقات)

نغمے کی موت

(یادیں اور آنسو)

خودنوشت

سال: ۳۳ ★ مئی ۷۷ء ۱۹ ★ شمارہ: ۸۶

اشاریہ

کرشن چندر کے نام آخری خط

پیارے کرشن!——

پچھلے دنوں جب تم نے صحت یاب ہونے کے بعد کراچی کے بعض قریبی احباب محمد علی صدیقی، ابن انشا، ابراہیم جلیس وغیرہ کو خط لکھے اور ہر خط میں دریافت کیا۔ "صہبا کیسے ہیں؛ میرا سلام کہہ دیں۔ انھیں بھی جلد خط لکھوں گا" تو یقین جانو جب سے روزانہ تمھارے خط کا انتظار کر رہا ہوں——

اور ابھی کچھ دن پہلے جب کسی نے یہ خبر سُنائی کہ تم دل کے عارضہ میں انتقال کر گئے۔ تو مجھے قطعی یقین نہیں آیا اور اسی لیے میں نے سلمیٰ بھابی سے رسمی تعزیت بھی ضروری نہیں سمجھی——

میں کیسے یقین کر لوں کہ تم دل کے عارضہ میں مر سکتے ہو، جب کہ تمھارا دل ساری انسانیت کے دکھ درد کا شوالہ بنا رہا— تم تو گزشتہ چالیس سال سے اپنے قلم کی پوری توانائی سے عوام کی آزادی، خوش حالی، دنیا میں امن، انصاف اور جمہوریت کے قیام کے لیے جنگ کرتے رہے ہو— اتنی آسانی سے کبھی نہیں مر سکتے۔ اس کا مجھے یقین ہے۔ تم جو ایک ابدی سچائی ہو، تم جو ایک نغمہ ہو، تم جو ایک خوشبو ہو— تمھیں دل کا عارضہ کیسے ہو سکتا ہے— کہ تم جس نے اپنے دل کی بے کراں وسعتوں میں انسانیت کا دکھ درد سمیٹ لیا تھا، دل کے عارضہ کا شکار کیسے ہو سکتا ہے اور کیونکر مر سکتا ہے——

تم نے تو ساری عمر غربت، افلاس، بھوک، بیماری، ظلم، جبر استحصال

اور انسان کی انسان پر برتری کے خلاف آواز اٹھائی' اور کچلی ہوئی انسانیت کو جینے کا حوصلہ دیا ـــ دل کے ہاتھوں کیسے "شکست" کھا سکتے ہو ـــ تم تو امر ہو میرے دوست! ـــــ

تم نے تو نفرتوں سے بھری پڑی دنیا میں اپنے فکر و فن سے سدا محبتوں کے پھول کھلائے، امن و آشتی کی روشنیاں بکھیریں۔ مسرت و خوش حالی کے دیے جلائے، دوستوں کو پیار دیا، اپنوں کو بھی، غیروں کو بھی سینے سے لگایا ـــ ان کے دکھ درد بانٹے ـــ اپنے مشن کی تکمیل سے پہلے، اور انسانیت کو آسودگی اور طمانیت سے ہمکنار کیے بغیر دنیا سے کیسے منہ موڑ سکتے ہو۔ تمھارے جیتے جاگتے کردار اور تمھارے محبوب عوام تمھیں اتنی آسانی سے کیسے جانے کی اجازت دے سکتے ہیں! ـــــ

ـــ اور پھر تمھاری جنم بھومی وزیرآباد، تمھارے بچپن کا سدابہار کشمیر اور تمھاری جوانی کا شاداب لاہور بھی تو تمھاری آمد کا کب سے منتظر ہے! ـــــ

یہ وہی لاہور ہے جہاں تم نے جوانی کے بہترین ایام بسر کیے تھے اور جو تمھیں ہمیشہ یاد آتا رہا ـــ تم بظاہر جسم کے ساتھ بمبئی میں آباد تھے لیکن تمھارا دل اور تمھاری روح لاہور کے گلی کوچوں میں سیر کرتی رہی۔ اب لاہور ہی نہیں ـــ کراچی ایسا بڑا شہر بھی دیدۂ دل فرش راہ کیے تمھاری آمد کا منتظر ہے ـــ ضرور آؤ اور پہلی فرصت میں آؤ ـــ!

اور ہاں ابھی اور اسی وقت اپنے "پیارے صہبا" کو ایک پیارا سا خط بھی لکھو کہ تم اب کیسے ہو، کس حال میں ہو اور ادھر کب تک آنے کا ارادہ رکھتے ہو ـــ!

میں تمھارے جواب کا منتظر ہوں ـــــ

تمھارا اپنا

ـــــــــ صہبا

ڈاکٹر احمد حسن

سازِ حیات ـ کرشن چندر کی کہانی ـ لفظوں کی زبانی

آبا و اجداد

وزیر آباد ضلع گوجرانوالہ چھتریوں کا ایک قدیم خاندان آباد تھا۔ اسی خاندان کے ایک فرد گوری شنکر تھے جنھوں نے ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کی۔ یہی ڈاکٹر گوری شنکر کرشن چندر کے والدِ محترم تھے۔ ۱۹۱۵ء میں اُن کا تقرر بحیثیت میڈیکل آفیسر کشمیر کی علاقائی ریاست پونچھ میں ہوا تھا اور تا اختتامِ ملازمت ڈاکٹر گوری شنکر یہیں رہے۔ ۱۹۴۲ء میں ملازمت سے سبک دوش ہو کر دہلی چلے آئے تھے۔ انھیں فنِ طب کے علاوہ دوسرے فنونِ لطیفہ خصوصاً اُردو ادب سے بے حد دلچسپی تھی۔ ایک اچھا مقرر ہونے کے علاوہ، وہ اردو ادب کا خاصہ مطالعہ رکھتے تھے۔ شاعری کی طرف بھی رجحان تھا، مگر صرف گیت لکھا کرتے تھے۔ ڈاکٹر گوری شنکر نے ایک پُر وقار اور خوش حال زندگی گزاری۔ دہلی آنے کے بعد وہاں کی ادبی محفلوں میں اُن کے ذوق کی آسودگی کو ابھی صرف سات سال ہی ہوئے تھے کہ ۱۹۵۱ء میں اُن کا انتقال ہو گیا۔

کرشن چندر ۱۹۱۴ء میں پیدا ہوئے اُس وقت ڈاکٹر گوری شنکر وزیر آباد میں تھے، وزیر آباد جسے مولانا ظفر علی خاں، حامد علی خاں ایڈیٹر رسالہ ہمایوں، راجہ مہدی علی خاں اور مہاشے کرشن ایڈیٹر "پرتاپ" جیسی مشہور ہستیوں کا وطن ہونے کا فخر ہے۔ کرشن چندر کی ولادت نے وزیر آباد کو اور بھی تاریخی اہمیت دیدی۔

ولادت

کرشن چندر ۲۳ر نومبر ۱۹۱۴ء کو وزیر آباد ضلع گوجرانوالہ (حال مغربی پاکستان) میں، صبح ۶ بجے پیدا ہوئے۔

بہن بھائی

کرشن چندر کی ایک بہن سرلا دیوی (جو مشہور ڈرامہ نگار ریوتی سرن شرما کی بیوی ہیں) اور دو بھائی مہندر ناتھ اور اوپندر ناتھ ہیں۔ تیسرے چھوٹے بھائی راجیندر ناتھ کا بچپن ہی میں انتقال ہو گیا تھا۔ مہندر ناتھ، کرشن چندر سے چھوٹے ہیں۔ ان کا شمار اُردو کے مشہور و ممتاز افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے[1] اوپندر ناتھ سرکاری ملازم ہیں۔ سرلا دیوی بھی لکھتی ہیں[2]

اسکول کی زندگی کا پہلا طنزیہ اسکیچ

اپنے فارسی کے استاد ماسٹر بلاقی رام کے عجیب و غریب کردار و ہیئت سے متاثر ہو کر اُنھوں نے "پروفیسر بلیکی" کے عنوان سے ایک افسانہ لکھا جو اخبار ریاست، دہلی میں شایع ہوا تھا۔ اس طنزیہ کی اطلاع جب کرشن چندر کے والد کو ہوئی تو انھوں نے سخت سزا دی۔ پھر ایم۔ اے تک کرشن چندر نے کچھ نہیں لکھا۔

تعلیم :-

(۱) پانچ سال کی عمر میں مہنڈر (واقع کشمیر) کے پرائمری اسکول میں داخل ہوئے۔

(۲) آٹھویں جماعت سے وکٹوریہ جوبلی ہائی اسکول (پونچھ) میں تعلیم حاصل کی اور وہیں سے سیکنڈ ڈویژن میں دسویں جماعت کا امتحان پاس کیا۔

(۳) ہائی اسکول کا امتحان پاس کر کے فارمن کرسچین کالج لاہور میں داخلہ لیا اور سائنس کے مضامین

(ص)

[1] افسوس کہ اُن کا بھی انتقال ہو گیا۔

۔ کر ایف۔ ایس سی پاس کیا۔ اُن کے والد انھیں ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے۔ لیکن خود کرشن چندر کا رجحان سیاست، تاریخ، معاشیات اور ادب کی طرف تھا۔ چنانچہ بی۔ اے میں اُن کے پاس یہی مضامین تھے۔

(۴) بی۔ اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد ۱۹۳۴ء میں پھر انھوں نے انگریزی ادب میں ایم۔ اے کیا۔

(۵) ایم۔ اے کے بعد لا کالج لاہور میں داخلہ لیا اور ۱۹۳۷ء میں ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا۔

(۶) صرف ہائی اسکول تک کرشن چندر کے مضامین میں اُردو اور فارسی زبانیں شامل تھیں۔ ذاتی مطالعے سے انھوں نے اردو زبان و ادب میں اعلیٰ صلاحیت حاصل کی۔

ادارت: شروع ہی سے کرشن چندر کا رجحان ادب اور سیاست کی طرف تھا۔ دورانِ تعلیم میں وہ فارمن کرسچین کالج میگزین کے ایڈیٹر رہے۔ پھر جب ایم۔ اے میں آئے تو شعبۂ انگریزی کے رسالے کے چیف ایڈیٹر ہو گئے۔

تعلیم ختم کرنے کے بعد پروفیسر سنت سنگھ کے ساتھ مل کر انگریزی کا ایک پرچہ
"THE NORTHBRN REVIEW"
نکالنا شروع کیا۔ یہ پرچہ تقریباً گیارہ ماہ تک نکلتا رہا۔ پھر فریدہ نامی ایک انگریز خاتون کے اشتراک سے انگریزی ماہنامہ "THE MODERN GIRL" شائع کیا۔ 'نیا ادب' کے ادارے میں بھی وہ شامل رہے۔ "نئے زاویے" کی دو جلدیں بھی انھوں نے مرتب کیں۔

ملازمت:- کرشن چندر نے اپنی زندگی میں دو ہی بار ملازمت کی۔ نومبر ۱۹۳۹ء میں آل انڈیا ریڈیو لاہور نے پروگرام اسسٹنٹ کی پیشکش تو انھوں نے منظور کر لی۔ ایک سال تک لاہور میں کام کیا پھر دہلی ریڈیو اسٹیشن پر آ گئے۔ دہلی میں ایک سال رہنے کے بعد لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن بھیج دیے گئے۔ ریڈیو کی ملازمت کے دوران ہی کرشن چندر کو ڈبلیو۔ زیڈ۔ احمد نے اپنی فلم کمپنی "شالیمار پکچرز" پونے بلا لیا۔ جوش ملیح آبادی بھی اسی کمپنی سے وابستہ تھے۔ یہ تبدیلی کرشن چندر کے رجحانات کے عین مطابق تھی۔ اگر وہ ریڈیو کی سرکاری ملازمت ترک نہ کرتے تو آج ایک بڑے اسٹیشن ڈائرکٹر یا ڈائرکٹر جنرل ہوتے۔

کالج کی زندگی کا پہلا افسانہ!

کالج کی تعلیم کے دوران کرشن چندر سخت بیمار ہو گئے۔ "یرقان" کی شکایت ہو گئی تھی۔ اچھا ہونے کے بعد اسی عنوان سے انھوں نے اپنا پہلا افسانہ لکھا جو "ادبی دنیا" لاہور میں شائع ہو کر مقبول ہوا تھا۔

سیاسی اور انقلابی رجحانات

بچپن ہی سے کرشن چندر ایک آزاد اور انقلابی زندگی کا رجحان رکھتے تھے۔ کالج کے پہلے ہی سال میں وہ دہشت پسندوں کی جماعت میں شامل ہو گئے۔ اُن کے دو ساتھیوں پریم ناتھ کو پانچ سال اور کشوری لال کو حبسِ دوام کی سزا ہوئی تھی۔ اُن ہی دنوں کرشن چندر کی ملاقات بھگت سنگھ سے ہوئی۔ چند ماہ کے لیے کرشن چندر کلکتہ چلے گئے، ایک ماہ تک بنگال کے دیہات میں گھوم کر وہاں کی غربت، جہالت اور دوسرے سماجی پہلوؤں پر غور کرتے رہے۔ پھر کسی نہ کسی طرح واپس کالج لائے گئے۔ یہاں کالج یونین میں سرگرم حصہ لیا۔ اُسی زمانے میں مارکس، اینگلز اور لینن کی تعلیمات کا گہرا مطالعہ کیا۔ دورانِ تعلیم ہی میں سوشلسٹ پارٹی میں شامل ہوئے۔ پنجاب کے چند دیہات کا دورہ کیا۔ وہ دُور دُور گاؤں میں نکل جایا کرتے تھے۔ فاقوں سے بھی واسطہ پڑا۔ انھوں نے خاکروبوں کی تحریک میں بھی حصہ لیا۔ کشمیر میں رہنے کی وجہ سے وہاں کے سیاسی اور سماجی حالات کا بہت قریب سے مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ ہر چند کرشن چندر سیاسی زندگی تو نہ گزار سکے لیکن اُن کے یہ تجربات ادب میں بہت کام آئے۔

کرشن چندر کے شوق

زمانۂ طالبِ علمی میں کرشن چندر کے محبوب مشغلے کبڈی، پہلوانی، تیراکی، کرکٹ اور فٹ بال تھے۔

سیر و سیاحت، قدرتی مناظر کا مشاہدہ اور کتابوں کا مطالعہ بھی اُن کا محبوب مشغلہ رہا۔

ادبی زندگی: کرشن چندر کو بچپن ہی سے اردو ناولوں اور داستانوں سے دلچسپی تھی۔ وہ چھپ چھپ کر "الف لیلہ کی کہانیاں" پڑھا کرتے تھے۔ اُن کی والدہ ناراض ہوتی تھیں۔ کچھ اور شعور پیدا ہوا تو پریم چند

کی کہانیوں کا مجموعہ "پریم پچیسی" پڑھا تیسری کتاب جو انھوں نے پڑھی وہ سُدرشن کی کہانیوں کی تھی۔ اُس کے بعد خود لکھنے کا ذوق اُبھرا تو اسکول کی زندگی میں ایک طنزیہ "پروفیسر بلیکی" اور کالج کے زمانے میں پہلا افسانہ "یرقان" لکھا اُن کے والد نے بھی اختتامِ تعلیم تک کچھ نہ لکھنے کی ممانعت کر دی تھی۔ ایل ایل بی کرنے کے بعد کرشن چندر نے انگریزی میں مضامین لکھنے شروع کیے۔ ان کی نوعیت معاشی اور سیاسی ہوتی تھی اور یہ لاہور کے مشہور روزنامہ "ٹریبون" (TRIBUNE) میں شایع ہوا کرتے تھے۔ ۲۱ر اپریل ۱۹۳۸ء کو جب علامہ اقبال کا انتقال ہوا تو انھوں نے "ٹریبون" ہی میں ایک مضمون لکھا جو بے حد پسند کیا گیا۔ اُس میں کرشن چندر نے اقبال کی چند نظموں کے تراجم بھی پیش کیے تھے "THE NORTHERN REVIEW" اور "THE MODERN GIRL" میں بھی انھوں نے مضامین لکھے۔ اگر وہ انگریزی میں لکھتے رہتے تو انگریزی زبان کے ایک بڑے قلم کار ہوتے۔ لیکن وہاں تو اُردو زبان کا چسکا پڑ چکا تھا اور اس زبان میں لکھنے کے لیے اُن کے اندر کا چھپا ہوا ادیب انھیں بے چین کر رہا تھا۔ چنانچہ ادبی زندگی اختیار کرنے کے عزم کے ساتھ جب اُن کا پہلا افسانہ "جہلم پر ناؤ میں" شایع ہوا تو سب کی نگاہیں اُن کی طرف یکایک اٹھ گئیں۔ ادبی حلقوں کو اُن میں چھپے ہوئے جوہر کا احساس ہونے لگا پھر تو لکھنے کا سلسلہ مستقل ہو گیا۔ اسی دور کے مشہور رسائل نے کرشن چندر کے افسانوں کو نمایاں جگہ دی۔ بہت جلد وہ شہرت کی منزلیں طے کرنے لگے اور اسی کے ساتھ اُن کا سیاسی و سماجی نقطۂ نظر ترقی پسندانہ بنتا گیا۔ اسلوب میں انفرادیت پیدا ہونے لگی۔ یہ واقعہ ہے کہ جتنی جلد کرشن چندر کو شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی کم ادیبوں کو حاصل ہوئی ہوگی۔

۱۹۳۶ء میں جب پہلی بار ترقی پسند مصنّفین کی کانفرنس کلکتہ میں ہوئی تو کرشن چندر نے پنجاب کی صوبائی انجمن کی نمائندگی کی۔ یہیں وہ سجاد ظہیر، پروفیسر احمد علی اور دوسرے ساتھیوں سے متعارف ہوئے۔ انھیں انجمن ترقی پسند مصنّفین پنجاب کا سکریٹری چنا گیا۔ پھر دہلی اور بمبئی کی سکونت کے دوران بھی انھیں مرکزی انجمن ترقی پسند مصنّفین کا سکریٹری بنایا گیا۔

کرشن چندر کا پہلا ناول

کرشن چندر نے اپنا پہلا ناول "شکست" ساقی بک ڈپو کی فرمایش پر کشمیر کے گلمرگ ہوٹل میں رہ کر صرف ۱۲ دن میں لکھا تھا اور اُن کا یہ ناول اتنا مقبول ہوا کہ اُس کے کئی ایڈیشن تھوڑی سی مدت میں چھپ گئے۔

فلمی زندگی:۔ ۱۹۴۲ء میں ڈبلیو۔ زیڈ۔ احمد نے کرشن چندر کو لکھنؤ سے پونہ اپنی فلم کمپنی میں مکالمے لکھنے کے لیے بلایا تھا۔ وہ کرشن چندر کی ایک کہانی "سفید خون" پڑھ کر بے حد متاثر ہوئے تھے۔ دو سال تک پونہ رہنے کے بعد کرشن چندر ۱۹۴۴ء میں بمبئی آ کر بمبئی ٹاکیز سے منسلک ہو گئے۔ ایک سال تک اس کمپنی میں کام کیا پھر نیشنل تھیٹر کے اشتراک سے ایک فلم کمپنی قایم کی، اور فلم "سرائے کے باہر" بنائی اُس کے بعد ماڈرن تھیٹر کے نام سے اپنی ذاتی کمپنی قایم کی اور اُس کے تحت ایک مکمل فلم "دل کی آواز" بنائی۔ دوسری تصویر "راکھ" نصف بن پائی تھی کہ کمپنی ٹوٹ گئی۔ اور زبردست نقصان ہوا۔ اُس وقت کرشن چندر کو صحیح طور پر احساس ہوا کہ وہ فلمی تجارت کے لیے پیدا نہیں ہوئے ہیں بلکہ قلمی محنت سے اپنی زندگی سنوار سکتے ہیں۔ اُس وقت سے اب تک وہ دوسری فلم کمپنیوں کے لیے مکالمے اور ... SCREE PLAYS لکھتے رہے ہیں۔

نہرو ایوارڈ

نومبر ۱۹۶۶ء میں کرشن چندر کو اُن کی عالمی امن کوششوں اور ہند سوویت دوستی کی لے کو بڑھانے کے سلسلے میں آٹھ ہزار روپیہ کا نہرو ایوارڈ ملا۔

کرشن چندر کی فلمی زندگی، اُن کی زندگی کا ایک حصہ اور ایک طرح کی مجبوری ہے۔ اُن کی حقیقی زندگی ادبی ہی ہے جس کا انھوں نے ہمیشہ خیال رکھا، اور جسے برابر بڑھاتے رہے۔ اُن کی اپنی کتابیں بکثرت چھپنے اور فروخت ہونے لگیں۔ ایک ادیب کی حیثیت سے وہ

معروف ترین زندگی گزارنے لگے۔

اب یہ عالم ہے کہ اُدھر وہ کوئی کہانی یا ناول اردو میں لکھتے ہیں، اُدھر بیک وقت ملک کی بڑی بڑی زبانوں میں اُس کا ترجمہ ہو جاتا ہے۔ مختلف زبانوں کے رسائل اور پبلشرز اس بات پر آنکھیں لگائے رہتے ہیں کہ کب وہ کچھ لکھیں اور کب اُسے جھپٹ لیا جائے۔ ہندوستان ہی کی طرح پڑوسی ملک پاکستان میں بھی وہ مقبول ہیں۔ پاکستان کے عوام و خواص اُن کی بے حد قدر کرتے ہیں۔ وہاں شہرت اور مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ گھٹیا قسم کے ناول لکھ کر اور اُن پر کرشن چندر کا نام ڈال کر شایع کر دیا جاتا ہے۔ یہ جان کر حیرت ہوتی ہے کہ سخت فلمی مصروفیات کے باوجود وہ مطالعے، مسلسل لکھتے رہنے اور لوگوں سے ملنے کے لیے وقت نکال لیتے ہیں۔ یہ کسی کو نہیں معلوم کہ وہ کب لکھتے ہیں؟

بیرونی ممالک کے تراجم

بیرونی ممالک میں کرشن چندر کی جو کتب میں ترجمہ ہوئی ہیں اُن کی تعداد بہت کافی ہے۔ یہ کتابیں بے حد خوب صورت شایع ہوئی ہیں۔ اکثر با تصویر ہیں اور کسی نہ کسی کا دیباچہ یا مقدمہ اُن میں شامل ہے۔

کرشن چندر کی خصوصیات: کرشن چندر بڑے مہمان نواز، ملنسار، خلیق اور پُر خلوص انسان ہیں۔ شرافت، محبت اور نیکی کا اُنھیں اعلیٰ نمونہ کہنا چاہیے۔ صبر و ضبط، عزم و اعتماد اور فنی ریاضت میں اُن کا کوئی جواب نہیں۔ مشرقی تہذیب کے دل دادہ، گھر میں عام طور پر بڑی مُہری کا پاجامہ اور لکھنوی کُرتا پہنتے ہیں۔ میز کرسی کے بجائے تخت پر بیٹھ کر تکیوں سے لگ کر بالکل مشرقی انداز سے لکھتے ہیں۔ وہ نفاست پسند ہیں اور خوبصورت چیزوں سے اُنھیں عشق ہے۔ عالمی ادب پر اُن کی نظر گہری ہے۔ وہ دوسری مُلکی زبانوں کے ادب، اُن کے ادیبوں، شاعروں اور تحریکوں کا بھی کسی نہ کسی حد تک علم و وقوف رکھتے ہیں۔ اپنی کمزوریوں کو خود محسوس کرنا، تنقید کو خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کر لینا اپنی شہرت و عظمت پر مغرور نہ ہونا، کسی بھی سلسلے میں کوئی سخت لہجہ اور رویہ اختیار نہ کرنا کرشن چندر کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ لہجہ میں نرمی، حرکات میں اضطراب اور آنکھوں میں چمک کرشن چندر کی پہچان ہیں۔

کرشن چندر بیرونی ممالک میں: بہت جلد کرشن چندر کی شہرت نے بیرونی ممالک میں اپنے پر و بال پھیلا لیے۔ دنیا کی متعدد زبانوں کے قارئین اُنھیں جانتے اور پسند کرتے ہیں۔ انگریزی، روسی، ڈچ، ناروی، فرانسیسی، جرمن، چیک، رومانی، پولستانی، ہنگرین اور سلواک زبانوں میں اُن کی منتخب کہانیوں اور اُن کے ناولوں کے تراجم ہو چکے ہیں۔ ایشیائی ممالک میں فارسی، چینی، سنہالی، کوریائی اور جاپانی زبانوں میں بھی ترجمے ہوئے ہیں۔ روس میں تو وہ سب سے زیادہ مقبول ہیں۔ دو بار روس جا چکے ہیں۔ انھوں نے چین، انگلینڈ اور کئی دوسرے بیرونی ممالک کی سیاحت بھی کی ہے۔

کرشن چندر پر تحقیق: ایک اُزبیک خاتون رالزا ایوا کو جو تاشقند یونیورسٹی میں اُردو اور ہندی زبانیں پڑھاتی تھیں اور سنہ ۱۹۶۰ء میں ہندوستان بھی آئی تھیں، ماسکو بھیجا گیا جہاں اُنھوں نے دو سال میں کرشن چندر کے ناولوں اور افسانوں پر تحقیقی مقالہ لکھا۔ سنہ ۱۹۵۰ء میں خود میں نے کرشن چندر کی شخصیت اور تصانیف پر تحقیق کا ارادہ کیا اور تین سال کی لگاتار محنت کے بعد اُن پر ایک طویل تحقیقی مقالہ لکھ کر الٰہ آباد یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ کرشن چندر پر گزشتہ ۲۵ سال میں مختلف رسائل میں بے شمار مضامین لکھے جا چکے ہیں۔ لیکن افسوس کہ وہ رسائل نہ کرشن چندر کے پاس ہیں اور نہ کسی دوسرے شخص نے اب تک اُن کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔

(بہ شکریہ "شاعر" (بمبئی) کرشن چندر نمبر)

تصانیف : کرشن چندر نے اپنی چالیس سالہ ادبی زندگی میں بے پناہ لکھا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق انھوں نے ۵ ہزار سے زیادہ افسانے لکھے ہیں اور اُن کی تصانیف کی تعداد ایک صد سے زائد ہوگی۔ مکتبۂ افکار کراچی کو یہ فخر حاصل ہے کہ اُس نے اُن کے دو افسانوں کے مجموعے "کالا سورج" اور "ایک خوشبو اُڑی اُڑی سی" اور پانچ ناول "آسمان روشن ہے"، "ایک عورت ہزار دیوانے"، "سڑک واپس جاتی ہے"، "ایک وائلن سمندر کے کنارے" اور "چاندی کا گھاؤ" شایع کیے۔ اُن کی چند مقبول و پسندیدہ تصانیف میں حسب ذیل قابلِ ذکر ہیں:

"طلسم خیال"، "ہوائی قلعے"، "ٹوٹے ہوئے تارے"، "زندگی کے موڑ پر"، "ان داتا"، "ہم وحشی ہیں"، "سمندر دور ہے"، "نئے غلام"، "نغمے کی موت"، "اجنتا سے آگے"، "ایک گرجا ایک خندق"، "میں انتظار کروں گا"، "جب کھیت جاگے"، "طوفان کی کلیاں"، "دل کی وادیاں سوگئیں"، "باون پتے"، "ایک گدھے کی سرگذشت"، "دادر پل کے بچے"، "میری یادوں کے چنار"، "ایک گدھا نیفا میں"، "کاغذ کی ناؤ"، "درد کی نہر"، "شکست"، "شکست کے بعد"، "کتاب کا کفن"، "مسکرانے والیاں"، "ہائیڈروجن بم کے بعد"، "پودے"، "جب صبح ہوتی ہے"، "الٹا درخت"، "نظارے"، "گدھے کی واپسی"، "ہانگ کانگ کی حسینہ"، "فلمی قاعدہ"، "خرگوش کا فتنہ"، "ایک روپیہ ایک پھول"، "قاہرہ کی ایک شام"، "دروازے کھول دو"، "تین غنڈے"، "پرانے خدا"، "دل کسی کا دوست نہیں"، "غدار"، "برف کے پھول"، "مٹی کے صنم"، "لندن کے سات رنگ"، "پانچ لوفر ایک ہیروئن"، "سونے کی صندوقچی"، "لال تاج"، "پانی کا درخت"، "پل کے سائے میں"۔

چند یادگار انتسابات

آسمان روشن ہے :-

"ہندوستان اور پاکستان کے درمیان
آسمان روشن رکھنے والوں کے نام"

——— کرشن چندر

ایک خوشبو اُڑی اُڑی سی :-

"پاکستان اور بھارت کے تہذیبی
رشتوں کے نام !"

——— کرشن چندر

سڑک واپس جاتی ہے :-

"ہندوستان اور پاکستان کے اُن دیانت دار ناشرین کے نام۔
جن کے دم سے ادب کی آبرو، ادیبوں کا ناموس و نشر و اشاعت
کے پیشے کی عزت و عصمت محفوظ ہے۔"

——— کرشن چندر

(ادارۂ افکار)

کرشن چندر

آئینہ خانے میں

کرشن چندر نے یہ سیلف پورٹریٹ (جس کا حوالہ راقم الحروف کے نام خطوط میں بھی ہے) بطور خاص "افکار" کے لیے لکھا تھا جو شایع ہوکر بے حد مقبول ہوا — پھر "آئینہ خانے میں" کا یہ سلسلہ اتنا پسند کیا گیا کہ قرۃ العین حیدر، راجندر سنگھ بیدی، میرزا ادیب اور سید انور وغیرہ نے بھی اپنے اپنے انداز میں آئینہ کے سامنے کھڑے ہوکر اپنا جائزہ لیا۔ یہ تمام سیلف پورٹریٹ افکار میں چھپ چکے ہیں۔
کرشن چندر کا یہ سیلف پورٹریٹ اُن کے منفرد انداز نگارش کا آئینہ دار ہے۔

(صہبا)

ہرانسان کو آئینے میں اپنی صورت اچھی نظر آتی ہے۔ نہ آئے تو وہ آئینہ دیکھے ہی کیوں؟ — اس میں آئینے کا اتنا قصور نہیں ہے، جتنا دیکھنے والے کا۔

دراصل ہرانسان آئینہ دیکھتے وقت اپنے اندر سے ایک دوسرا آئینہ نکال کر اسے پہلے آئینے میں چھپا کر رکھ دیتا ہے۔ اور اس میں اپنی صورت دیکھتا ہے۔ پھر یکایک دنیا بدل جاتی ہے۔ بچہ جوان ہوجاتا ہے۔ بدصورت عورت حسین ہوجاتی ہے قاتل فرشتہ بن جاتی ہے۔ میں اندر کے آئینے کو توڑ دینے کے حق میں نہیں ہوں۔ کیونکہ اسی عمل سے پیاسے کو پانی ملا ہے۔ بھوکے کو روٹی ملی ہے اور جاہل نے تہذیب کا گیت سُنا ہے۔ یہ خود فریبی سراسر دھوکا نہیں ہے۔ اپنے آپ کو بدل دینے کی ایک لاشعوری کوشش بھی ہے —

جب کوئی شخص اپنی تعریف کرتا ہے، تو وہ صرف یہ نہیں کہتا۔ دیکھو۔ دیکھو میں کتنا اچھا ہوں! — وہ یہ بھی کہتا ہے، ہائے! میں کتنا اچھا ہوسکتا تھا۔ اس کی تعریف میں خود اس کی محرومی کا راز اور اس کے مستقبل کی تلاش چھپی ہوئی ہے۔ اور یہ محرومی ہرانسان کے حصے میں آتی ہے۔ چاہے وہ ادیب ہو، بڑھئی ہو — یا وزیر اعظم ہو اس محرومی سے کوئی خالی نہیں ہے۔ ہر اعتبار سے آسودہ انسان کو اپنی تعریف کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ خود زندہ رہنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ زندگی تو محرومی اور مسرت کے درمیانی فاصلے کو کہتے ہیں —

ممکن ہے آپ نے اپنی زندگی میں چند مکمل آسودہ انسان دیکھے ہوں۔ میں نے بھی دیکھے ہیں۔ خوب کھائے پیئے

پیٹ بھرے، عمدہ کپڑوں، گھروں، رشتوں میں گھرے ہوئے، خوبصورت، صحت والے، گول مٹول چہروں والے انسان جن کی زندگی میں کوئی تلاش نہیں، جذبات میں کوئی ہیجان نہیں، دماغ میں کوئی سوچ نہیں، دل میں کوئی آئینہ نہیں!۔ اُنھیں دیکھ کر میرے دل کے آئینے میں کسی انسان کی صورت نہیں بنتی۔ زیادہ سے زیادہ اُبلے ہوئے آلو کا خیال آتا ہے۔

لیکن اس وقت میں آلوؤں کی بات نہیں کرنا چاہتا، انسانوں کی بات کرنا چاہتا ہوں، جو میری اور آپ کی طرح شب و روز آئینہ دیکھتے ہیں۔ کچھ کھوجتے ہیں، کچھ تلاش کرتے ہیں۔

میں اپنے دل کا آئینہ آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔ تاکہ آپ اس میں میری صورت دیکھ لیں، اور کسی حد تک اپنی بھی۔

میں کیوں پیدا ہوا؟ —— اس کا جواب میں کیا، میرے ماں باپ بھی نہیں دے سکتے۔ کسی ماں کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس کا بیٹا بڑا ہو کر قاتل بنے گا۔ ورنہ وہ اُسے پیدا ہی نہ کرتی۔ غالباً مریم کو معلوم نہ تھا کہ اس کا بیٹا یسوع مسیح ہوگا، ورنہ وہ اسے پھانسی سے بچا لیتی۔ مائیں بڑی رحم دل ہوتی ہیں۔ مجھے یقین ہے، اگر مائیں اپنے دل کے آئینے میں شروع سے آخر تک اپنے بچے کی زندگی دیکھ سکیں، تو آج صفحۂ ہستی پر کسی انسان کا وجود نہ ہوتا۔ یا تو فرشتے ہوتے، یا پھر اُبلے ہوئے آلو —— ایک ہی بات ہے!——

اس لیے میرا سنِ ولادت، جائے ولادت، یومِ ولادت اہم نہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ جب میں پیدا ہوا، اور زندگی کے آئینے میں میں نے اپنی صورت دیکھی تو میں رویا تھا۔

——(۲)——

بچپن کی کچھ دھندلی دھندلی صورتیں یاد ہیں۔ راجہ صاحب کے محل کا ایک حصہ تھا۔ چند دیواروں کے کنگوروں اور برجیوں سے گھرا ہوا ایک چوکور صحن تھا۔ میرے ہاتھ میں روٹی کا ایک ٹکڑا تھا۔ جس پر مکھن لگا ہوا تھا۔ دوسرے ہاتھ میں دودھ کی کٹوری تھی۔ دیوار سے ایک کوا کائیں کائیں کرتا ہوا آیا۔ اور چونچ مار کر میرے ہات سے روٹی چھین کر لے گیا۔ ایک برجی سے ایک بندر چھلانگ مار کر آیا اور میرے ہات سے دودھ کی کٹوری چھین کر چلتا بنا۔ اور میں ایک بے بس بچے کی طرح خالی ہاتھ پھیلائے فرش پر بیٹھا بیٹھا زور سے رونے لگا۔ اس کے آگے کیا ہوا مجھے کچھ یاد نہیں۔

غالباً میری ماں میرا رونا سن کر بھاگی بھاگی آئی ہوگی۔ اُس نے مجھے فرش سے اُٹھا کر اپنے گلے سے لگا لیا ہوگا، مجھے پھر سے دودھ روٹی اور مکھن دیا ہوگا۔ مگر مجھے کچھ یاد نہیں۔

صرف اتنا یاد ہے کہ ایک بندر نے میرا دودھ چھینا تھا۔ ایک کوے نے میری روٹی اور مکھن۔ تین برس کی عمر میں میں اپنے عہد کی انسانی زندگی کے ایک بہت بڑے المیے سے آشنا ہوا۔ جہاں ہر وقت ہر انسان کی روٹی اور مکھن چھن جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ گو مجھے اُس وقت یہ بات معلوم نہ ہوئی کہ میرا اپنا دودھ روٹی اور مکھن بھی کسی دوسرے بچے کا چھینا ہوا تھا۔ یہ بات بہت دیر میں سمجھ میں آئی۔ لیکن اب میں سمجھتا ہوں کہ مزدور روز روٹی کی پوٹلی باندھ کر کارخانے کیوں جاتے ہیں؟— بیویاں رات کو دروازے پر کھڑی ہو کر اپنے خاوندوں کا انتظار کیوں کرتی ہیں؟ کلرک سہمے سہمے دفتروں کو کیوں جاتے ہیں؟ اور سر جھکا کر۔ گویا آسمان سے برستی ہوئی گالیوں کو کیوں سنتے ہیں؟ اور اب میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ لوگ خود غرض کیوں ہوتے ہیں؟ اپنے دوست کو دھوکا کیوں دیتے ہیں؟— بنک میں پیسہ کیوں جمع کرتے ہیں؟ —ان سب کے ذہن میں کہیں کہیں

میری طرح کوئی بندر یا کوا منڈلاتا رہتا ہے۔

ایک چھوٹی سی لڑکی تھی۔ اس کا نام چندر مکھی تھا اور وہ اپنے نام ہی کی طرح بے حد حسین تھی۔ اور وہ تپتی دوپہروں میں املی کے پیڑوں تلے میرے ساتھ کھیلا کرتی تھی۔ خود بعد میں کھاتی تھی۔ املی توڑ کر پہلے میرے ہاتھ میں دیتی تھی اور میں اس قدر خود غرض تھا کہ کبھی یہ سمجھ نہ سکا کہ یہ لڑکی اپنے ہاتھ کی توڑی ہوئی املی کس طرح کسی دوسرے فرد کے حوالے کر سکتی ہے۔ چاہے وہ اس کا بھائی کیوں نہ ہو۔ وہ مجھ سے بہت بڑی نہیں تھی۔ پھر بھی جب میں اس کے پیچھے چلتے چلتے تھک جاتا تھا، اور رونے لگتا تھا۔ تو وہ چھوٹی سی لڑکی ہمت کر کے مجھے اٹھا کر اپنی کمر پہ رکھ لیتی تھی۔ اور پھولتی ہوئی سانسوں کے درمیان پسینہ پسینہ ہوتی ہوئی مجھے اٹھا کر چند گز تک چلی جاتی تھی۔ اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کوئی کیوں کسی دوسرے کو اٹھائے، اُسے پچکارے، پیار کرے، اس کی حفاظت کرے۔ میں نے تو کبھی کسی کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کیا تھا۔

پھر ایک دن چندر مکھی کی شہ رگ کے قریب ایک خوف ناک ناسور ابھرا، اور کئی سال تک میرے والد مختلف جگہوں پر اس کا علاج کرانے کے لیے گھومتے رہے۔ مجھے اسپتالوں کے کمرے بہت یاد ہیں۔ دواؤں کی بوئیں اور مریضوں کا تڑپنا، اور اسپتال کے ملازموں کی بے رحمی، اور پیپ اور خون اور پٹیاں اور نیم اندھیرے کمرے میں چندر مکھی کا میری ماں کے سینے سے لگ کر بلکنا ...... اچھا ہوا وہ بہت جلد مر گئی اور میں بہت جلد اپنی زندگی کے انجام سے واقف ہو گیا۔ افسوس اس بات کا نہیں ہے کہ موت بے رحم کیوں ہے؟ افسوس اس بات کا ہے کہ اسپتال کے ملازم بے رحم کیوں ہیں؟ وہ اگر ایک ناسور ٹھیک نہیں کر سکتے تو دوسرا تو نہ دیں!

مرتے وقت چندر مکھی کا چہرہ مجھے کبھی نہیں بھولے گا۔ وہ آٹھ سالہ لڑکی ایک اسی سالہ معمر عورت کی باوقار متانت کے ساتھ مری تھی۔ بھور ہو گئی تھی اور اسپتال کے وارڈ کے سامنے جامن کے پیڑ پر چڑیاں پھدکنے لگی تھیں، اور ہوا میں ایک مہکتی ہوئی تازگی تھی۔ ایسے میں شاید چندر مکھی کو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ جا رہی ہے۔ اس زندگی میں یہ ایک عجیب بات ہے۔ اور شاید ایک خوب صورت بات بھی ہے۔ کہ اس زندگی میں آنے کا پتہ نہیں چلتا، لیکن اکثر جانے کا پتہ چل جاتا ہے۔ کوئی اندر کی ایک انجانی حس ہوتی ہے جو دل پر انگلی رکھ دیتی ہے۔ اور مسافر چونک کر سفر کے لیے بیدار ہو جاتا ہے۔ چندر مکھی کے ساتھ بھی اس صبح یہی ہوا، وہ چونک کر اٹھی۔ اُس نے میری ماں کو جگایا۔ اُس نے کہا کہ وہ اس کا منہ دھلا دے۔ اُس کی فراک بدل دے۔ اس کے بالوں میں ربن لگا دے۔ شاید وہ ربن نہ تھا۔ موت کا تمغہ تھا جسے چندر مکھی نے بڑی بہادری سے پہن لیا تھا۔ پھر چندر مکھی نے مجھے بہت بہت پیار کیا۔ مجھے ایسی ایسی دعائیں دیں جو ایک بہن ہی اپنے بھائی کو دے سکتی ہے۔ پھر اُس نے اپنے باپ کی گود میں اپنا سر رکھ دیا اور میری ماں نے اس کی ٹانگیں اپنی آغوش میں لے لیں۔ اور وہ بہادر لڑکی چراغ کی لو کی طرح آہستہ آہستہ کم ہوتی ہوئی میری آنکھوں کے سامنے بجھ گئی۔

دوسروں کے لیے تو نہیں، ہاں میرے لیے چندر مکھی کی چند دھندلی دھندلی یادیں اور تصویریں کسی نہ کسی طرح سے میرے ذہن اور شعور میں رچ بس کر اُسے عورت کی بنیادی تہذیب اور شرافت سے آگاہ کر گئی ہیں۔ ماں سے تو گویا بچہ اس کی آنول سے بندھا ہوتا ہے۔ اس لیے بچہ میرے خیال میں ماں سے بہت کم سیکھتا ہے۔ عورت کی لطافت کا پہلا سبق اُسے اپنی بہن سے ملتا ہے۔ اور آخری اپنی محبوبہ سے۔ اور یوں ہی اور اسی طرح اس کے دل کے آئینہ خانے میں محبت کا تصور مکمل

ہوتا ہے۔ اس بیچ میں اور بہت سے مقام آتے ہیں کیونکہ مرد کی محبت، عورت کی محبت کی طرح ایک واحد عمل مجرد تجربہ نہیں ہے۔ ایک مسلسل سفر ہے۔ اپنی محبوبہ تک پہنچنے کے لیے جس میں کبھی کبھی ساری زندگی بیت جاتی ہے۔ مگر میں اس کا ذکر آگے کروں گا۔

لیکن اس سے بھی بڑا کام جو چندر مکھی نے کیا، وہ یہ تھا کہ اس نے میرے دل سے موت کا ڈر نکال دیا۔ ناگزیر ہونے کے باوجود موت کا تصور ہر زندہ شے کے لیے بڑا بھیانک ہے۔ اور جوں جوں زندگی اپنے انجام کے قریب ہوتی جاتی ہے اس تصور کی گرفت مضبوط ہوتی جاتی ہے۔ اس انجام کو کوئی روک نہیں سکتا۔ پچاس برس کی عمر میں نہ سہی تو سو برس کی عمر میں، یا ڈیڑھ سو برس کی عمر میں ہمیں اس انجام کو پہنچنا ہے۔ ناسور سے نہ سہی تو کسی دوسرے مرض سے، حادثے سے، قتل سے، شہادت سے، یا طبعی موت سے ہمیں ایک نہ ایک دن اس انجام کو پہنچنا ہے۔ یہ قطعی امر ہے۔ لیکن اس قطعیت سے بھی دل کو قرار نہیں آتا۔ دنیا کا کوئی مذہب اور افکار اور فلسفے کا کوئی سلسلہ موت کے کرب اور خاتمے کے خوف کو انسان کے دل سے پوری طرح نکال دینے سے قاصر ہے۔ اس ڈر سے بچنے کے لیے شاید ایک بچے کے ذہن کی شاعری اور اس معصومیت کی ضرورت ہے جو موت کو ایک رین کی طرح پہن لے۔ اور مسکراتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہو جائے جس طرح ایک ملگجی سحر میں چندر مکھی رخصت ہوئی تھی۔

میں ایک کمزور انسان ہوں، مگر جی اس طرح مرنے کو چاہتا ہے اور دل چاہتا ہے کہ جب زندگی ختم ہو جائے اور موت کا فرشتہ میری روح قبض کر کے لے جائے تو میں مسکرا کر اس کا استقبال کروں، اور ایک دوست کے ناتے سے اس کے کندھے پر ہات رکھ کے اسے دور دراز کے کسی جزیرے میں لے جا کر اسے ایک ایسی طویل اور خوب صورت کہانی سناؤں، جسے سن کر وہ حسین خیالوں میں کھو جائے، اور چند ساعتوں کے لیے کسی بچے کی جان لینا بھول جائے۔ ادیب جب کہانی لکھتے ہیں، تو وہ دراصل موت سے لڑتے ہیں۔ کسی انسان کی زندگی مہابھارت سے خالی نہیں رہی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ خود ہی کورو ہے، خود ہی پانڈو۔ خود کرشن ہے، خود ہی ارجن ہے۔ وہ خود ہی رتھ میں بیٹھتا ہے، اور خود ہی اسے چلا کر کارزارِ حیات میں لے جاتا ہے۔ اور انگلی اٹھا کر کہتا ہے!

"سن اے ارجن!"——

——(۳)——

میرے لڑکپن اور جوانی کے دن بڑے خوبصورت رنگوں سے معمور ہیں۔ کشمیر کی جھیلیں اور آبشار، پہاڑ اور وادیاں، دھان کے کھیت اور زعفران کی خوشبو۔ گھٹا، عورت کی آنکھوں کی طرح برستی ہوئی۔ اور برف کے گالے، سفید گلاب کی پتیوں کی طرح بکھرے ہوئے۔ لوگوں نے دھنک کے سات رنگ دیکھے ہوں گے، لیکن میں نے دھنک میں اتنے رنگ دیکھے ہیں جو میری دو زندگیوں کے لیے کافی ہیں۔ لیکن زندگی تو صرف ایک ہے اور ادیب بہت سے لوگوں سے بہت زیادہ حساس ہوتا ہے۔ اس لیے میں کیا کروں ان آنکھوں کا کہ میں نے دھنک کے رنگ ہی نہیں دیکھے، میں نے بھوک کا رنگ بھی دیکھا ہے۔ صرف دھان کے کھیت ہی نہیں دیکھے، ان کھیتوں میں کھڑے ہوئے کسانوں کو لہو کا بھی دیکھا ہے۔ میں نے زعفران کی خوشبو ہی نہیں سونگھی، اس بدبو کو بھی سونگھا ہے جو متعفن کپڑوں اور گلے سڑے چیتھڑوں سے آتی ہے۔ میں نے برف کے بے داغ گالوں میں لوگوں کو سردی سے ٹھٹھرتے اور مرتے دیکھا ہے۔ اب کوئی آنکھ، کان، دل اور دماغ بند

گر کے کیسے لکھ سکتا ہے؟

اندر کی دنیا:—

اندر کی دنیا کے بارے میں میں نے بہت سوچا ہے۔ لیکن مجھے آج تک یہی معلوم نہ ہوا کہ اندر کی دنیا کہاں سے شروع ہوتی ہے، اور باہر کی دنیا کہاں ختم ہوتی ہے۔ مجھے تو اندر اور باہر کی دنیا ایک سی نظر آتی ہے۔ میرے دل کے اندر جو آئینہ ہے اس کا ایک ایک ٹکڑا میں نے زندگی کی سڑکوں، بازاروں، گلیوں، محلوں اور چوکوں سے چنا ہے۔ ایک ٹکڑا میں نے عورت کے سنگار میز سے اٹھایا ہے، تو دوسرا کوڑے کے ڈھیر سے۔ ایک ٹکڑا مجھے جھیل میں غوطہ لگاتے ہوئے تہہ آب سے ملا تھا تو دوسرا صحرا کی ریت چھانتے ہوئے۔ ایک ٹکڑا ترش کر نگینے کی طرح انگوٹھی میں لگ گیا تو دوسرا دھاردار ہو کر تلوے میں اتر گیا۔ شاید میری ساری زندگی کانچ کی ان کرچوں کو جمع کرتے کرتے گزر جائے گی، اور پھر بھی دل کا آئینہ خانہ مکمل نہ ہو سکے گا۔ اس لیے میں مکمل طور پر آپ کو اپنے بارے میں کبھی نہ بتا سکوں گا۔ کیوں کہ میں خود مکمل نہیں ہوں اور میں اس لیے مکمل نہیں ہوں۔ نہ بدی میں، نہ نیکی میں، نہ خوبصورتی میں نہ بدصورتی میں، نہ تخیل میں نہ حقیقت میں، نہ تشنگی میں نہ سیرابی میں، کسی طرح میں مکمل نہیں ہوں۔ کیونکہ ابھی میری نظر میں میرا خدا بھی مکمل نہیں ہے۔

لیکن میں اسے مکمل ضرور کر دینا چاہتا ہوں۔ اگر وہ ایک گھر ہے تو میں اس میں ایک اینٹ ضرور لگا دینا چاہتا ہوں۔ اگر وہ ایک آئینہ ہے تو میں اس میں کانچ کا ایک ٹکڑا جوڑ دینا چاہتا ہوں۔ اگر وہ ایک دھنک ہے تو میں اس میں ایک رنگ اور سمو دینا چاہتا ہوں۔ میں بے نور آنکھوں کے سارے گڑھے پاٹ دینا چاہتا ہوں، اور انھیں جھیلوں کی طرح لبریز کر دینا چاہتا ہوں۔ زندگیاں جو پہاڑ کی طرح بلند ہوں۔ فراغتیں جن سے زعفران کے پھولوں کی مہک آئے۔ ہمدردیاں جو آبشار کی طرح انسان کے سینے میں بہتی ہوں۔ کپڑے جو درختوں کے پتوں کی طرح شفاف اور چکنے اور سورج کی کرنوں سے نمو حاصل کرتے ہوں۔

میں جانتا ہوں کہ اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا۔ لیکن میں نے اپنی زندگی میں کبھی اپنے آپ کو اکیلا محسوس نہیں کیا۔ سورج کی ہر کرن میری ساتھی ہے۔ اکیلے لوگ بڑے بدنصیب ہوتے ہیں۔ میں نے تو اپنی بھوک میں بھی اپنے آپ کو اکیلا نہیں پایا۔ میری پیاس کبھی صرف میری نہیں رہی۔ میری بے کاری میں کروڑوں لوگ شامل رہے ہیں، اور بہت سے ملک اور کئی صدیاں۔ میں ایک ہجوم ہوں، قافلہ ہوں، سفر ہوں، تاریخ کا چلتا ہوا سانس ہوں۔ یعنی ایک معمولی آدمی ہوں۔

نہ جانے یہ کیسے تصور کر لیا گیا ہے کہ ادیب اس دنیا کا آدمی نہیں ہوتا۔ بلکہ دوسرے نظام شمسی کی مخلوق ہے — عجیب عجیب باتیں اس سے منسوب کر دی جاتی ہیں۔ ایسی نیکی جو فرشتوں سے بھی ممکن نہیں۔ ایسی پاکیزگی جو دیوتاؤں کے حصے میں بھی نہیں آئی۔ جسے چھوتے ہوئے خدا بھی ڈر جائے۔ لیکن یہ سب صفات نہ جانے کیسے ایک دم ایک ادیب کی فطرت میں دیکھ لی جاتی ہیں، یا فرض کر لی جاتی ہیں، یا خود گھڑ لی جاتی ہیں۔ حالانکہ میرا خیال ہے ایک ادیب اتنا ہی جھوٹا، لپاڑیا، دھوکے باز، خود غرض، کمینہ اور تنگ دل ہوتا ہے۔ جتنا کوئی دوسرا آدمی ہو سکتا ہے۔ اور مجھ میں یہ سب خوبیاں پائی جاتی ہیں۔

میں نے بارہا جھوٹی قسمیں کھائی ہیں، جھوٹے وعدے کیے ہیں، اپنے آپ کو اور دوسروں کو دھوکے دیے ہیں۔

خوشامد کی ہے، لڑا ہوں، جھگڑا ہوں، شراب پی ہے، بھنگ اور چرس بھی۔ میں اپنی تعریف سے خوش ہوا ہوں اور دوسروں کی تعریف سے جل گیا ہوں۔ جب کسی سے کام پڑتا ہے تو میں اس کے پیچھے لگ جاتا ہوں اور کام ہوتے ہی اسے ایسا فراموش کر دیتا ہوں، جیسے وہ کبھی میری زندگی میں تھا ہی نہیں۔ کئی بار میرے دوستوں نے مجھ سے ادھار مانگا اور میری جیب میں پیسے تھے اور میں نے نہیں دیے۔ کئی بار جب میں نے اُدھار مانگا اور مجھے پیسے نہیں دیے گئے تو میں نے دل ہی دل میں اپنے دوست کو گالی دی۔

کئی بار میں نے سڑک پر چلتی ہوئی اجنبی عورتوں کو اغوا کر لیا۔ کیونکہ وہ خوبصورت تھیں۔ اب اگر وہ صحیح سلامت حفاظت سے اپنے گھر چلی گئیں، تو یہ اُن کی اور قانون کی خوش قسمتی ہے۔ ورنہ جہاں تک میرے ارادے کا تعلق ہے، میں اغوا کر چکا ہوں۔

اسی طرح کئی بار کسی کی بات سے طیش کھا کر میں نے اُسے قتل کر دیا ہے۔ اب اگر وہ شخص زندہ ہے اور چلتا پھرتا ہے تو محض اپنی جسمانی قوت کے بل بوتے پر، ورنہ جہاں تک میرا تعلق ہے میں اُسے قتل کر چکا ہوں۔

میں نے اندازہ لگایا ہے کہ اب تک میں اسی طرح پچاس عورتیں اغوا کر چکا ہوں، اور ذنتو آدمی قتل کر چکا ہوں۔ ان میں خواجہ احمد عباس، علی سردار جعفری، راجندر سنگھ بیدی، ماؤ زے تنگ، ونسٹن چرچل، دلیپ کمار، دھرم ویر بھارتی اور مہندر ناتھ، میرا سگا بھائی بھی شامل ہے۔ اور کنتو گلی کی بھنگن جو میرے گھر میں ٹھیک طرح سے جھاڑو نہیں دیتی ہے، اور رام دیال نکڑ کا بنیا جس کا بل میں نے چھ ماہ سے ادا نہیں کیا ہے، اور وہ اور ہیئر کٹنگ سیلون کا عبدل حجام جو ہر ماہ مجھے بال اُگانے کا ایک نیا تیل بیچ دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اور میرا لینڈ لارڈ! ——— جسے میں ہر ماہ کی پہلی کو قتل کرتا ہوں۔ کم بخت ہر دوسرے ماہ کی پہلی کو پھر دروازے پر آن کھڑا ہوتا ہے۔ ایسا معجزہ تو آپ نے بھی نہ دیکھا ہوگا۔

———(۴)———

فطرت نے یکسانیت کو توڑنے کے لیے تضاد کے عمل کو تجویز کیا۔ اور روشنی اور اندھیرا، پانی اور آگ، مرد اور عورت، ظہور میں آئے۔ میں یہ نہیں مانتا کہ مرد اور عورت صرف بچے پیدا کرنے کے لیے مامور کیے گئے ہیں۔ ورنہ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ میرے ہات میں بچے پیدا کرنے کی طاقت ہوتی اور میری ران پر ایک تھیلی لگی ہوتی۔ میں اپنا ہات اپنی ران پر رکھتا، اور تھیلی بڑھنے لگتی اور نو ماہ کے بعد بچہ پیدا ہو جاتا۔ اس طرح عورت دردِ زہ کی مصیبت سے بچ جاتی اور فطرت عورت کی تخلیق سے ——۔ یا یہ بھی ہو سکتا تھا کہ امبی با (AMSEBA) کی طرح چلتے چلتے میرے دو ٹکڑے ہو جاتے اور ایک کرشن چندر کولابے کو چلا جاتا، اور دوسرا ملاڈ کو۔ الگ الگ اپنی ذات میں مکمل اور خود مختار　　مگر فطرت نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے مرد اور عورت بنائے۔ ان میں تضاد رکھا، کھنچاؤ اور کشش۔ اس کشش سے وہ ایک دوسرے کے ساتھی بنے۔ ساتھ رہنے سے گھر بنا۔ گھر کے لیے محنت کی گئی۔ عورت سے سماج پیدا ہوا اور سماج سے معاشرہ۔ یہ پیچیدہ خوبصورتی ایک دوسرے میں گتھی ہوئی، ایک دوسرے پر انحصار کرتی ہوئی، وہ لچک اور توازن نہ پیدا کر سکتی، اگر انسان اکیلا ہوتا اور خود ہی دوہری جنس کا حامل ہوتا۔ عورت کی تخلیق کائنات کی رمزیت کی طرف ایک نہایت ہی لطیف اشارا ہے۔

میری زندگی میں بہت سی عورتیں آئیں۔ حالانکہ فائدے سے صرف ایک آتی تو اچھا ہوتا۔ مگر زندگی کی طرح محبت بھی ایک بہت پُر پیچ عمل ہے۔ کبھی کبھی جسے آپ محبت سمجھتے ہیں، وہ محض ایک پسند ہوتی ہے۔ جنسی بھوک ہوتی ہے۔ ماں باپ کی مرضی

ہوتی ہے۔ خدا ترسی ہوتی ہے۔ اخلاقی مجبوری ہوتی ہے۔ یا صاف بداخلاقی ہوتی ہے۔ ایسی محبت سے اگر شادی ہوتی ہے تو نا کام رہتی ہے۔ گھر بنتا ہے تو ویران ہوتا ہے۔ زندگی ہوتی ہے تو کدو کی طرح ایک ہی جگہ بیٹھے بیٹھے پھولتی جاتی ہے۔ اور کبھی انسان کو شبہ ہونے لگتا ہے کہ وہ انسان ہے کہ کدو؟

میں محبت کا مفہوم بہت دیر میں سمجھا، اور بہت دیر تک بھٹکا، اور بہت سے گناہوں کے داغ میں نے اپنے سینے پر سے لیے اور اپنے دل کے آئینہ خانے کو بار بار طرح طرح کی صورتوں سے سجایا۔ لیکن کہیں پر مجھے وہ صورت نہ ملی، جس کی تلاش میں میں عرصے سے سرگرداں تھا۔ کیونکہ کسی انسان کا آئینہ اس کی محبت کے چہرے کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے میں اپنے دل کے زخم لیے ہزار وادیوں میں بھٹکا اور سیکڑوں راتوں کے روپہلے لمحوں میں اُس ایک لمس کو ڈھونڈتا رہا جسے صرف ایک بار چھو لینے سے ہی میں کندن ہو سکتا تھا۔ دوستوں کی محفل میں اور دشمنوں کے گھر میں۔ گلی گلی محلے محلے میں اس چہرے کو ڈھونڈتا رہا جس کے نقوش اور خدوخال سے میں ناواقف تھا۔ لیکن جو صرف میرا ہو سکتا تھا، اور میں اُس کا۔ اور جب وہ چہرہ مجھے مل گیا، اور میں نے اُسے پہچان لیا، اور اس نے مجھے۔ جب میرے گناہ اسے اپنے معلوم ہوئے اور اس کے زخم میرے دل میں پیوست ہو گئے تو میری تلاش ختم ہو گئی۔ اب میرا جی کسی کو قتل کرنے کو نہیں چاہتا۔ سب کو معاف کر دینے کو چاہتا ہے۔ سب کو گلے سے لگا لینے کو چاہتا ہے۔

——(۵)——

لیکن زندگی باقی ہے اور اُس کے خواب ادھورے ہیں۔ میرے دشمن وزیر ہو گئے ہیں۔ یا کانٹریکٹر اور عظیم جاہ و حشمت کے مالک!—— وہ پہلے سے زیادہ شدت سے مجھ سے نفرت کرتے ہیں۔ میرے دوستوں نے بھی چھوٹے چھوٹے گھر خرید لیے ہیں۔ ننھے ننھے بنگلے اور فلیٹ اور گاڑیاں اور اب اُن کی نگاہوں میں آسودگی، آرام اور طمانیت کی جھلک ہے —— اور سلام ہو ان سب کی زندگیوں پر اور دنیا کی تمام برکتیں نازل ہوں میرے تمام دوستوں اور دشمنوں پر —کیونکہ میں نے صرف خواب دیکھے ہیں——

میں نے کوئی گھر نہیں بنایا، اور کسی کو بہت بڑا فیض نہیں پہنچایا، اور کبھی بڑا آدمی نہیں بن سکا۔ کیونکہ میں نے صرف خواب دیکھے ہیں۔ وہ سب ادھورے خواب تھے۔ جھوٹے سپنے تھے۔

ایک دن میں نے ایک خواب دیکھا کہ اس دنیا کے سب انسان برابر ہیں۔ وہ ایک جھوٹا سپنا تھا۔

ایک دن میں نے خواب دیکھا کہ اس دنیا میں کوئی کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ وہ بھی ایک جھوٹا سپنا تھا۔

ایک دن میں نے خواب دیکھا کہ اس کرۂ ارض پر انسان امیر ہو گئے ہیں۔ یعنی سب نے مل کر ایک دوسرے کی غریبی آپس میں بانٹ لی ہے—— وہ بھی ایک جھوٹا سپنا تھا——

لیکن یہی جھوٹے سپنے مجھے سب سے زیادہ عزیز ہیں—— یہی میرا گھر ہیں—— یہی میری محبت—— میری زندگی اور اُس کا حاصل——

میں ہرگز ہرگز کوئی بڑا آدمی نہیں ہوں—میری کل کائنات یہی جھوٹے سپنے ہیں!——

(ماخوذ از "افکار" اکتوبر ۱۹۶۲ء)

پروفیسر ممتاز حسین

کرشن چندر کی یاد میں

کرشن چندر کی موت نہ صرف اُردو ادب کے ایک عظیم ادیب کی موت ہے۔ بلکہ عالمی ادب کے ایک بڑے ادیب کی موت ہے۔ کرشن چندر میرے ایک گہرے دوست تھے، اور ذاتی سطح پر ان کی جدائی، میرے لیے بہت سی خوش گوار یادوں کا ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے، پھر یہ کہ نہ صرف کرشن چندر میرے دوست تھے، بلکہ ان کے چھوٹے بھائی مہندر ناتھ بھی میرے گہرے دوست تھے، اور ان دونوں کے ناتے سے میں اُن کی بہن سرلا دیوی سے بھی متعارف تھا، افسوس کہ پے بہ پے یہ سب کے سب اس دنیا سے رخصت ہو گئے ـــــــ لیکن اس موقع پر میں کرشن چندر کا ذکر اپنے ایک دوست کی نسبت سے کرنا نہیں چاہتا، اور نہ ان کی دل کش شخصیت کے خدوخال کو اُبھارنا چاہتا ہوں۔ ان کی جدائی کا غم ابھی اس قدر تازہ ہے کہ ان باتوں کے بیان کرنے میں جذبات سے مغلوب اور گلوگیر ہو جانے کا خطرہ ہے۔ چنانچہ میں اس موقع پر اپنی اُس عقیدت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں جو مجھے ان سے، بحیثیت فن کار کے تھی، اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اگر ادب اور خیال کی ہم آہنگی کا رشتہ نہ ہوتا، تو انفرادی اور شخصی سطح پر، مہر و وفا کا وہ رشتہ قایم نہ ہو سکتا جو ہم دونوں کے درمیان تھا۔ ہم دونوں ترقی پسند تحریک اور ادب ہی کے رشتے سے ایک دوسرے کے قریب آئے تھے، اور وہ قربت اور محبت میں آج بھی اُن کے لیے اپنے دل میں رکھتا ہوں۔ میں خط لکھنے کے معاملے میں بہت ہی کاہل اور تساہل پسند ہوں۔ آج اور کل پر ٹالتا رہتا ہوں۔ اُن کی وفات سے ایک مہینہ پہلے، اُن کی یاد اکثر آتی رہتی۔ بالخصوص اس وجہ سے کہ وہ بہت علیل تھے، اور میں نے کوئی خط اُن کو عیادت کا نہیں لکھا تھا۔ چنانچہ جس دن، آج اور کل کے ٹال مٹول کے بعد، میں نے پکا تہیہ اُن کو خط لکھنے کا کیا، اُسی دن مجھے ان کی موت کی خبر ملی، اس سے مجھے مزید دھچکا پہنچا، اور غالب کا یہ شعر زبان پر آیا ؎

تم کون سے ایسے تھے کھرے داد و ستد کے\
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

قدیم مصریوں کے درمیان یہ رسم تھی کہ جب وہ اپنے مُردے کو قبر میں اُتارتے تو تالیوں کی گونج میں اس رسم کو ادا کرتے، ایسا وہ اس لیے کرتے کہ وہ آدمی کو لافانی تصور کرتے اور یہ سمجھتے کہ اس کی ابدی زندگی کا دروازہ موت ہے۔ آیا یہ صحیح ہے کہ نہیں، اسے کون بتائے گا ـــ کسے معلوم کہ موت کے بعد کیا ہوتا ہے ـــ مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ

پروفیسر ممتاز حسین

ہر وہ شخص جو خدمتِ خلق کرتا ہے، اپنی زندگی کو دوسروں کی زندگی کے لیے وقف کر دیتا ہے۔ اپنے ہر قطرۂ خون کا حساب اپنی تخلیقات اور دوسروں کی محبت میں دیتا ہے، وہ لافانی اور لازوال ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔

کرشن چندر کے فن کی اساس محبت پر تھی۔ خواہ وہ محبت دلوں کی ہو یا پوری انسانیت کی۔ انھوں نے جو کچھ لکھا اس کے پیچھے ان کا دردمند دل دھڑکتا رہتا۔ "طلسم خیال" سے لے کر ان کے آخری افسانے یا آخری خط تک، ان کی زندگی کا سفر، اُن کی اسی دردمندی کا سفر ہے۔ وہ آدمی اور آدمی کے درمیان کوئی رشتہ بجز محبت اور آزادی کے نہ دیکھتے، اور چونکہ وہ مفلسیٔ حیات نہیں، بلکہ پُرمایگیٔ حیات کے قائل تھے وہ ہر بشر کو احتیاجِ حیات سے مستغنی اور خوش و خرم دیکھنا چاہتے تھے۔ میں نہیں سمجھتا کہ بنگال کے قحط پر اُن کا جو افسانہ "ان داتا" ہے، اس سے کوئی بہتر تخلیق ہمارے یہاں کسی نے افسانوی ادب میں پیش کی ہو۔ "ان داتا" اپنی ہیئت میں نہ تو کوئی ڈراما ہے اور نہ کوئی افسانہ، لیکن ایک ایسی بھرپور تخلیق ہے کہ اس نے ہندوستان کو ہلا کر رکھ دیا۔ یونانی زبان میں آئیڈیا (خیال) اور فارم (صورت) متحد المعنی ہیں۔ خیال صحیح معنوں میں اسی وقت آشکارا ہوتا ہے، یا اپنی بلندیٔ اظہار کو پہنچتا ہے جب وہ اپنی صورت سے متحد ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جب میں اس پہلو سے کرشن چندر کے افسانوں پر ایک نظر ڈالتا ہوں تو اس نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ ہمارے افسانوی ادب میں منشی پریم چند کے بعد کرشن چندر ہی کا دوسرا بڑا نام ہے۔ ایک نے شمالی ہند کے دیہات کے دُکھ درد کو اپنے افسانوں میں پیش کیا، ہندو سوسائٹی کے اس مزمن ناسور پر عمل جراحی کی جو ذات پات کی تقسیم چھوت اور اچھوت کی تقسیم سے عبارت ہے۔ تو دوسرے نے ماڈرن ہندوستان کے بڑے صنعتی شہروں کے باسیوں کی دُکھ بھری زندگی کو اپنے افسانوں میں جگہ دی اور ہر اُس خیال پر ایک ضرب کاری لگائی جو استحصال، تفریقِ مذہب و ملت، نفرت اور بیگانگی کا حامل ہے۔۔۔۔۔

کرشن چندر ماڈرن ہندوستان کا گورکی ہے۔ کرشن کا فن عریاں حقیقت نگاری کا نہیں، بلکہ انقلابی رومانیت کا حامل ہے۔ اس کا ہر افسانہ ایک لیریکل تخلیق ہے جس میں اس کی موضوعیت غالب ہے۔ کرشن کا دل و دماغ ایک شاعر، ایک ایسے مستقبل بیں شاعر کا تھا جو زندگی کی نئی راہوں کی نشان دہی کرتا ہے اور اپنی آبلہ پائی سے اسے ہموار بھی کرتا جاتا ہے۔ کرشن چندر مسلسل چالیس سال تک اس راہ پر گامزن رہا اور جس خلوص اور لگن کے ساتھ وہ اس راہ پر چلا ہے، اس کی مثال مشکل ہی سے ہمارے یہاں ملتی ہے۔ وہ اپنے کو فلمی دنیا میں کھو بھی سکتا تھا، لیکن اس نے اپنے فن کو جو اس کا وظیفۂ حیات تھا ہر قسم کی دنیاوی ترغیبات پر ترجیح دی، اور اس قدر لکھا کہ اس کی انگلیاں نہ صرف خونچکاں رہیں، بلکہ قلم پکڑتے پکڑتے ٹیڑھی بھی ہو گئیں۔ لیکن بالآخر دل نے ساتھ چلنا چھوڑ دیا۔ ع "شاید جگر کا کام تمامی کو پہنچ گیا"۔

کرشن کی زندگی اور موت، دونوں ہی قابلِ رشک ہیں، کہ اس نے اپنے ہر نفس اور قطرۂ خوں کا حساب دیا ہے۔ اس نے اپنے معاشرے سے لیا کم اور اُسے دیا زیادہ ہے۔ اور جو کچھ دیا وہ نہ صرف بہ اعتبار کمیت وقیع ہے، بلکہ بہ اعتبار کیفیت بھی اعلیٰ ہے۔ آنے والی نسلیں ہندوستان کا مطالعہ کرشن چندر کے افسانوں اور ناولوں کے حوالے سے کریں گی، اور عالمی ادب کے طالب علم اس کی انسان دوستی، عالمی اخوت اور محبت کے جذبات سے صدیوں تک کسبِ فیض کرتے رہیں گے۔ میں اس شہیدِ فن، زندۂ جاوید کو اپنا نذرانۂ عقیدت بھیجتا ہوں اور اس کے سوگواروں کی خدمت میں اظہارِ غم اور کلمۂ صبر کی تلقین۔ کہ یہی رسمِ دنیا ہے۔۔۔۔۔

محمد علی صدیقی

کرشن چندر۔ ہمہ جہت فنکار

کرشن چندر بھی آں جہانی ہوگئے اور اُردو دنیا ایک ایسے قلم کار سے محروم ہوگئی جس نے ساری عمر بے جان الفاظ کو زندگی کی تیزی و تُندی سے سمو دیا۔ ایک عجیب و غریب انقلاب برپا کیا۔ اگر ہر بڑے ادیب کے بارے میں خامہ فرسائی کی مہلت اُس کی موت کے بعد ہی نکالنی پڑے تو پھر تنقید میں سرد بازاری کا شکوہ کیوں؟ موت مرنے والے کے ساتھ لکھنے والے کو بھی ایک حد تک "سرد" کر دیتی ہے۔ لیکن کرشن چندر کی موت نے اُس کی زندگی کے بارے میں ایک سوال اٹھایا ہے۔ کیا ایسا تو نہیں کہ وہ اپنے بے شمار کرداروں کے ساتھ زندگی اور موت کی دھوپ چھاؤں کا کھیل کھیلتے ہوئے اپنی خوابوں کی دنیا میں گم ہوگیا ہو۔

وہ دنیا جو اُس کے ہر افسانے کی لوحِ ہستی سے عبارت ہے اور وہ دنیا جو اُسے آزادی کے تیس سال بعد بھی نہ ملی کہ جب پوری زندگی ہی دھوپ چھاؤں ہے تو پھر قوموں کی حقیقی اور مفروضہ آزادی کے درمیان ایک بہت جلی خط کھنچا ہوا محسوس کیا جا سکتا ہے۔ مشکل اُن سوچنے والوں کی ہے جو اس خط کو واضح تر کرتے رہتے ہیں اور اپنے فن کو اس علم و آگہی کا آلہ بنا ڈالتے ہیں۔ کرشن بلاشک و شبہ اُن افسانہ نگاروں میں سے ہیں جنھوں نے اپنے ملک اپنے برصغیر اور اپنی دنیا کی زندگی کی تہہ میں جھانک کر دیکھنے کی بھرپور سعی کی اور فن و فلسفۂ حیات کو ایک دوسرے کا شارح بنا کر رکھ دیا۔

پریم چند کے "کفن" سے کرشن چندر کے "ان داتا" تک ایک ہی سفر ہے۔ بس لکھنے والے کا VISION بدلتا رہتا ہے۔ کرشن نے گورکی اور چیخوف اور کسی حد تک شولوخوف اور ایلیا اہرن برگ کا اس درجہ اثر قبول کیا ہے کہ اگر ہم صرف اُن کے افسانوں کے عنوانات ہی کا جائزہ لیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ برصغیر کے چیخوف اور ایلیا اہرن برگ کے PARADOXES اور رومانٹک IMAGES اپنی مقامی رنگ کے علاوہ بین الاقوامی اثرات اس درجہ شیر و شکر ہیں کہ کرشن صحیح معنوں میں برصغیر کے پہلے افسانہ نگار ہیں جنھوں نے بین الاقوامیت کے احساس کو فزوں سے فزوں تر کیا اور اپنے انتقال کے وقت وہ اس قدر کچھ لکھ چکے تھے کہ اس میدان میں شاید ہی کوئی دوسرا افسانہ نگار اُن کی ہمسری کا دعویٰ کر سکے۔ اردو فکشن بہت مدت کے بعد کرشن چندر جیسے مسیحا نفس ادیب سے محروم ہوا ہے اور نہ جانے کب تک ایک ایسے افسانہ نگار سے محروم رہے جس کا دائرۂ اثر کرشن چندر کی حدود کو پھلانگ سکے۔ غالباً اب ہم اُس سے کم تر قلم کاروں کے دور میں داخل ہو چکے ہیں جہاں پریم چند اور ٹیگور کا سلسلہ دم توڑ چلا ہے۔

کرشن چندر واقعتاً ایک بڑے ادیب ہیں۔ بڑے اس لیے نہیں کہ اُن کے موضوعات میں بے پناہ تنوع اور وسعت کے ساتھ ساتھ جا بجا بلند قامتی بھی نظر آتی رہتی ہے۔ انھوں نے ۴۱ سال تک (۱۹۳۶ء سے ۱۹۷۷ء) تک بہت جانفشانی کے ساتھ لکھا

اور اردو افسانہ کو اس قدر عروج پر پہنچا دیا کہ فنِ افسانہ کے کوچہ خارزار میں قدم رکھنے والوں کی اکثریت نے اب اس عظیم افسانہ نگار کو اس طرح خراجِ عقیدت پیش کرنا شروع کر دیا ہے کہ یا تو اُن کا کھلے بندوں تتبع ہو رہا ہے یا اُن سے لذتِ انحراف کشید کی جا رہی ہے۔ دونوں صورتوں میں کرشن چندر کی عظمت مسلّم ہے کہ وہ افسانہ نگار بھی جو کرشن چندر کی طبعی موت سے بہت پہلے انھیں "مردہ" تصور کر چکے تھے دراصل ایک ایسے خیالِ خام میں مبتلا تھے کہ کرشن چندر کے طویل باب کو جلد از جلد ختم کر کے اپنے عہد کا نیا باب شروع کر دیں۔ تاکہ فن اور فلسفۂ حیات کے سنجوگ کے بعد فن کار اور معاشرے کے درمیان مغائرت کا ناقوس پھونکا جا سکے اور اس طرح اُن ساری کوششوں کو لایعنی بنا کر رکھ دیا جائے جنھوں نے لایعنیت اور مجہول رومانیت کے پرخچے اڑا دیے تھے۔

لیکن کرشن چندر نے اردو ادب میں جس مطمحِ نظر کو فروغ دینے کی کوششیں کی تھیں وہ بین الاقوامیت کے جذبے کے ساتھ اس قدر گتھی ہوئی تھیں کہ جوں جوں دنیا کے نقشے پر نو آبادیاتی نظام کا دائرہ سکڑتا گیا کرشن چندر اور اُن کے ہم خیالوں کی دنیا پھیلنے لگی۔ اگر ایک طرف کفِ افسوس ملتے ہوئے پژمردہ انٹیلکچوئل کی ڈوبتی ہوئی دنیا تھی تو دوسری طرف فتح و کامرانی کے جذبے سے سرشار ایک ایسی دنیا طلوع ہو رہی تھی جس نے ادب اور فن کی تعریف اور تعبیر کو یکسر بدل ڈالا تھا۔ اگر ہم ٹھنڈے دل سے غور کر سکیں کہ ہمارا تعلق کونسی دنیا سے ہے یا ہو سکتا ہے تو پھر کرشن چندر کی موت کوئی معنی نہیں رکھتی کہ وہ شخص کیونکر مر سکتا ہے جو روز اُبھرنے والے سورج کے ساتھ طلوع ہو رہا ہو۔

آخری دس برس میں کرشن چندر نے بہت کچھ لکھا۔ ادب اُن کے لیے اظہارِ ذات بھی تھا اور اظہارِ فن بھی۔ کرشن نے اس قدر بہت سا ادب تخلیق کیا ہے کہ چالیس سال کے عرصے میں اُن کی ۹۰ سے زیادہ کتابیں منصۂ شہود پر آئیں اور وہ دس مزید کتابوں کا مواد چھوڑ گئے ہیں۔ ایک ایسے شخص کی طرف سے جس نے ساری عمر سنجیدہ اور فکری ادب کے ذریعہ سنسنی خیز، جاسوسی اور سستے رومانی ادب کا مقابلہ کیا ہو یہ ممکن نہیں ہو سکتا کہ اس کی ہر تخلیق "ان داتا" یا "غدار" ہی ہو۔ ایسا کون سا ادیب ہے ـــ چیخوف سمیت۔ جس کی کچھ تخلیقات "وغیرہ وغیرہ" کی زد میں نہ آ سکیں۔ لیکن جو بات سب سے زیادہ اہم ہے وہ یہ ہے کہ کرشن ۱۰۰ کتابوں کے لگ بھگ "مواد" کے خلاق ہوتے ہوئے بھی کبھی ہمت ہارتے نظر نہیں آتے۔ وہ "بندوق" کی بجائے "پھول" کے لہجہ میں بات کرنا چاہتے ہیں، متشدد مذہبی حلقوں میں سستی شہرت چاہتے نظر نہیں آتے، غلط افراد یا گروپوں کی مدح سرائی کے ذریعہ روز روز کی محنت سے نجات حاصل کرنا نہیں چاہتے اور آخری وقت تک دوستوں کے ساتھ دوستی نبھانے کی "آن" پر ڈٹے ہوئے ملتے ہیں اور اسی لیے اردو ادب بجا طور پر اُن کی شخصیت کے ہر پہلو پر ناز کر سکتا ہے۔

کرشن چندر کی بسیار نویسی سے بہت سے کم ہمت، کم سواد اور تجربہ جا افراد نے فائدہ اٹھایا ہے۔ وہ یہ گرگے اتنے بڑے پیڑ تھے کہ اُن کے سایے میں پاؤں پسارنے کی خواہش فطری تھی اور بہت سے حضرات نے تو یہ کام کیا کہ جس تجربے کی منزل میں کرشن ایک ہفت خواں طے کر کے آئے وہ وہاں صرف ایک زقند میں پہنچ گئے۔ انھوں نے یہ کیا کہ کرشن چندر افسانوں کی کان سے کوئی چمکتا ہوا ہیرا اٹھایا اور کہیں اُسے مسطح اور سپاٹ کر ڈالا اور کہیں اُسے جُز جُز اور لخت لخت زندگی کا مظہر بنانے کے لیے کثیر الجہتی آلۂ اظہار بنا ڈالا۔ میرا یہ دعویٰ نہیں کہ کرشن چندر کے افسانوں سے گذرنے کے لیے یہی دو طریقے آزمائے گئے۔ ایک اور طریقہ اُسے یکسر نظر انداز کرنے کا بھی تھا۔ لیکن کرشن کے "مواد" اور "فلسفۂ حیات" سے انحراف کے لیے ضروری تھا کہ اُسے ہیئت کے میدان میں دقیانوسی اور میکانکی ثابت کیا جائے تو پھر آپ معترضین کے اعتراضات کی میکانیکیت ملاحظہ

کیجیے اور تازہ، حضرات کی ژولیدگی پر ماتم کیجیے۔ اصل میں کرشن چندر کی انسان دوستی اُن حضرات پر شاق گزرتی ہی تھی جو "مغائرت" کے پروردہ اور اسی لیے اس کے دکلا ہیں۔ انھوں نے ادب کی خودمختاری کے نام پر ادب کی بہت سی ایسی تعریفیں کروالیں کہ مجھے آج بہت سے ادبا، صریحی طور پر۔ ادب دشمن نظر آتے ہیں۔ یہ حضرات ادب اور سماج کے درمیان ایک دیوارِ چین تعمیر کرنا چاہتے ہیں، ایک ایسے نقطۂ نظر کے لیے جس کی صراحت ایلیٹ کی اور — THE WSTE LAND — THE HOLL OWMEN سے ممکن ہے۔ لیکن اُس کا علاج ایک مربوط عمرانی و سیاسی فلسفہ ہی سے ہو سکتا ہے —

کرشن چندر کی افسانہ نگاری کے بارے میں بہت سی حتمی باتیں کہی جاسکتی ہیں اور ایک ایسے دور میں جہاں سارا زور "قطعیت" کی تردید پر ہو۔ یہ بہت اچھا فریضہ نہ ہوگا۔ لیکن اگر کچھ لوگوں کے خیال میں زندگی اور ادب کے درمیان قطعی رشتے موجود ہیں تو وہ قطعیت سے خائف نہ ہوسکیں گے کہ آج کی انسانی سچوایشن جس قدر پیچیدہ ہے اسی قدر صلابتِ رائے کی طالب بھی ہے۔ کرشن چندر کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے زندگی کی رومانی تاویل اور تشریح کے خلاف منظم بغاوت کی۔ وہ "خواب و خیال"، "نگارستان" اور "جمالستان" کے زمانے کو پھلانگنا چاہتے تھے۔ اور جب کسی غالب رجحان کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا جاتا ہے تو ایسا کرتے وقت مواد CONTENT کی فوقیت کے لیے اسلوب STYLE کے ساتھ نامانوس اور متوازن معاملت کرنی پڑتی ہے۔ کرشن چندر کے یہاں مانوس فضا اور متوازن سوچ کا وفور ہے اور یہ وہ وصف ہے جو انھیں کلی طور پر "رومانوی" بننے نہیں دیتا۔ تا آنکہ آپ کرشن کی سوچ ہی کو "رومانی" قرار نہ دیں۔ اور یہ صرف زیادتی ہی نہیں بلکہ بہت سطحی بات ہوگی۔

کرشن چندر کے اوائلی افسانوں کی مخصوص فضا کے پس پشت اُن کی نوجوانی کے زمانہ کے محبوب اور مقبول افسانہ نگاروں کی تحریروں کا مطالعہ ضروری ہے اور صرف اس کے بعد ہی یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمیں اُس زمانے میں جب کرشن چندر جیسا امن پسند شخص بھگت سنگھ جیسے عظیم انتہا پسند حریت پسندوں کے گروپ سے متعلق تھا، اُس پر پریم چند، یلدرم، نیاز مجنوں، ٹیگور اور سدرشن کے علاوہ بنگالی حقیقت نگاروں کی تحریروں کے اثرات پڑنے شروع ہو گئے تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ بالآخر پریم چند، ٹیگور اور سدرشن کے حلقۂ اثر میں آ گئے۔ کرشن چندر نے درشت حقیقت نگاری کے مقابلہ میں، جمال و جلال، کا آمیزہ تیار کیا۔ اُس نے اپنے بچپن کے چناروں کی خوشبو سے مہکتی ہوئی فضا میں بدحالی اور ویرانی کے ایسے پیش پا افتادہ مرقعے تلاش کر لیے کہ اقبال، جوش، فیض، راشد اور قاسمی کی شاعری کے انداز میں جب اُس نے انسانی ابتلا کے مدِمقابل فطرت کی معصومیت اور خوبصورتی کا آئینہ رکھا تو سارا منظر کہر آلود ہوکر رہ گیا۔ غالبًا اسی لیے کرشن چندر ترقی پسند تحریک کے ایک ایسے "شاعر" ہیں جنھوں نے "طلسمِ خیال" کے افسانوں سے لے کر "شکست" (سنہ ۱۹۴۳ء) تک اور پھر فن اور شخصیت (بمبئی کے مہندرناتھ نمبر) میں اپنے شہرۂ آفاق رپورتاژ تک ایک نغمہ ریز اور نغمہ ریز شاعر کی طرح اردو افسانے میں وہ بنیادی کام کیا جو فطرت پر انسانی ارادے کی حکمرانی چاہنے والے بہت سے شعرا نے اپنی شاعری کے ذریعہ انجام دیا تھا۔

اُن کے افسانوں میں "یرقان"، "جہلم میں ناؤ پر"، "مہا لکشمی کا پُل"، "دوسری موت"، "ان داتا"، "ایکسٹرا گرل"، "بالکونی"، "کشمیر کو سلام"، "کالو بھنگی"، "پانچ روپے کی آزادی"، "لال باغ"، "پورے چاند کی رات"، "گرہن کی ایک شام" —— "دو فرلانگ لمبی سڑک" اور ناولٹ "غدّار" کے مطالعہ سے کرشن چندر اور فطرت اور کرشن چندر اور انسانی سچوایشن جیسے

موضوعات پر بہت سے ایسے نکات بہم ہو سکتے ہیں جن سے کرشن چندر کی فکر کا مطالعہ ہو سکتا ہے۔

"خود شکست" میں ہم خود کو ایک ایسے فن کار کے روبرو پاتے ہیں جو افسانہ نگاری کے جملہ امکانات کو ایک کوزہ گر کے چاک کی نرم مٹی کی طرح برتتا ہوا ملتا ہے۔ وہ سیدھا سادھا قصہ گو نہیں ہے۔ اُس کے یہاں اسکیچ نگاری بلکہ بعض ناقدین کے خیال میں ہنی ایچر مصوری کے نمونے اس تیزی اور روانی کے ساتھ متشکل ہوتے ملتے ہیں کہ ہر دور میں اُس پر دو جہتوں سے ایک ہی جیسا الزام لگا: ایک یہ کہ کرشن چندر وقت کے ساتھ بہہ جاتے ہیں۔ یعنی ان میں WILL کی کمی ہے اور دوسرے یہ کہ وہ مکمل استرداد یا مکمل بغاوت کی بجائے بیچ کی راہ نکالنے کی تگ و دو کرتے ہیں تاکہ وہ ہم وقت نظریاتی اور جدت پسند قارئین کے درمیان پھیلے ہوئے نا وابستہ قارئین کے وسیع ہجوم میں سے زیادہ سے زیادہ قارئین اُچک لیں، بہر حال یہ حقیقت ہے کہ کرشن چندر خواہ دنیا سازی کے میدان میں ہیچ مداں ثابت ہوئے ہوں۔ لیکن انھوں نے اپنے قارئین کے ساتھ ہمیشہ بہت اچھے تعلقات قایم رکھے۔ ممکن ہے کہ یہ خوبی اُن افسانہ نگاروں پر گراں گذرے جو عام قارئین کی تضحیک پر ادھار کھائے بیٹھے رہتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی شخص یا ادارہ عام قارئین پر کسی ایک فرد یا گروہ کی جملہ تحریروں کی اثر آفرینی دیکھنی چاہے تو پھر لازمی طور پر کرشن چندر اور اُن کے ساتھیوں نے جن میں منٹو، عصمت، قاسمی، بیدی، خواجہ احمد عباس، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، شوکت صدیقی، انور اور ابراہیم جلیس اور بعد میں جوگندر پال، رام لعل اور اختر جمال جیسے ادبا کا نام لازمی طور پر لیا جائے گا کہ ان ادبا نے کچلے ہوئے انسان کو ہیرو کے طور پر برتنے کی سعی کی ہے، بالکل اُسی طرح جیسے انسان سیتا ہو اور اُس کی خوشیوں اور کامرانیوں پر ہاتھ صاف کرنے والی طاقتیں، راون، ہوں

کرشن چندر نے برہم پترا، امن کی انگلیاں، دل کا چراغ، تین غنڈے، انجیر کا درخت، پیری اور بارود کے پھول ہوا کے بیٹے جیسے سیاسی افسانوں سے لے کر چوراہے کا کنواں، غالیچہ، سپنوں کے اشارے اور دو فرلانگ لمبی سڑک غرض کہ ہر قسم کی تکنیک پر قلم آزمائی کی تاکہ جزئیات نگاری، تجریدیت اور وجودیت کے وکلا، صرف ہیئت کی بنیاد پر مقدمہ نہ جیت لیں، لیکن یہ ساری کد و کاوش دوسروں سے ممیز اور ممتاز نظر آنے کے لیے نہیں، بلکہ قلم کاری کے جملہ امکانات کو بروئے کار لانے کے لیے کی گئی تھیں۔

میں اس مختصر سے مضمون میں کرشن چندر کے حوالہ سے اپنی گفتگو کو سماجی فلسفہ، تہذیبی اقدار یا انسان دوستی کے وسیع تناظر کے گرد گھمانا نہیں چاہتا کہ کرشن چندر ہی پر کیا موقوف، ہمارے اکثر و بیشتر ادبا پر لکھے گئے تنقیدی مضامین اسی قسم کی سہل انگاری بلکہ نیم دلی کا شکار رہتے ہیں۔ ساتھ ہی میں یہ اعتراف بھی کرتا چلوں کہ کرشن چندر کے بہت سے افسانے میرے سامنے نہیں۔ لیکن میں نے کوشش کی ہے کہ قابلِ ذکر افسانوں کے ساتھ (OMISSION) کا ارتکاب نہ کروں۔ لیکن کرشن چندر نے اس قدر لکھا ہے کہ غالباً اس کام کے لیے ایک باقاعدہ ادارہ درکار ہوگا، تاکہ کرشن کے ساتھ انصاف کیا جا سکے۔

اس مضمون میں گفتگو کرشن چندر کے یہاں فطرت کے ساتھ معاملت پر بھی ہونی چاہیے۔ کرشن چندر نے فطرت پر خاص انداز میں نگاہ ڈالی ہے۔ یہ اُچٹتی ہوئی نگاہ نہیں ہے۔ یہ فطرت کو بدلنے پر قادر انسان کی نگاہ ہے اور کرشن چندر کے یہاں یہی ایک ایسا وصف ہے جس نے اس میدان میں کرشن کی ذات کو PIONEER بنا دیا ہے۔ ترقی پسند ادب نے ادب اور سماج کو ایک دوسرے کے قریب لا کھڑا کیا تھا، اور وہ زندگی کی اندرونی جدلیت سے متصادم ہونے کی بجائے اُس کے ساتھ یک رنگ

ہونا چاہتا تھا۔ ترقی پسند ادب نے فن کار اور فطرت کے درمیان ایک نئے رشتے کی اساس ڈالی۔ اب فطرت محض تزئین یا خارج کا اظہار نہیں رہی، بلکہ انسانی ارادے کے سامنے سفال کوزہ گر کی طرح "نم" تھی۔ انسان اور فطرت کے درمیان مبارزہ آرائی ہوتی آئی ہے، لیکن اس دفعہ ایک فلسفۂ حیات سے وابستگی کے احساس نے انسان کو اس قدر مقدرت دی کہ وہ خود کو مناظر تبدیل کر دینے پر قادر محسوس کرنے لگا۔

کرشن چندر کے بہت سے افسانوں خاص طور سے "ان داتا"، "چیری اور بارود کے پھول"، "غدار"، "امن کی انگلیاں اور نیفا میں ایک گدھا"، اسی انقلابی فلسفہ کے خمیر سے اٹھے ایسے کرشن کی اولعلی رومانیت نے جنم دیا تھا۔ ہمارے روایتی ادب کی مجہول رومان پسندی کے مقابلے پر کرشن چندر اور اس کے ساتھیوں نے جس انقلابی رومان پسندی کو متعارف کروایا تھا وہ ہمارے شہروں کے سماجی تاروپود کے اندر اس درجہ رچ بس گئی ہے کہ فن اور فلسفہ کا فرق معدوم ہوتا ہوا نظر آتا ہے، اور اس کا حیرت انگیز نتیجہ یہ ہوا کہ متوسط طبقہ کے ادبا کے ادب کا سماجی اور سیاسی "جوہر" سماج کے نچلے اور اوپر کے طبقے تک پہنچ گیا اور بہت سی سیاسی پارٹیوں نے بھی اس بنیادی انسانی آدرش اور اخلاقی فلسفہ کو اپنا لیا جو ادبی تخلیقات کے ذریعہ متعارف ہوا اور پروان چڑھا۔ ادب اور سیاست کے درمیان تفاعلِ باہمی سے مخصوص ترجیحات کے وکلا پر کاری ضرب لگی اور وال اسٹریٹ کے سٹہ بازوں نے محسوس کیا کہ بین الاقوامیت کا فزوں تر احساس سامراجی مقاصد کی راہ میں کس درجہ مزاحم ہو سکتا ہے۔

اس لیے کرشن چندر اور اُن کے ساتھیوں کی سب سے بڑی خوبی ہی یہ ہے کہ ان حضرات کی تخلیقات نے بہت سی غیر مرئی اور غیر محسوس قوتوں کی عقدہ کشائی ممکن بنا دی۔ اُن قوتوں کی بھی جن کی جانب سرد مہری اور حقارت کا رویہ ہمارے بہت سے دانشوروں کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ کرشن چندر اپنے مخالفین کی تحریروں میں بطور خاص اس لیے ہدف بنے کہ اُن کے افسانوں کی ہشت پہلو دنیا میں ایک اخبار کی طرح سب کچھ ہوتا ہے، بین الاقوامی معاملات کے اشارے، خالصتاً مقامی موشگافیاں، جدید تجارتی لین دین اور اُن سے مرتب ہوتا ہوا اخلاقی نظام اور ہر لمحہ بدلتی ہوئی دنیا کی نظارہ طلب حشر سامانیاں اور اُس پر مستزاد یہ کہ ایک ایسا اخلاقی فلسفہ جو انسانی زندگی کی کلیت پر اصرار کرتا ہو جس میں اپنی اپنی جگہ اجزا بہت اہم ہوں۔ آپ کرشن چندر کے سنہ ۱۹۴۴ء کے بعد کے افسانوں کا مطالعہ فرمائیں تو آپ اُن کے یہاں ایک خاص "شفٹ" (تبدیلی) پائیں گے۔ یہ حقیقت پسندی کی جانب واضح سفر کی نشان دہی ہے جس میں "طلسم خیال" اور "شکست" کی رومانی فضا کی بجائے انقلابی حقیقت پسندی کا جابجا مظاہرہ ملتا ہے۔

اس نئے دور میں کرشن چندر نے تکنیک میں تجربات پر بہت زیادہ زور نہیں دیا ہے، لیکن اُس نے حقیقت افروز اور خود مختار "اجزا" کو اس چابک دستی سے مجتمع کیا ہے کہ اُس نے گشتالٹ نفسیات کے وکلا پر بڑے زوردار انداز میں وار کیا ہے۔ اس دور میں کرشن چندر نے چیخوف اور ورجینیا وولف کی نمایندہ تکنیکوں کا ایک ملغوبہ وضع کرنے کی کوشش کی ہے۔ کرشن چندر اپنے افسانوں میں رموزِ زندگی کی غیر یقینیت اور پُراسراریت کا سراغ لگانے کے لیے کاشفِ اسرار کی ضرورت کو پروموٹ کرتے ہیں۔ کبھی وہ "ڈاکٹر" ہے۔ چیخوف کے افسانوں کی طرح اور کبھی وہ انسانی ڈرامہ کا "ہدایت کار" ہے تاکہ خالق اور تخلیق کے درمیان "اندھیرے کا مہیب سناٹا"، ختم کیا جا سکے۔ اُن کے یہاں سنہ ۱۹۴۴ء سے سنہ ۱۹۴۹ء تک کے وقفہ میں انقلابی رومانیت اور انسان دوستی پر اصرار بڑھتا رہا۔ لیکن سنہ ۱۹۴۹ء کی بھیمڑی کانفرنس کے بعد وہ انقلابی حقیقت نگاری کی طرف راجع ہوئے

لیکن کرشن چندر مثبت رومانیت سے کبھی بھی دست کش نہ ہو سکے۔ بلکہ تقسیم کے بعد اُن کی افسانہ نگاری میں ایک ایسا موڑ بھی آیا جب وہ حقیقت کی تلاش میں ۔FANTASY کی سمت نکل گئے۔

اس کے علاوہ کرشن چندر نے فلمی دنیا سے اپنی گہری وابستگی سے (جس کا ثبوت ان کی تیار کردہ دو فلموں کے علاوہ درجنوں فلموں کی کہانیاں بھی ہیں) ایک اور کام لیا۔ انھوں نے فلمی دنیا کی غیر حقیقی فضا کو ایک ایسی دنیا کے طور پر برتا ہے جسے وہ MAKE-BELIEVE ۔ کی بورژوا دنیا سے زیادہ مختلف نہیں سمجھتے۔ اس دنیا کے ایکسٹرا، فلم اسٹوڈیوز کے باہر کی جیتی جاگتی دنیا کے عوام الناس کے مانند ہیں اور اُن کے احساسات اور جذبات کی سرزنش کے لیے جس قسم کے غیر جذباتی سوانگ رچائے جاتے ہیں وہ اس قدر ہولناک نظر آتے ہیں کہ اس "حیرت" کا مزا چکھنے کے لیے "فلمی قاعدہ" سے ہٹ کر۔۔۔ "چاندی کا گھاؤ" "باون پتے" اور بار بورن کلب کے افسانے ضروری ہو جاتے ہیں۔ رات کی جگمگاہٹ میں میک اپ سے اٹی ہوئی "حسینائیں" کو صبح سویرے بے حال بلکہ کراہتے ہوئے گوشت کے لوتھڑوں کی طرح این جانب و آں جانب دوڑتے ہوئے دیکھ کر حساس قارئین کی چیخیں بلند ہو جاتی ہیں۔ کرشن چندر نے فلمی دنیا کے ذریعہ اُس حقیقی دنیا کے اسٹیج کی جانب اشارے کیے ہیں جہاں ہم سب ایک بڑے اسٹوڈیو میں کسی فلم ساز اور ہدایت کار کے اشاروں پر اپنا اپنا کام انجام دے رہے ہوتے ہیں اور کرشن کا کمال ہی یہ ہے کہ وہ یہ احساسِ التباس پیدا کرنے کے لیے نعرے نہیں لگاتے، ہاں اپنے قارئین کو اُن نعروں کے لیے تیار کرتے ہیں جو سڑکوں پر لگائے جا رہے ہیں۔

غالباً اسی لیے اردو کے منفرد نقاد محمد حسن عسکری نے کرشن کی فنی مہارت کے بارے میں ٹھیک ہی لکھا تھا:۔ "کردار نگاری کو تو خیر وہ دوسرا درجہ دیتا ہی ہے، مگر کرشن چندر نفسیاتی تجزیے کے جادو سے خوب بچا ہے۔ یورپ میں تو تجزیے کی گویا پرستش ہوتی ہے، مگر ہمارے افسانہ نویس بھی اب بڑی تیزی سے اُس طرف بڑھ رہے ہیں۔ لیکن کرشن چندر نہ تو خود کسی کو مرعوب کرنا چاہتا ہے اور نہ وہ خود کسی سے مرعوب ہوتا ہے، خواہ وہ جیمس جوائس ہی کیوں نہ ہو۔ وہ جانتا ہے کہ نفسیاتی تجزیہ افسانہ نگار کو کن کن گڑھوں میں لے جاتا ہے۔ یہ چیز بڑی آسانی سے زندگی سے فرار سکھا دیتی ہے، زندگی کی بڑی بڑی حقیقتوں کو بھول کر آدمی یہ دیکھنے میں لگ جاتا ہے کہ ایک مکھی بیٹھنے سے دماغ میں کیا ردِ عمل ہوتا ہے۔ چونکہ وہ سوائے اپنے کسی اور کے نفسیاتی عمل کو نہیں سمجھتا۔ اس لیے وہ اپنے آپ کو ایک مثالی آدمی سمجھ کر اپنے کپڑے اپنے کرداروں کو پہنانے لگتا ہے۔ وہ بہت جلد خود پرست بن جاتا ہے۔ مگر کرشن چندر اس راستے کے خطروں سے خوب واقف ہے۔ اُس کے نزدیک آرٹ زندگی کا خادم ہے اور اسی وجہ سے قابلِ قدر ہے۔۔۔۔۔ اُس کی منظر نگاری اوروں کی طرح نہیں ہے، اُس کے افسانے کی فضا، نفسیاتی کیفیت اور مناظر باہم ایسے دست و گریباں ہوتے ہیں کہ آپ اُس کے بیان میں سے ایک لفظ نہیں نکال سکتے ـــــ اس خصوصیت کی اور اس علامتیت کی بہترین مثالیں "ٹوٹے ہوئے تارے" میں ملتی ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھتے ہوئے میں بے جھجک کہہ سکتا ہوں کہ اس افسانے سے عمدہ افسانہ شاید ہی اُردو میں ملے ـــــ"

آج عسکری صاحب اپنی مندرجہ بالا رائے پر قائم ہیں یا نہیں یہ الگ معاملہ ہے لیکن عسکری صاحب نے کرشن چندر کی عظمت کے بارے میں کلیدی معیار پیش کر دیا ہے۔ اب اس رائے سے اتفاق یا اختلاف ہو سکتا ہے اور یہ ادب کے لیے اور خود کرشن چندر کے لیے بہت سود مند رہے گا لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ رائے "شکست" سے پہلے دی گئی تھی اور اُس

کے بعد کرشن چندر کے فن نے مزید بلندیاں چھوئیں ۔ مثلاً فلمی دنیا کے بارے میں کرشن چندر نے اپنے افسانوں کے ذریعہ ایک ایسی MYTHOLOGY مرتب کی ہے جو بادی النظر میں بہت سیکولر، بہت سادہ ہے لیکن اس مائتھالوجی کی جڑیں ہندوستانی معاشرے کی رگ رگ میں سرایت کیے ہوئے ہیں، یہاں دیوتا ... اور دیویاں انسانوں کے روپ میں چلتی پھرتی دکھائی دیتی ہیں۔ اُس پر مستزاد یہ کہ اس مائتھالوجی کا کوئی ایک متعین 'SET' نہیں ہے۔ اس مائتھالوجی میں بین الاقوامی رنگ بھی ہے اور اس طرح کرشن چندر کی مائتھالوجی این فلیمنگ کے ناولوں میں یونانی دیومالا کے جدید کرداروں کی طرح بڑی حد تک انسانی بچوایشن میں سانس لیتی ہوئی ملتی ہے۔ کرشن چندر کا کمال یہ ہے کہ وہ دور از کار اشاروں کو قریب اور بہت قریبی محاکات کو بعید از قیاس میں متبدل کرتا ہوا چلتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں اور بہت زیادہ غلط نہیں سمجھتے کہ بالآخر ایک میلو ڈرامائی ڈرامہ شروع ہو گیا ہے، اب تالیاں بجیں گی، اور کٹھ پتلی کے تماشہ کے WOODEN کردار ہماری داد و بیداد سے بے نیاز ہو کر اپنے اپنے ڈبوں میں بند ہو جائیں گے۔ لیکن کرشن چندر کا فن یہ ہے کہ وہ آپ سے کٹھ پتلی کا تماشہ دیکھنے کی فرمائش کرتا ہے، اور آپ کٹھ پتلیوں کو کٹھ پتلی مانتے ہوئے بھی اُن سے زندہ ہونے کی اپیلیں کرنے لگتے ہیں اور وہ سب یونانی مائتھالوجی کے ایک قصہ میں ایک "بُت" کی طرح ٹہر ٹہر کر زندہ ہو جاتے ہیں، پھر وہ سب کچھ ہوتا ہے جس سے ہوش اڑ جاتے ہیں۔ ہم اپنے اردگرد کے کرداروں کو چھو کر دیکھنے لگتے ہیں کہ مبادا وہ کٹھ پتلیاں ہوں جو پبلک کے بے حد اصرار پر زندہ ہو گئی ہوں۔ کرشن چندر نے زندوں کو کٹھ پتلیاں اور کٹھ پتلیوں کو زندہ بنانے کا کاروبار اس قدر یکسوئی اور لگن کے ساتھ چلایا کہ عقل سے عاری 'عقلمندوں' نے اُسے 'مداری' تک کہہ ڈالا، حالانکہ وہ بھول گئے کہ کرشن چندر جس ریاضت اور کد و کاوش کی وجہ سے 'عوامی فن' کا مقلد بنا تھا اور جس صفائی سے قصہ گوئی سے عہدہ برآ ہو جایا کرتا تھا اُس کا صرف ایک مقصد تھا! وہ اپنے قارئین میں خود کو ٹٹولنے اور اپنے اندر زندگی کی "خود تصدیقی" کا جذبہ بیدار کرنے کی اپیل کرتا تھا، اور یہ وہ کمال ہے جو فن سادہ کے ذیل میں نہیں آسکتا۔ وہ اتنا بڑا فن کار تھا کہ اُسے آسانی کے ساتھ غیر فن کار ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ گلبرٹ مرے نے چیخوف کے لیے کہا تھا کہ "چیخوف کے افسانوں کو کیا نام دیا جائے؟"——

یونانی دیو مالا اور ادب سے انتہائی شغف رکھنے کی وجہ سے وہ جس جواب کے مستحق ٹھہر سکتے تھے

وہ بہت سادہ تھا: کمالِ فن ——

—— کرشن نے فن کی بلندیوں کو چھو لیا تھا، بلکہ وہ فن کی بلند چوٹیوں پر دھونی رمائے ہوئے ایک ایسا بیراگی تھا جس نے لپستیوں کے عمیق مطالعہ میں اپنی عمر کے چار عشرے صرف کر دیے اور جب کبھی اُسے یہ وسوسہ ڈستا کہ لوگ اُسے مکمل فن کار تسلیم کر کے عدم اخلاص کا مظاہرہ کریں گے، وہ پھر ایک ایسی چال چلتا کہ خود کو ادیب کہلوانے کے امتحان سے گذرنے لگتا۔

وہ اپنے کرداروں کی طرح ہر وقت معرضِ امتحان میں رہنا چاہتا تھا ——

وہ بلندیوں پر متمکن تھا لیکن ہر وقت اس سورج کو تکتا رہتا جو زندگی کا سندیسہ لاتا ہے۔ وہ غور و فکر کا عاشق تھا۔ پھر خود ہی کہہ اٹھتا کہ، "ایک دن ضرور ایسا ہوگا، وہ دن آج آئے، کل آئے، سو سال بعد آئے، سو ہزار سال بعد آئے۔ لیکن اگر انسان اشرف المخلوقات ہے، اگر اُس کی زندگی کا کوئی مصرف ہے، اگر اس کی تہذیب کا کوئی مقصد ہے... ... تو وہ دن ضرور آئے گا جب انسان اپنی جان پر کھیل کر اپنی تمام خامیوں سے لڑتے ہوئے اپنی وحشی جبلتوں پر قابو پاتا ہوا، فطرت کے ہر راز کا سینہ چیر کر بلند و بالا انسانیت کی درخشاں منزل کو چھوئے گا۔

"اور اس دن کے انتظار میں مجھے زندہ رہنا ہوگا......... اور پھر میرے چاروں طرف دریا کے اُس کنارے تک روشنی چمک اُٹھی——
بچے کو دونوں ہاتھوں میں اوپر اُٹھا کر اُس کے گالوں کو بوسہ دیا—— اُس کی پیشانی کو چوما اور اُسے اپنے کندھے پر بٹھا کر اُمید کی اُس وادی کی طرف چلا گیا۔ جہاں سورج کبھی غروب نہیں ہوتا"——

یہ دیو مالائی قصہ نہیں، بلکہ کرشن چندر سچ مچ اُس وادی کی طرف چلا گیا ہے جہاں سورج غروب نہیں ہوتا——

کرگیں کام کٹ کے سر میرا
خون بولا، نگر نگر میرا

حزیں لدھیانوی کا
ابدیت افروز شعری مجموعہ
شایع ہوگیا

لہو کی صدا

جس میں
روح عصر اپنی پوری
توانائیوں سے
جاگ رہی ہے

قیمت مجلد:—— ۱۵ روپے
—— ناشر: ——
ارتقا—پبلی کیشنز
۶۵ —— دی مال لاہور
فون ۵۸۹۱۸

اردو کے ممتاز افسانہ نگار
مقصود الٰہی شیخ
کے مقبول و پسندیدہ مجموعے

برف کے آنسو

پتھر کا جگر

(دوسرا ایڈیشن اضافے کے ساتھ)
نیا مجموعہ

جھوٹ بولتی آنکھیں

——(زیر ترتیب)——

تفصیلات کے لیے ——
رولیکس ٹریڈنگ کمپنی
۶۔ہال فیلڈ روڈ—— بریڈ فورڈ
فون ——۲۱۹۰۸—۰۲۷۴

ضمیر نیازی

کرشن چندر — سچائی کا علمبردار

اردو زبان کی تاریخ کو کھینچ تان کر زیادہ سے زیادہ پانچ صدیوں تک پھیلایا جاسکتا ہے — یہ دت قوموں یا زبانوں کے لیے کچھ ایسا زیادہ بھی نہیں ہے — ابتدا تو شعر سے ہوئی اور شعری ذخیرہ کیفیت و کمیت کے اعتبار سے حاوی رہا، لیکن قصہ یا داستان شعر پر بھی حاوی رہا — یہ جو مثنویوں کے اتنے ضخیم دفاتر ہیں یہ بھی منظوم داستانیں ہی تو ہیں، جن میں چند ایک پندرہ اور بیس ہزار اشعار پر مشتمل ہیں۔ اردو کے بعض محققین کے بیان کے بموجب "اردو میں دنیا کی ضخیم ترین داستانوں کی روایت بھی موجود ہے" ان حقائق کے باوجود اردو کا خمیر و فطرت غزل ہی ہے۔ یعنی دو مصرعوں والی بات . . . . . بات جو مکمل بھی ہو اور بھرپور بھی۔ یہ فطرت نثر پر بھی چھائی رہی۔

ملّا وجہی کے "سب رس" سے لے کر فرخندہ لودھی کے "حسرتِ عرضِ تمنا" تک "کتنے ایسے ناول تخلیق کیے گئے جنھیں عالمی شہ پاروں کے مقابلے میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس کے برعکس اردو افسانہ عالمی ادب میں ایک نمایاں مقام حاصل کرچکا ہے۔ وجہ یہی ہے، غزل مزاجی افسانے کو بھی راس آگئی ہے۔

ہمارے متعدد افسانہ نگار ایسے ہیں جن کی کہانیاں دنیا کی بیشتر ترقی یافتہ زبانوں میں ترجمہ ہوچکی ہیں۔ کرشن چندر ہی کو لے لیجیے۔ ان کی کئی کہانیاں برصغیر پاک و ہند کی علاقائی زبانوں کے علاوہ انگریزی، روسی، چینی، فرانسیسی، جرمن، ڈچ، نارویجی، چیک، رومانی، پولستانی، ہنگرین، اسلواک، جاپانی، سنہالی اور فارسی میں منتقل کی جاچکی ہیں۔ مختصر یہ کہ عالمی ادب تک ہماری رسائی اردو افسانے کی مرہونِ منت ہے۔

مختصر افسانے کی جب کبھی بات چل نکلتی ہے تو ہمارے بیشتر نقاد حضرات کی تان اس بات پر ٹوٹتی ہے کہ اردو نے دوسرا پریم چند کو جنم نہیں دیا۔ اس بیان میں نصف سچائی ضرور ہے — پریم چند نے جس دیہات کی عکاسی کی ہے وہ ان کے بعد ناپید ہوگئی۔ اور نیا افسانہ سمٹ سمٹا کر ملوں کی چمنیوں اور صنعتی شہروں کی ہماہمی اور گہماگہمی کا عکاس بن گیا۔ لیکن دوسری نصف سچائی یہ بھی ہے کہ آج کا افسانہ پریم چند کی روایات سے بہت آگے نکل آیا ہے۔ جس میں عصری آگہی کے عرفان و کرب نے اس میں فنی خوبصورتی، حسن کاری اور ایسی ہنرمندی پیدا کردی ہے جو زندگی کی ہمہ رنگی، قوت، ہمت اور شرافت کو بڑھاوا دے رہی ہے۔

۱۹۳۵ء میں ترقی پسند تحریک کے ابتدائی دور نے افسانہ نگاروں کی ایک ایسی کھیپ کو جنم دیا جو سماجی شعور و معنویت کے ساتھ ساتھ سیاسی سوجھ بوجھ سے بھی لیس تھی۔ اس گروہ کے سرکردہ ادیبوں میں منٹو، احمد علی، کرشن چندر، عصمت، بیدی

اور قاسمی کا فن اپنے منفرد انداز کے پیشِ نظر اپنی الگ پہچان رکھتا ہے۔

اس گروہ میں کرشن وہ واحد فن کار ہے جس کے تخلیقی سوتے آخر وقت تک جاری رہے۔ انھوں نے برصغیر اور باہر کی دنیا کے ہر واقعہ اور المیہ پر قلم اٹھایا، چاہے وہ بنگال کا قحط ہو یا فرقہ وارانہ بہیمیت، تلنگانہ اور بمبئی کے ملاحوں کی بغاوت ہو یا کوریا، ویت نام اور الجیریا کے جیالے عوام کی جد و جہدِ آزادی۔ پاک بھارت جنگ ہو، یا جنگی قیدیوں کی رہائی کا مسئلہ ان کا بیدار قلم ہمیشہ جنگ، جبر اور جہالت کے خلاف نبرد آزما رہا۔

آزادی کے بعد برصغیر کے دونوں ملکوں میں سیاسی ابتری اور معاشی زبوں حالی کچھ اس طرح بڑھی کہ صحت مند اقدار بھی اس کی لپیٹ میں آگئیں۔ ساتھ ہی بنیادی جمہوری حقوق پر بھی ہاتھ صاف کیا گیا۔ دوسری جانب ترقی پسند سیاست بھی تفرقہ کا شکار ہو گئی۔ ترقی پسندی پر ایمان متزلزل ہونے کے مختلف ردِ عمل پیدا ہوئے۔ اس انتشار کی مختلف حضرات نے مختلف تفسیریں اور توجیہات کیں۔ اور اپنے لیے راہِ فرار تلاش کر لی۔ بہت سے افسانہ نگاروں نے خالص رومانی اور جنسی لذتیت میں پناہ ڈھونڈی، بہت سے نظم گو بھاگ کر ایوانِ غزل میں سستانے لگے۔

کرشن نے بھی اُس عہد میں رومانی شعبدہ بازی کے سہارے رومان انگیز فارمولوں کو افسانوی رنگ میں ڈھالا (مثلاً ربڑ کی عورت، تنہائی کا پھول، عورت کا عطر وغیرہ) لیکن اردو افسانے کی یہ خوش قسمتی ہے کہ ایسی کہانیوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ وجہ ظاہر ہے کرشن ایک باشعور اور حساس قلم کے مالک تھے، وہ اپنے گرد و پیش سے بے خبر یا بے نیاز نہیں رہ سکتے تھے۔ انھیں انسان اور اس کی عظیم اقدار و صحت مند روایات پر مکمل اعتماد تھا۔ یہی وجہ ہے کہ کرشن بہت جلد رومانی شعبدہ بازی کے دلدل سے نکل آئے۔ ان کا فن طرف داری کا فن تھا۔ سماجی طرف داری کا فن، صحت مند اقدار و روایات کا فن، جو اس سے قبل ان سے "مہالکشمی کا پل"، "کالو بھنگی" اور "ان داتا" جیسے شاہکار تخلیق کرا چکا تھا، اور سیاسی شعور نے ان سے جہاں "تین غنڈے" اور "غدار" لکھوایا وہیں انھیں مجبور کر دیا کہ وہ بھارت میں مقید پاکستانی جنگی قیدیوں کی رہائی کا مطالبہ سب سے اونچی آواز میں کریں ـــــــ

ترقی پسند سیاست کے تفرقے نے سیاسی جماعتوں کے ڈھنڈورچیوں کو تو موت کی نیند سلا دیا، لیکن انسان دوست ترقی پسند ادیبوں کا کارواں منزل کی جانب گامزن رہا۔ کیونکہ اس کا ناتا انسانی اقدار سے تھا۔ کرشن چندر اسی دوسرے گروہ کے سرکردہ فن کاروں میں تھے ـــــــ

تحریک کی اساس روایت سے بغاوت پر ضرور تھی، لیکن اس سے وابستہ نوجوانوں کا ایک بہت بڑا گروہ روایت کی اہمیت و ادراک کے بغیر ہی اس کا منکر ہو گیا۔ روایات کے عرفان کے بغیر اس سے بغاوت یا انحراف سطحی ذہن کی علامت ہے۔ کیونکہ ہر روایت کے پیچھے صدیوں کا شعور اور اپنے عہد کا احساس ہوتا ہے جسے بعض ترقی پسند نہ سمجھ سکے اور نتیجہ میں سستی اور گھٹیا نعرے بازی کا شکار ہو گئے ـــــــ

کرشن نے ترقی پسند نظریات بلا سوچے سمجھے یا فیشن کے طور پر نہیں اپنائے تھے۔ اس نظریے کو انھوں نے گہرے مطالعے اور تیز مشاہدے کی روشنی میں اپنایا تھا، چنانچہ جب ترقی پسند تحریک اپنے عروج پر پہنچ کر ایک زوال افروز غرور میں مبتلا ہو گئی اور اُس نے اپنے گرد حصار باندھ لیا اور ترقی پسندی کے مفہوم کو اتنا محدود کر لیا کہ اس کے اس سخت معیار پر گنے چنے ادیب ہی اُتر سکتے

تھے۔ تو بعض ترقی پسند ادیبوں نے اس فصیل میں جگہ جگہ شگاف ڈالے جن میں کرشن چندر بھی شامل ہیں۔ "ایک گدھا نیفا میں"۔ اسی عہد کی یادگار ہے:۔

"مارکس کی داس کیپٹل کوئی وید، کوئی قرآن یا بائبل تو نہیں ہے۔ وہ ایک آدمی کی لکھی ہوئی کتاب ہے۔ خدا کی وحی تو ہے نہیں کہ اس میں کسی قسم کی تبدیلی کی گنجایش نہ ہو۔ دنیا کے سارے فلسفے انسان کے لیے ہیں۔ اس کی بہتری اور بہبودی کے لیے۔ جب یہ فلسفے پرانے اور فرسودہ ہو جاتے ہیں۔ جب ان کا گودا انسان کھا لیتا ہے۔ جب فلسفہ کے صرف چھلکے رہ جاتے ہیں تو انسان اس فلسفہ کو کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر ڈال دیتا ہے۔ جانے اب تک کتنے ہی انسانی فلسفوں کے ساتھ یہی ہوا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مارکسزم بوڑھا یا فرسودہ ہو چکا ہے۔ ابھی تو وہ پوری طرح سے جوان بھی نہیں ہوا۔ ابھی تو وہ زندگی کی کئی بہاریں دیکھے گا۔ مگر ہر بہار خزاں دیکھتی ہے۔ ہر اپتّہ پیلا بھی ہوتا ہے۔ سوکھتا بھی ہے، بڈھا بھی ہوتا ہے۔ ہوا میں کھڑکھڑاتا بھی ہے۔ شاخ سے ٹوٹ کر زمین پر بھی گرتا ہے۔ زمین میں مل کر اگلی بہار کا کام کرتا ہے۔ ممکن ہے مارکسزم کو بھی ایک دن یہی کرنا پڑے . . . . ."

سچائی کا یہ عرفان یونہی تو حاصل نہیں ہو جاتا، اس کے لیے کڑی تپسیا کرنی پڑتی ہے، جو سر کے بل کھڑے ہونے سے حاصل نہیں ہوتی، اس لیے بصارت سے زیادہ بصیرت اور محنت سے زیادہ ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی بصیرت اور ریاضت ان کے ایمان و عقیدے میں کوئی لچک نہ پیدا کر سکی۔ خواجہ احمد عباس نے کرشن کے انتقال، ان کے سیاسی اور عمرانی نظریات کو دو الفاظ میں انتہائی جامع انداز میں پیش کیا ہے کہ کرشن غیر جماعتی اشتراکی (NON - PARTY SOCIALIST) تھے۔ اسی غیر جماعتی اشتراکیت نے ان سے یہ لکھوایا تھا:۔

"کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کیپٹلزم یا سوشلزم کے نام پر یا کسی اور ازم کے نام پر کسی مذہبی یا ملکی مفاد کے نام پر ان کے سر پہ بندوق لے کر چڑھ دوڑے۔ اصل سوال جو ہے وہ یہ ہے کہ کسی طرح انسان کے ہاتھ سے بندوق چھین لی جائے اور اس کے ہاتھ میں ایک پھول دے دیا جائے۔ تم جانتے ہو جب ایک انسان ایک پھول لے کر اپنے کسی دشمن سے غصے کی بات کرے گا تو بڑا احمق معلوم ہو گا۔ ہو گا کہ نہیں؟"

—— پھول

اور کرشن نے جب بھی قلم اٹھایا، یہ پھول ان کی میز کے گلدان کی زینت بنا رہا۔ جس سے حسن، پیار، محبت اور وفاداری کی بھینی بھینی خوشبو اٹھتی رہتی۔ یہی خوشبو ان کی تحریر کا طرۂ امتیاز بنی رہی جس نے ان کے قارئین کو مسحور کر دیا۔

کرشن ایک سچے محب وطن اور قوم پرست تھے۔ ان کی پچپنویں سال گرہ کے موقع پر حکومت ہند نے انھیں پدم شری کے خطاب سے نوازا۔ تو انھوں نے عیار طبع خریدار دیکھ کر نہ تو اپنی متاعِ سخن بیچی اور نہ خود بکے۔ بلکہ ایک گدھے کی سرگزشت لکھ ڈالی۔ اس لیے کہ سچی قوم پرستی اور حب الوطنی صرف قصیدہ پڑھنے ہی کا نام نہیں، بلکہ کبھی کبھی برنارڈ شا کی طرح اپنے وطن کی نکتہ چینی اور بے لاگ تنقید سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔ آج کے عہد کا سچا قوم پرست وہی ہے جو سچا بین الاقوامی ہے۔ یہ کرشن کی سچی بین الاقوامیت ہی تھی جو ۱۹۶۵ء کی جنگ میں خون کے آنسو رلاتی رہی اور ۱۹۷۱ء میں پاکستانی جنگی قیدیوں کی

(باقی ص ۵۸ پر)

ریاض صدیقی

کرشن چندر اور رپورتاژ

اردو افسانہ اور ناول کی قلمرو میں فنی و معنوی ہمہ جہتی کے شانہ بشانہ ٹیکنک کے تجربوں میں تنوع کے اعتبار سے کرشن چندر کو اس صدی کے شہرہ آفاق فن کار کا منصب مل چکا ہے۔ وہ اردو فکشن کا ایسا مرد میدان ہے جس کے مجموعی اثرات نسل در نسل ذہنوں میں اُترتے رہے ہیں۔ تقسیم برصغیر کے بعد والی دہائیوں میں جب جنریشن گیپ کے ترقی پسند اور کلاسیکی ادبی روایات پر اثر انداز ہونے کی کوشش کی اس وقت بھی کرشن چندر کی شخصیت اور اس کے اسلوب و فن کا جادو جاگتا رہا۔ پھر جب جدیدیت کے عمل انتشار نے ادب سے حقیقت پسندی اور سماجی مقصدیت کو خارج کرنے کی مہم شروع کی اور جدید علامتی اور بے پلاٹ افسانوں کو فروغ حاصل ہوا تو کرشن چندر کا اسلوب بیان بھی جدیدیت پرستوں کی نئی نسل پر غالب رہا۔ جدیدیت کے علم بردار افسانہ نویسوں نے بھی اسلوب اور فن کے معاملے میں عموماً کرشن چندر ہی کا اتباع کیا۔ کرشن چندر کی آفاقیت کا ایک راز تاریخی عمل اور جدید علوم و سائنس پر اس کی مضبوط گرفت بھی ہے۔

کرشن چندر اردو افسانے کی محبوب ترین شخصیت ہے۔ قاری کو صرف اس کا فن اور اس کے افکار و نظریات ہی نہیں اُس کی شخصیت سے بھی دلی لگاؤ ہے۔ کرشن چندر کی شخصیت میں سچائی۔ خلوص اور انسان سے لازوال محبت کا وہ عنصر شامل ہے جو سرمایہ دارانہ معاشرے کے تعلیم یافتہ مڈل کلاس میں نہیں ملتا۔ اس نے عالمگیر انسان دوستی اور معاشرتی سطح پر امن کی تلاش کے لیے ایسی عملی خدمات انجام دی ہیں جن کی مثال کم ملتی ہے۔ اس کا فلسفہ۔ محبت اور پاکیزگی کا فلسفہ ہے وہ کہتا ہے :-

"مجھے انسانوں سے پیار ہے۔ مجھے تتلی سے پیار ہے۔ مجھے بیوی بچوں سے پیار ہے۔ مجھے ہر اُس چیز سے پیار ہے جو خوبصورت ہے۔"[1]

کرشن چندر بنیادی اعتبار سے صرف کہانی کار ہے۔ اس نے اپنی شخصیت کے ظاہری و باطنی میلانات۔ اپنے نظریات۔ اپنی فنی بصیرت اور اپنے تمام جذبات و محرکات کا اظہار کہانی کے وسیلے ہی سے کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس نے جس صنف کو چھوا وہ کہانی بن گئی۔ رپورتاژ کے فنی تقاضوں کو مجروح کیے بغیر کرشن چندر نے اس صنف کو بھی افسانہ بنا دیا۔ رپورتاژ اور افسانے کے مابین خط اشتراک اور فکری وحدت کی تلاش اس کا ناقابل تردید کارنامہ ہے ——— اردو ادب میں رپورتاژ کو فنی، معنوی اور

[1] نیا پرچم بمبئی — ص ۷۳ جون ۱۹۴۹ء

مقصدی صورت میں رواج دے کر اس نے اردو افسانہ اور ناول کے کینوس کو نئی سمتوں سے روشناس کرایا ہے۔ اس سے قبل اردو میں رپورتاژ کی کمزور سی روایت ضرور موجود تھی۔ لیکن ایک مکمل اور قابلِ حوالہ روایت کا فقدان تھا۔ اس پس منظر میں ظ۔ انصاری کا یہ دعویٰ کہ "وہ (کرشن چندر) پہلے آدمی ہیں جنھوں نے اردو کے قابلِ ذکر رپورتاژ لکھے[۳۵]" صحیح نظر آتا ہے۔ رپورتاژ کی ابتدا انگریزی اور فرانسیسی ادبیات کے زیرِ اثر اردو میں بیسویں صدی کے اوائل میں شیخ عبدالقادر کے بعض مضامین[۳۶] کو رپورتاژ کا درجہ حاصل ہے۔ خواجہ حسن نظامی کے بعض انشائیے اور غدر کے افسانے بھی رپورتاژ ہی کی خام شکلیں ہیں۔ لیکن ہر دو قلم کاروں کے یہاں وسعت و تنوع اور فنی و جمالیاتی تنظیم کے وہ مجموعی تقاضے پورے نہیں ہوتے ہیں جو رپورتاژ کے لیے ضروری ہیں۔ کرشن چندر نے یقیناً پہلی بار "پودے" "صبح ہوتی ہے" اور "لاہور سے بہرام گلہ تک" جیسے خوبصورت اور فنی و معنوی اعتبار سے مکمل رپورتاژ لکھ کر اس روایت کو تاریخ کا حصہ بنا دیا۔ بعد میں رپورتاژ کے رجحان کو جو فروغ حاصل ہوا اس کا سہرا کرشن چندر ہی کے سر ہے گا[۳۷]۔ کرشن چندر سے پہلے انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں جو رپورتاژ لکھے گئے اُس پائے کے رپورتاژ اردو میں دستیاب نہیں تھے[۳۸]۔ کرشن چندر کے رپورتاژ فنی و ٹیکنیکی اصولوں کی حد تک انگریزی اور فرانسیسی روایات ہی سے استفادے کا نتیجہ ہیں۔ لیکن موضوعات، مقاصد، افکار و نظریات اور فضا بندی و تہذیبی سرشت کے اعتبار سے کرشن چندر کے یہاں مقامیت اور واقعیت کے عناصر غالب ہیں۔

کرشن چندر کے رپورتاژ کو افسانہ نویسی سے علاحدہ کر کے پرکھنے کی کوئی کوشش نہیں ہوتی ہے۔ کرشن چندر کی چالیس سالہ ادبی زندگی کا احاطہ کرنے والوں میں صرف شمیم احمد کا نام نظر آتا ہے جنھوں نے کرشن چندر اور رپورتاژ کے عنوان کو تنقیدی زاویۂ نظر سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے کرشن کے اعلیٰ ترین رپورتاژ "پودے" کو نظر انداز کرتے ہوئے "صبح ہوتی ہے" کو نثری ادب کی بہترین تخلیق قرار دیا ہے[۳۹]۔ صبح ہوتی ہے بلا شبہ ایک ایسی تخلیق ہے جس میں افسانوی اسلوب اور انشا پردازی کا پہلو بہت نمایاں ہے تاہم یہاں داخلی تاثر آفرینی اور رومانیت کی فضا حقائق و واقعات پر حاوی نظر آتی ہے۔

"صبح ہوتی ہے" اس ترقی پسند کانفرنس کی روداد ہے، جو دسمبر ۱۹۴۹ء میں بمقام ترپکور منعقد ہوئی تھی اور کرشن چندر اس کانفرنس کے شرکا میں تھے۔ اس رپورتاژ میں مصنف نے جنوبی ہندوستان کے کسانوں اور مزدوروں کا ذکر تاثراتی انداز میں کیا ہے جس کے تانے بانے میں کہانی کا عنصر موجود ہے۔ لیکن واقعاتی صداقت مشکوک ہے[۴۰]۔ "پودے" کو "صبح ہوتی ہے"۔

---

۳۵ شاعر بمبئی کرشن چندر نمبر ص ۱۲۱۔ مطبوعہ ۱۹۶۷ء
۳۶ الطالبین نمائش۔ مدفن بزرگان۔ شیکسپیر کا وطن۔ اور ایک مغربی درویش وغیرہ مطبوعہ انتخاب مخزن لاہور ۱۹۱۰ء۔
۳۷ چھٹا دریا۔ اور خدا دیکھتا رہا۔ دلی کی بپتا۔ جب بندھن ٹوٹے۔ ۵ دسمبر کی رات۔ جیل کے دن اور جیل کی راتیں۔ سندھیر سٹ روڈ۔ موت کے بستر سے اور ایک ہنگامہ وغیرہ اردو کے قابلِ ذکر رپورتاژ ہیں۔
۳۸ رپورٹ خرام گیلو مصنف جولیس فیوچک۔ کرمنل مصنف دانٹز برگ۔ دیوامیل کی رپورتاژ مطبوعہ ۱۹۴۳ء۔ دی روڈ ٹو مکا مصنف لیوپولڈ ویس انگریزی فرانسیسی اور جرمن زبانوں کے قابلِ ذکر رپورتاژ ہیں۔
۳۹ شاعر بمبئی کرشن چندر نمبر ص ۴۳۱۔ ۴۰ شاعر۔ بمبئی۔ کرشن چندر۔ صفحہ ۴۳۲۔ ۱۹۶۷ء

پر یوں فوقیت حاصل ہے کہ اولاً کہانی اور واقعات کے بیان کا منطقی ربط بہت گہرا ہے۔ ثانیاً جگر حیدر آبادی کے حوالے سے تخلیق پانے والی کہانی سچائی پر مبنی ہے۔ افسانہ اور رپورتاژ کے مابین اسی مرحلے پر ایک باریک فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ افسانہ ایک سچی کہانی کی طرح ممکنہ حد تک سچ تسلیم کیے جانے والے خود ساختہ واقعات کو گوارا کر سکتا ہے۔ اس معاملے میں افسانہ نگار بڑی حد تک آزاد ہے۔ لیکن رپورتاژ اپنی افسانویت کے باوجود کسی ایسے واقعہ کو قبول نہیں کرتا جو سچا اور چشم دید نہ ہو۔ "صبح ہوتی ہے" بہرحال ایک ایسا رپورتاژ ہے جس میں بیانیہ خوبیاں افسانوی طرز اظہار اور اجتماعی مقصدیت کی ترجمانی کرتی ہیں۔

فنی اعتبار سے مکمل اور معنی و مقاصد کے اعتبار سے جامع رپورتاژ جس نوع کی داخلیت۔ اظہاریت اور واقعات و حقایق کے بیان میں معتدل رویے کا متقاضی ہوتا ہے "پودے" صحیح معنوں میں اس کی ایک مثال ہے۔ رپورتاژ کے لیے واقعات کا حقیقی ہونا اور واقعات کے حوالوں سے تاثرات و خیالات کا مربوط ہونا بنیادی شرط ہے "پودے" میں مصنف نے اس شرط کو پورا کیا ہے۔ غالباً اس رپورتاژ کی تخلیق ایک ایسے دور کی کوشش ہے جب فن کار اپنی جذباتیت اور حد سے تجاوز کر جانے والی رومانیت پر گرفت کے عمل سے گذر رہا تھا جس کا اعتراف خود مصنف نے اپنے محقق ڈاکٹر احمد حسن سے گفتگو کے دوران کیا تھا۔

"پودے" کل ہند ترقی پسند مصنفین کانفرنس منعقدہ حیدر آباد کا احاطہ کرتا ہے۔ کانفرنس میں شرکت کے لیے کرشن چندر سمیت تمام مندوبین کی روانگی سے لے کر واپسی تک کی ساری روئیداد متعلقہ جزئیات کے ساتھ اس رپورتاژ میں قلم بند ہوئی ہے۔ مصنف نے واقعات کو تاریخی اور زمانی تسلسل کے ساتھ دس عنوانات پر تقسیم کیا ہے۔ ہر عنوان ایک مخصوص ماحول اور مقام سے تعلق رکھتا ہے اور ان واقعات سے تحریک سے پانے والے خیالات کا آئینہ دار ہے۔ یہ عنوانات موضوع کے اعتبار سے علحدہ ہوتے ہوئے بھی باہم مربوط ہیں اور یہی ربط پوری داستان میں وحدت تاثر کو قائم رکھتا ہے۔ رپورتاژ تخیل آفرینی۔ مصوری اور داخلیت کے عمل کو قبول کرنے کی جس حد تک اہلیت رکھتا ہے کرشن چندر نے اس حد سے تجاوز کرنے کی کوشش نہیں کی ہے[9]

پودے بلا شبہ ایک ایسا رپورتاژ ہے جس میں واقعات کی تہوں سے ترقی پسند اور انقلابی نظریات تاثراتی رو کی شکل میں ابھر کر قاری کے ذہن تک رسائی پاتے ہیں۔ کرشن چندر کے فن کی جادوگری نے اس تاثراتی رو میں "ڈرامائی" انداز پیدا کر دیا ہے۔

"آؤ آؤ ساتھیو دیکھو یہ سر سلطان احمد کا اسپیشل سیلون ہے وہ تمہارا تھرڈ کلاس کا ڈبہ ہے یہ ان کا سنہری وردی میں ملبوس بیرا ہے وہ پھٹے کالروں والا سردار جعفری ہے۔ یہ اخروٹ کی میز ہے جس پر کشمیر کے کاریگروں نے حسین پچی کاری کی ہے۔ وہ سردش کا بستر ہے جس میں درجنوں پیوند لگے ہیں۔

یہ موت ہے　　　　وہ زندگی ہے
یہ ماضی ہے　　　　وہ مستقبل ہے
یہ اندھیرا ہے　　　　وہ اُجالا ہے"

کرشن چندر کی بصیرت کا ایک نمایاں پہلو تاریخی شعور ہے جو اس کے ناولوں اور افسانوں کے متون میں معنویت کے نئے گوشے پیدا کرتا ہے "صبح ہوتی ہے" میں بھی تاریخی شعور کا یہ عمل ملتا ہے اور "پودے" میں بھی اُس نے تاریخی شعور کا اظہار کیا ہے۔

---

9. کرشن چندر ص ۴۴۔ ص ۷۰، ص ۷۵، ۷۷، اور ص ۸۳۔ مطبوعہ سنگم پبلشرز لاہور جولائی ۱۹۷۳ء۔

فنی اور معنوی اعتبار سے کرشن چندر کے وہ جملے جو تاریخی شعور کا احاطہ کرتے ہیں قابلِ توجہ ہیں۔ کرشن چندر کو ایک مختصر سے طنزیہ جملے میں جہانِ معنی پیدا کرنے کا آرٹ آتا ہے اور یہ آرٹ اس کے فن کی جان ہے:-

"بھک منگوں کی آواز بار بار کانوں میں آرہی تھی۔ بابو صاحب پیسہ۔ بدھ کے وقت میں بھی یہی ہندوستان تھا۔ یہی غلیظ جوہڑ۔ یہی گارے کی جھونپڑیاں۔ یہی بھک منگے۔ اشوک کے عہد میں بھی یہی ہندوستان تھا۔ اکبر کے عہد میں بھی یہی اور آج دو سو سال کی انگریزی حکومت کے بعد بھی لوگ اسی طرح گاڑی کی طرف ہیٹھ کیے بیٹھے تھے۔[1]"

"پودے" میں فن اور تخلیقی صنعت گری کا پہلو بطورِ خاص قابلِ ذکر ہے۔ وہ ایک مکمل رپورتاژ ہی نہیں ایک مکمل طویل افسانہ بھی ہے۔ ٹیکنیک کے دُہرے تجربے سے وحدت پیدا کر لینا کرشن چندر کی فن کارانہ مہارت پر دال ہے۔ اس رپورتاژ میں پلاٹ بھی ہے اور کہانی بھی۔ آغاز و ارتقا کے مراحل بھی ہیں اور انجام بھی۔ تذبذب و استعجاب کی کیفیت بھی ہے اور وحدتِ تاثر کی رَو بھی۔ کردار نگاری کے اعلیٰ نمونے بھی ہیں اور طنز و رمزیت سے پیدا ہونے والی کیفیت بھی۔ "پودے" کے کرداروں میں کرشن چندر نے چونکہ خود کو بھی شامل کر لیا ہے۔ اس لیے یہ رپورتاژ زیادہ پہلو دار ہو گیا ہے۔ کانفرنس کے ایک میزبان جگر حیدر آبادی مرکزی کردار کی حیثیت سے کہانی کے تانے بانے میں آخر تک نظر آتے ہیں اور جگر ہی کا المیہ کہانی کو بامعنی اختتام تک پہنچاتا ہے۔ جگر سے جو کہانی شروع ہوتی ہے وہ کانفرنس کی پوری روئداد کے متوازی جاری رہتی ہے اور ایک بامعنی اختتام تک پہنچتی ہے:-

"بستر لپیٹ کر انھوں نے سوئے ہوئے ادیبوں کی طرف دیکھا۔ یکایک کرشن چندر پر ان کی نظر پڑ گئی اور جگر نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ کرشن چندر نے دیکھا کہ جگر رو رہے ہیں ــــ

"جگر" ــــ کرشن چندر نے کہا ــــ

جگر نے منہ موڑتے ہوئے کہا ــــ "چھوٹی بہن مر گئی"

کسی نے کرشن چندر کا دل پکڑ لیا ــــ وہ کچھ نہ کہہ سکا ــــ

وہ (جگر) چپ چاپ اسٹیشن پر اُتر گیا۔ یکایک ایک سنہری وردی میں ملبوس اردلی وہاں سے گزرا اُس کے ہاتھ میں دودھ کا گلاس تھا۔ جگر نے جلدی میں اس سے ٹھوکر کھائی اور تھوڑا سا دودھ چھلک کر باہر گر گیا۔ "دیکھ کر نہیں چلتے" اردلی نے چنگھاڑ کر کہا۔ گاڑی نے سیٹی دی۔ جگر نے آنسو پونچھ کر کہا: "خدا حافظ" کرشن چندر اسے خدا حافظ بھی نہ کہہ سکا ــــ گاڑی چلنے لگی ــــ"

یہ وہی جگر ہیں جن سے کرشن چندر کو خدا واسطے کا بیر تھا اور جن کے لیے اس نے سبطِ حسن کے کان میں کہا تھا:

"جگر جہاں بھی دیکھو جلا بھنا ہی رہتا ہے۔ کم بخت ــــ"

جگر کے ساتھ جو کہانی انجام کو پہنچی کرشن چندر کی زبان ہی میں اس کا مطالعہ زیادہ دلچسپ ہوگا:

"اس کی ایک ہی بہن تھی۔ اتنی محبت کے باوجود اس کا علاج اب تک حیدر آباد میں نہ کرا سکا کیونکہ اب تک وہ دو سو روپیہ اکٹھا نہ کر سکا تھا اور جب اس نے دو سو روپے اکٹھا کر لیے تو یہ کانفرنس آگئی اور اس نے یہ روپے

---

[1] پودے ص ۸۰

کانفرنس کے لیے دے دیے ـــــ تاکہ کلچر زندہ رہے اس کی بہن مرجائے لیکن تہذیب زندہ رہے تمدن زندہ رہے ۔ فن کار کا خیال زندہ رہے ۔ اس کی بہن اچھی خوراک اور مناسب دوا نہ ملنے سے سسک سسک کر جان دے دے ۔ لیکن کتاب زندہ رہے، زبان زندہ رہے ۔ قوم کی روح زندہ رہے ۔ اس کی پیاری پیاری اُبلی کھانے والی اردو تُوڑ کر کھانے والی اس کے بچپن کی ساتھی مرجائے ۔ لیکن کالیداس زندہ رہے، غالب زندہ رہے اقبال زندہ رہے ۔ پریم چند زندہ رہے ـــــ"

اس رپورتاژ کی افسانوی حیثیت کو کرشن چندر نے کردار نگاری کے ایک ایسے رخ سے روشناس کرایا ہے جو اردو افسانے میں یقیناً نیا ہے ۔ اس رخ کا سب سے موثر پہلو گہری وابستگیوں کے باوجود کرداروں کے ظاہر و باطن کی غیر جانب دارانہ عکاسی ہے کرشن چندر نے اس معاملے میں خود کو بھی بچانے کی کوئی کوشش نہیں کی ہے ـــــ

"کرشن چندر جب اداس ہوتا ہے تو سگرٹ پیتا ہے ۔ لیکن خود خرید کر کبھی نہیں پیتا ۔ ہمیشہ دوسروں سے مانگ کر پیتا ہے ـــــ کرشن چندر کو یاد آیا کہ سنگترے تقسیم کرتے وقت اس نے اپنے ہمسائے کو سنگترہ پیش نہیں کیا کیونکہ ـــــ وہ بدصورت ۔ کریہہ منظر اور مزدور تھا ـــــ"

مجموعی اعتبار سے "پودے" نہ صرف اردو کا بہترین اور کامیاب رپورتاژ ہے اور ایک طویل افسانہ بھی ـــــ رپورتاژ کو افسانہ اور افسانے کو رپورتاژ بنانے میں جو سفر کرشن چندر نے طے کیا ہے قابلِ تحسین ہے ۔ اسی طرح اُس نے افسانے اور رپورتاژ کے مابین دوئی کے سارے امکانات کو باطل کر کے تکنیکی اعتبار سے افسانے کی تعریف کو مکمل کر دیا ہے [۱۱۱]۔

ممتاز شیریں اور رام لعل نے اپنے مضامین میں اشارتاً اس حقیقت کی نشان دہی کی ہے ۔ ان دونوں کا ذکر کرتے ہوئے رام لعل نے محسوس کیا کہ یہاں رپورتاژ کی صورت موجود ہے [۱۱۲] کرشن چندر کے رپورتاژ کا احاطہ کرتے ہوئے رام لعل لکھتے ہیں :-

"کرشن چندر کے رپورتاژ بھی افسانہ نگاری میں شامل ہو سکیں تو شاید اردو افسانہ نگاروں میں کرشن چندر ہی پہلا افسانہ نگار ہو گا جس نے اردو ادب میں رپورتاژ کی صنف کو اتنی کامیابی سے پیش کیا ہے ۔ کرشن چندر کے رپورتاژ افسانوی خوبیوں کے بھی حامل ہیں [۱۱۳]"

ممتاز شیریں نے بھی افسانہ اور رپورتاژ کی بحث میں خاکوں اور رپورتاژوں کو افسانہ ہی قرار دیا ہے [۱۱۴]

---

[۱۱۱] اگر (ESENWIEN) کی تعریف کو جواب تک معتبر تسلیم کی جاتی ہے، اصول تسلیم کر لیا جائے تو بقول ـــــ (ESENWIEN) افسانہ ایک ایسی مختصر فکری داستان ہے جس میں کسی ایک خاص واقعہ کسی ایک خاص کردار پر روشنی ڈالی گئی ہو اس میں پلاٹ ہو اور اسی پلاٹ کے واقعات کی تفصیلیں اس طرح لکھی ہوئی ہوں اور اس کا بیان اس قدر منظم ہو کہ ایک متحد اثر پیدا کر سکے ۔ ہماری داستانیں ۔ سید وقار عظیم، صفحہ ۱۳

[۱۱۲] اوراق ص ۲۵۸ جنوری ۱۹۷۰ء [۱۱۳] ایضاً ص ۲۵۹

[۱۱۴] بہترین ادب ۔ مطبوعہ مکتبہ جدید ۔ لاہور ۱۹۴۶ء

ڈاکٹر احمد حسن

کرشن چندر کا آرٹ اور تکنیک

کرشن چندر کے افسانوں کا آرٹ اور تکنیک منفرد ہے اور اپنی آپ مثال رکھتا ہے۔ وہ نہ مقلد ہے اور نہ مترجم، جیسا کہ اردو کے بہت سے افسانہ نگاروں کا شیوہ ہے کہ مغربی افسانوں کے کرداروں کے، ہندوستانی نام تجویز کیے اور مناظر میں مقامی رنگ بھرا اور خفیف سی تبدیلی کے بعد افسانہ لکھ دیا۔ اس طرح کے سستے آرٹ کا کرشن چندر قائل نہیں ہے۔ اُس کے افسانے طبع زاد (ORIGINAL) ہوتے ہیں۔ اُن میں تنوع ہوتا ہے۔ یکسانیت، کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔ وہ ہر افسانے میں زندگی کے نت نئے پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے۔ عام نگاہوں میں جن چھوٹے چھوٹے واقعوں کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ وہ اپنی ساحرانہ فن کاری کی بنا پر اُنھیں اہم اور قیمتی بنا دیتا ہے۔ افسانے کے فن اور آرٹ پر خود کرشن چندر نے بہت کم لکھا اور کہا ہے۔ مجھ سے بھی اس مسئلہ پر بہت زیادہ گفتگو نہیں ہوئی۔ دو چار جملے جو انھوں نے کہے تھے اُن کا ذکر میں مناسب موقعوں پر کروں گا۔

افسانے اور ناول کی نوعیت کے بارے میں، میں نے جو سوال کیا تھا، اُس کا جواب کرشن چندر نے مختصر لفظوں میں یوں دیا تھا،

"افسانے میں بالعموم ایک نقطے کو اُبھارا جاتا ہے، یا اُس میں زندگی کا ایک پہلو یا چند پہلو ہی پیش کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن ایک ناول نگار کو زیادہ ہمہ گیر ہونا چاہیے۔ وہ نہ صرف اپنے کرداروں کی داخلی کیفیات سے واقف ہوتا ہے بلکہ وہ گرد و پیش کی خارجی دنیا سے اور اُس کے عوامل سے بھی باخبر رہتا ہے۔ سائنس کی تیز ترقی نے پرانے نظریات کو اتنی سُرعت کے ساتھ فرسودہ اور ناکارہ کر دیا ہے کہ ایک ناول نگار کو نہ صرف اپنے گرد و پیش کی خارجی دنیا اور اُس کے داخلی اثرات کا احاطہ کرنا پڑتا ہے، بلکہ عمل اور ردِ عمل کے پورے سلسلے کو اپنے ذہن میں سمو لینے کے لیے دوسرے علوم کا بھی مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔"

اتنا معلوم ہو جانے کے بعد یہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کرشن چندر افسانہ کیسے لکھتے ہیں۔ پٹنہ کے طلبہ میں سے کسی ایک نے اُن سے اس سوال کو پوچھا تھا کہ "آپ افسانہ کیسے لکھتے ہیں؟" کرشن چندر نے اپنے فن کارانہ انداز سے مسکراتے ہوئے جواب دیا کہ: "کرسی پر بیٹھ جاتا ہوں، میز میرے سامنے رہتی ہے، قلم میرے ہاتھ میں ہوتا ہے، کاغذ پر لکھتا چلا جاتا ہوں، افسانہ ہو جاتا ہے۔" ایسا ہی ایک سوال ایک من چلے طالب علم نے اِلٰہ آباد یونیورسٹی میں اُن سے پوچھا تھا کہ "آپ کا شاہکار افسانہ کونسا ہے؟" سوال سننے کے بعد بے ساختہ جواب دیا کہ: "ابھی اُس کی تخلیق نہیں ہوئی ہے۔"

میں نے اُن کی شخصیت اور فن کارانہ حیثیت کا ذرا نزدیک سے مطالعہ کیا ہے اور کسی قدر مجھے قُرب حاصل ہو گیا ہے میرا اپنا اندازہ ہے کہ وہ ایسے سوالوں کا صاف جواب دینے سے ذرا بچتے ہیں۔ اس سے بھی اُن کی فن کارانہ حیثیت ظاہر ہوتی ہے۔

میرے ایک سوال کے جواب میں انھوں نے بتایا کہ وہ افسانہ ایک دن یا ایک ہی نشست میں مکمل کر لیتے ہیں، اگر افسانے میں الجھاؤ پیدا ہو جاتا ہے تو اُسے دو نشست میں مکمل کر دیتے ہیں۔ یہ بھی لازمی نہیں ہے کہ وہ ہر روز افسانہ لکھنے بیٹھیں۔ جب اُن پر کیفیت طاری ہوتی ہے، وہ افسانہ یا ناول لکھتے ہیں۔ افسانے کی تخلیق اردو ہی میں ہوتی ہے۔ اُردو میں افسانہ ختم ہونے کے بعد مختلف زبانوں کے منشیوں کو وہ دے دیتے ہیں کہ اُن کا رسم الخط وہ تبدیل کر دیں۔ بیک وقت اُردو کا یہ افسانہ ہندی، مراٹھی، گجراتی اور پنجابی زبان میں شایع ہو جاتا ہے۔

اتنا لکھنے کے بعد یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ عناصر و لوازم افسانہ کی روشنی میں اُن کے افسانوں کا جائزہ لیا جائے اور تبصرہ کیا جائے۔

موضوع

کسی افسانے کو لکھنے سے پیشتر اُس کے موضوع کا انتخاب بہت ضروری ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں کرشن چندر بہت خوش قسمت واقع ہوئے ہیں، جہاں تک موضوع کا تعلق ہے کرشن چندر اُسے گرد و پیش کی دنیا سے لیتے ہیں۔ اُن کے صرف چند افسانے ایسے ہوں گے جن کے متعلق اُن کا مشاہدہ ذاتی نہیں ہے، بلکہ کتابی ہے۔ جیسے "بارود اور چیری کے پھول"، "امریکی سپاہی کے نام ایک خط"، "الجنیرز"، "سب سے بڑا گناہ" وغیرہ۔

اور اسی قبیل کے دوسرے افسانے جو انھوں نے لکھے ہیں وہ بین الاقوامی حالات سے متاثر ہو کر لکھے ہیں۔ ان افسانوں میں انھوں نے کوریا کی جنگ اور اسپین کی آزادی کو اپنا موضوع فکر بنایا ہے۔ موضوعی اعتبار سے کرشن چندر کے یہ افسانے کامیاب ہیں۔ لیکن ایسے افسانوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔

کرشن چندر نے اپنے موضوع کو بہت حد تک ہندوستانی زندگی اور اُس کے مسائل سے باندھ رکھا ہے۔ موضوع کے لیے کرشن چندر کو بھٹکنا نہیں پڑتا، وہ اپنے اردگرد کے ماحول سے، اور چھوٹے چھوٹے واقعات کو ذہن میں رکھ کر اپنے افسانے کا تار و پود تیار کر لیتے ہیں، اور کسی بھی موضوع کو لے کر افسانے کو خوبصورتی کے ساتھ جنم دے سکتے ہیں۔ اُن کے لیے یہ کام بے حد آسان ہے۔ جب ہمارے دوسرے ادیب قلم کو دانتوں تلے داب کر موضوع کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں۔ اگر کرشن چندر راستہ چلتے رہیں گے تو بھی اُن کے ذہن میں ایک افسانے کا موضوع جنم لیتا رہے گا، چاہے حسن و عشق کا موضوع ہو، چاہے سیاسی، چاہے آزادی کا، چاہے سماجی زندگی کا، چاہے جنگ و امن کا۔ کرشن چندر ہر موضوع کو اپنے تجربے اور مشاہدے کی بنا پر بڑی خوبی کے ساتھ افسانوں میں بٹھا دیتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ کرشن چندر موضوعات کا جیتا جاگتا خزانہ ہے۔ ہر طرح کے موضوعات منتخب کرنے میں اُسے ید طولیٰ حاصل ہے۔ یہ موضوعات ایسے ہوتے ہیں جو انسانی زندگی سے مستعار ہوتے ہیں۔ آسمان کے ستارے وہ توڑ کر نہیں لاتا۔ ایسے موضوعات وہ منتخب نہیں کرتا، جہاں انسان کا ذہن ہی نہ پہنچ سکے۔ سیدھے سادے سامنے کے موضوعات کو وہ ایسی رفعت اور بلندی عطا کرتا ہے کہ وہ آسمان کے تارے معلوم ہونے لگتے ہیں۔

کرشن چندر نے تکنیک کے اعتبار سے بے شمار تجربے کیے ہیں۔ اُن کے جمالیاتی تجربے بے حد کامیاب ہیں اور اُردو کے افسانوی

ادب میں چار چاند لگاتے ہیں ۔ کرشن چندر زندگی کی قدروں کو واضح صورت میں دیکھتے ہیں اور دیکھنے کے متمنی ہیں۔ اُردو افسانوں میں ہیئت کے اعتبار سے اب تک جتنے تجربے کیے گئے ہیں، اُن میں کرشن چندر کا مقام بہت بلند ہے۔

پلاٹ

کرشن چندر پلاٹ کے معاملہ میں بہت ترقی پسند واقع ہوئے ہیں۔ موصوف نے ایسے بھی افسانے لکھے ہیں جن میں پلاٹ کے کوئی آثار نہیں پائے جاتے بلکہ وہ بغیر پلاٹ کے افسانے ہیں اور بے حد کامیاب ہیں۔ مثلاً "دو فرلانگ لمبی سڑک"۔ کرشن چندر کے افسانوں میں اشاریت کی بہتات ہے اور یہی اشاریت کرشن چندر کے فن کی جان ہے۔ کرشن چندر نے افسانہ اور اسکیچ کے امتزاج سے اُردو افسانہ نگاری میں الگ ایک راہ نکالی ہے۔

میں نے دَورانِ گفتگو میں کرشن چندر سے پوچھا کہ ارسطو نے پلاٹ کے جو اُصول تحریر کیے ہیں، اُن کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ ارسطو نے پلاٹ سے متعلق درج ذیل اُصول تحریر کیے ہیں:-

ARISTOTLE'S FAMOUS STATEMENT IN
CH. VII (P. 40) THAT "A TRAGEDY MUST HAVE
A BEGINING A MIDDLE, AND AN END."
ARISTOTLE'S POETIES P. 44 BY, "HUMPHRY HOUSE."

اس کے جواب میں اُنھوں نے کہا کہ میرے افسانوں میں "بظاہر نہ اس کی کوئی ابتدا ہوتی ہے، نہ انتہا، خیال کی ایک رَو ہے جو شروع سے آخیر تک کسی وسطی مقام پر رُکنے کے بجائے اُمڈتی ہوئی آخر تک چلی آتی ہے۔ کبھی پلاٹ کا جو نقطۂ آخر ہوتا ہے وہ خود ایک نئے پلاٹ کی تمہید ہوتا ہے۔" اُن کے افسانوں میں پلاٹ کبھی انتہا سے ابتدا کو چلتا ہے۔ اس سلسلے میں ان کے افسانے "موہن جوداڑو کا خزانہ" کا نام لیا جا سکتا ہے۔ کبھی اُسے وسط سے پکڑ کر ہم لوگ انتہا کو چلتے ہیں۔ اس قسم کے افسانوں میں "ٹیڑھی میڑھی بیل" کا نام لیا جا سکتا ہے "گل فروش" میں کرشن چندر نے ارسطو کے بتائے ہوئے اُصول کی تخلیق [شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر] کی ہے۔ آج زندگی کی رفتار جس تیزی سے بدل رہی ہے اور جس تیزی سے ادب میں ہیئت اور موضوع کے اعتبار سے تخیل کی نئی اشکال دریافت ہو رہی ہیں، اُس کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کرشن چندر جو افسانے لکھ رہے ہیں وہ قابلِ قدر ہیں۔ اگر وہ پلاٹ کی قید میں رہ کر افسانے تخلیق کرتے تو انھیں اتنی کامیابی حاصل نہیں ہوتی اور اتنی شہرت بھی نہ ملتی جو اُنھیں آج نصیب ہے۔

کردار نگاری

کرشن چندر کے افسانوں میں اُن کے کرداروں کو بھی دخل ہے۔ موصوف کو کردار نگاری کا سلیقہ آتا ہے۔ وہ اپنے افسانوں کے کردار جنھیں وہ عملی زندگی میں پیش کرتے ہیں، اسی دنیا کے جیتے جاگتے کردار ہیں۔ اُن کے کردار جس خاندان یا طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اُن سے کرشن چندر کما حقہٗ واقفیت رکھتے ہیں۔ وہ کرداروں کی روح میں جھانک کر اُن کے کردار کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ اس کی وجہ سے ان کے کرداروں کی خوبیاں اور بُرائیاں دونوں روزِ روشن کی طرح ہمارے سامنے آ جاتی ہیں۔ موصوف صرف اعلیٰ سوسائٹی ہی کے کردار نہیں چُنتے بلکہ اُن کے کردار ہر طبقے اور ہر قوم کے ہوتے ہیں۔ اعلیٰ سوسائٹی سے لے کر فقیر اور بھنگی تک اُنھیں کرداروں کی مدد سے وہ اپنے افسانوں کا ڈھانچہ تیار کرتے ہیں اور افسانوں کی تخلیق کرتے ہیں۔ کرشن چندر کے چند کردار اُردو ادب کی افسانوی دنیا میں لازوال ہیں۔ ان میں "کالو بھنگی" کا کردار حیاتِ جاودانی کی حیثیت رکھتا ہے (اس افسانے کا ترجمہ بہت سی غیر ملکی زبانوں میں بھی ہو چکا ہے)

موصوف نے کالو بھنگی کا کردار جس خوبصورتی سے اسکیچ کی صورت میں پیش کیا ہے وہ بے مثل ہے۔ اور کرشن چندر کے شعور کی پختگی کا پتہ دیتا ہے، اُن کے کرداروں کے چند نمونے ملاحظہ کیجیے جس سے کرداروں کی شکل و صورت، افعال و اعمال، اقوال و تاثرات، اور اُن کے میلانات و رجحانات کا پتہ بخوبی چل سکتا ہے۔

"ہوٹل میں ایک اور بہشتی بھی تھا۔ یوسف۔ شکل سے کنجڑا دکھائی دیتا تھا۔ بڑا بد دماغ بہشتی تھا۔ ہر روز پٹتا پھر بھی گالی کے بغیر کام نہیں کرتا۔ اس کے علاوہ وہ چرس کا دَم بھی لگاتا تھا۔ اور عورتوں کی دلالی بھی کرتا تھا۔ یوسف چھوٹے بیرے کا بڑا دوست تھا۔ چھوٹا بیرا ایک متین قسم کا انسان تھا۔ بے حد خدمت گزار۔ "جی" کے سوائے اُس کے منہ سے کبھی کوئی کلمہ نہیں سُنا۔ لب و لہجہ میں روغنِ قاز اس قدر گھُلا ہوا تھا کہ آدمی کے بجائے بناسپتی گھی کا ڈبہ معلوم ہوتا تھا"۔۔۔۔ ("بالکونی" زندگی کے موڑ پر۔ صفحہ ۱۳۲)

"کالو بھنگی کے ماں باپ بھنگی تھے اور جہاں تک میرا خیال ہے اُس کے سارے آباؤ اجداد بھنگی تھے اور سیکڑوں برس سے یہیں رہتے چلے آئے تھے۔ اسی طرح، اسی حالت میں۔۔۔ پھر کالو بھنگی نے شادی نہ کی تھی، اُس نے کبھی عشق نہیں کیا تھا، اُس نے کبھی دور دراز کا سفر نہیں کیا تھا۔ حد تو یہ ہے کہ وہ کبھی اپنے گاؤں سے باہر بھی نہیں گیا تھا، وہ دن بھر اپنا کام کرتا اور رات کو سو جاتا اور صبح اٹھ کر پھر اپنے کام میں مصروف ہو جاتا۔ بچپن ہی سے وہ اسی طرح کرتا چلا آیا تھا"۔ ("کالو بھنگی"۔ ایک گرجا ایک خندق۔ صفحہ ۱۸۸ و ۱۸۹)

"مجھے کالو بھنگی کے ہاتھ کے سینکے ہوئے بھٹے کھانے میں بڑا مزا آتا تھا اور میں انھیں بڑے مزے میں چھُپ چھُپ کے کھاتا تھا۔ ایک دفعہ پکڑا گیا تو بڑی ٹھکائی ہوئی، بُری طرح۔ بیچارا کالو بھنگی بھی پٹا۔ مگر دوسرے دن وہ پھر بنگلے پر جھاڑو لیے اُسی طرح حاضر تھا"۔ (صفحہ ۱۹۰)

"لالہ بھولا رام کے سر پر ان کی خاکستری پگڑی اتنی چھوٹی، گھٹی اور پچکی ہوئی تھی جیسے کسی نے چھ جوتے مار کر سر سے چپکا دی ہو۔ اُن کے چلنے کا انداز بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ یعنی اس طرح شانے سکوڑ کے، گردن دبا کے ایڑیاں اٹھا کے ڈرتے ہوئے چوہے کی طرح اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے جلدی جلدی چلتے تھے۔ جیسے ابھی ابھی کہیں سے پٹ کر آرہے ہوں اور اگر کسی نے انھیں ڈرانے کے لیے یونہی "ہاؤ" کہہ دیا تو فوراً سڑک سے مڑ کر کسی بل میں گھُس جائیں گے۔ لالہ بھولا رام کا چہرہ لمبوترا، آنکھیں چھوٹی اور کان بڑے بڑے تھے۔ شکل و صورت سے وہ آدمی کم اور خرگوش زیادہ معلوم ہوتے تھے۔ چہرے پر خرگوشوں کی سی سہمی سہمی کیفیت موجود تھی جسے کچھ لوگ از راہِ ہمدردی معصومیت سے تعبیر کر دیتے تھے"۔

"لالہ بھولا رام جب تک جیے دوسرے کی تحویل میں جیے۔ اُن کی ماں بہت بچپن میں مر چکی تھی۔ اس لیے انھیں معلوم نہ تھا کہ ماں کی گود کیا ہوتی ہے۔ اُس کی نگاہوں کی مٹھاس کیا ہوتی ہے، اُس کی بانہوں کی ممتا کیا ہوتی ہے۔ وہ تو اپنے باپ کی مضبوط اکھڑ شفقت میں پلے تھے اور زندگی بھر اُن کی "ڈانٹ" کھاتے رہے۔ جب باپ دمے سے مر گئے تو چھوٹے بھائی نے انھیں اپنی تحویل میں لیا اور اُس وقت تک انھیں ڈانٹ پلاتا رہا جب تک وہ خود فوج میں ملازم ہو کر سنگاپور نہیں چلا گیا۔ چھوٹے بھائی کے جانے کے بعد وہ اپنی بڑی بہن کی تحویل میں آئے اور اسی طرح "ڈانٹ" کھاتے رہے اور اسی طرح اپنی ساری تنخواہ دفتر سے لاکر اُس کے ہاتھوں میں دیتے رہے اور چائے کی ایک پیالی کے لیے ترستے رہے"۔۔۔۔ ("ڈُو۔ ڈُو"۔ کتاب کا کفن۔ صفحہ ۴۸۔۴۹)

"۔۔۔۔ لڑکا خالص ہندوستانی تھا سانولے رنگ کا، مرا تھا، چھوٹا قد لیکن مضبوط اور گٹھا ہوا۔ گھنے چمکیلے بال اور چوڑے چوڑے جبڑوں پر گھٹے ہوئے شیو کی نیلاہٹ تھی۔ اُس کے سر کی حجامت بھی بالکل تازہ تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ آج ہی بال کٹوا کر آیا ہے۔ اُس کے

کپڑے بے حد صاف ستھرے تھے اور اُس کے روئیں روئیں سے زندگی کی صحت مند آرزوئیں پھوٹ رہی تھیں "۔۔۔۔

("پہریلو"۔۔ دل کسی کا دوست نہیں ۔ صفحہ ۱۰)

"۔۔۔۔ شری اُپادھیائے جی وزیر تو بن گئے، لیکن وہ اس وزارت بازی سے خوش نہ تھے۔ ایک تو اُنھیں انگریزی بھی اپنے دیس کی اصلی راشٹر بھاشا آتی نہ تھی۔ پھر ہندی اور اُردو بھی وہ واجبی سی جانتے تھے۔ اس لیے وزارت کا سارا کام اُنھوں نے محکمے کے پرسنل سکریٹری کو سونپ رکھا تھا اور خود دوسرے وزیروں کے علاج میں لگے رہتے تھے اور سچ بات تو یہ ہے کہ یہ کام بجائے خود اتنا بڑا تھا کہ اُنھیں اپنی وزارت کی طرف توجہ دینے کی فرصت ہی کہاں تھی!"۔۔۔۔ ("بتی اور وزیر"۔۔ دل کسی کا دوست نہیں ۔ (صفحہ ۷۵ ۔ ۷۶)

"۔۔۔۔ لالہ جگن ناتھ کا قد ٹھگنا اور جسم موٹا ہے۔ اُن کے چہرے کا رنگ اُن کے کارخانے کے تیار کردہ ٹرنکوں کی طرح سیاہ ہے۔ لالہ جی کی کھال بھی آہنی چادروں کی طرح مضبوط اور لچکیلی معلوم ہوتی ہے۔ سُنا ہے جوانی میں بہت کسرت کرتے تھے۔ لیکن اب باتیں بہت کرتے ہیں۔ گو، سر اب بھی گھٹا ہوا ہے اور چُٹیا کے بال چھدرے ہوتے جا رہے ہیں اور مونچھیں بھی سپید ملگجی سی۔۔۔۔۔ چہرے پر ایسی معلوم ہوتی ہیں گویا کسی نے سیاہ ٹرنک میں سفید تالا لگا دیا ہو"۔۔۔۔ ("جگن ناتھ"۔۔ نغمے کی موت ۔ صفحہ ۱۵۱)

"۔۔۔۔ جمنا نے جھلا کر کہا: "ہاں، ہاں میں بیوہ ہوں ۔۔ اسی لیے تو تم مجھے اپنی خود غرضیوں کا آلۂ کار بنانا چاہتی ہو۔ اگر آج میرا خاوند جیتا ہوتا تو تمھاری طرح باتیں کرنے والیوں کی زبان کھینچ لیتا اور تمھاری چوٹی پکڑ کر اس طرح گھسیٹتا کہ تمھارے یہ موم سے چکنے ہوئے سر ایک گھڑی میں گنجے ہو جاتے۔ کلموہیاں اپنی عصمت کو بیچ کر اب مجھ سے سودا کرنے آئی ہیں "۔۔۔۔

("پنڈارے"۔۔ نغمے کی موت ۔ صفحہ ۴۲)

منظر نگاری

کرشن چندر کے افسانوں میں منظر نگاری کی بڑی اہمیت ہے۔ موصوف نے بچپن، لڑکپن اور جوانی کا ایک حصہ کشمیر کی سرزمین میں گزارا ہے۔ (وہ کشمیر جہاں فطرت ہمیشہ مہربان رہتی ہے) یہ تو نا ممکن ہے کہ انسان کشمیر میں رہے اور وہاں کی فطری خوبصورتی سے متاثر نہ ہو۔ فطرت نے کشمیر کو بے پناہ حُسن سے مالا مال کیا ہے۔ کرشن چندر بھی وہاں کی جھیلوں، آبشاروں، کوہساروں، خوبصورت عورتوں، زعفران کے کھیتوں، شفق کی سُرخی وغیرہ سے حد درجہ متاثر ہوئے اور اُنھوں نے اپنے بیشتر افسانوں میں وہاں کے مناظر کو جگہ دی ہے۔ کشمیر سے متعلق اُن کی منظر نگاری اُردو ادب کی جان ہے۔

کرشن چندر کو منظر کشی میں ید طولیٰ حاصل ہے۔ ان کا مشاہدہ بہت تیز ہے اور اُن کی باریک بینی کی وجہ سے مکمل نقشہ آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ منظر نگاری میں آج اُن کا کوئی ہمسر نہیں ہے۔ خوبصورت آسمان، پرندے، شفق، چاندنی، ستارے، خوبصورت پھول، ہوا کی جاں بخش تازگی، دریا کا کنارہ، اُس کی روانی، آبشار، وادی، جھیل وغیرہ کے علاوہ کرشن چندر کے افسانوں میں ویران اور سنسان جگہ، بھیڑ بھاڑ، فٹ پاتھ، دیہات اور شہر، کارخانے وغیرہ کے مناظر بھی ملتے ہیں۔ اُن کی منظر کشی سے آنکھوں کو ایک قسم کی فرحت محسوس ہوتی ہے اور روح میں بالیدگی پیدا ہوتی ہے اور بے اختیار منہ سے کلمۂ تحسین نکل جاتا ہے۔ کون ایسا کافر ہے جو کرشن چندر کی منظر نگاری کا قائل نہ ہو۔ اپنے بیگانے سب ہی منظر کشی میں کرشن چندر کو اُستاد مانتے ہیں۔ منظر کشی کی وجہ سے کرشن چندر کے افسانے نو عروس کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ چند خوبصورت نمونے ملاحظہ کیجیے:-

"۔۔۔۔۔ مہر وش اُس برآمدے سے باہر سیاہ آسمان پر انگاروں کی طرح دمکتے ہوئے ستاروں کو دیکھ سکتا تھا اور وہاں

ایک پیلا سا مٹیالی رنگت کا چاند بھی دکھائی دے رہا تھا۔ یہ چاند ایک پکے ہوئے ولایتی کیک کی مانند تھا جو ابھی ابھی انگیٹھی سے باہر نکالا گیا ہو۔"

("طلسم خیال" ـــ صرف ایک آنہ ـــ صفحہ ۱۰۰)

"..... میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ دور کہیں کہیں تارے جھلملا رہے تھے اور چنار کی پھیلی ہوئی ٹہنیوں کے درمیان بھیا ما میرو بھی کسی دوشیزہ کے ٹوٹے ہوئے کنگن کی طرح اٹک کر رہ گیا تھا۔ ہوا کے ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکے آ رہے تھے اور ان کے دوش پر نکالے چلاتے ہوئے مانجیوں کی پرکیف صدائیں لرز رہی تھیں۔"

("بندوالی" ـــ نظارے ـــ صفحہ: ۱۶۳)

"..... شام آ گئی، جھیل ڈل کو جانے والے ہاؤس بوٹ پل کی سنگلاخی محرابوں کے بیچ میں سے گزر گئے اور اب وہ افق کی لکیر پر کاغذ کی ناؤ کی طرح کمزور اور بے بس نظر آ رہے تھے۔ شام کا قرمزی رنگ آسمان کے اس کنارے سے اُس کنارے تک پھیلتا گیا اور قرمزی سے مرمئی اور مرمئی سے سیاہ ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ بادام کے پیڑوں کی قطار کی اوٹ میں پگڈنڈی بھی سو گئی اور پھر رات کے سناٹے میں پہلا تارہ کسی مسافر کے گیت کی طرح چمک اٹھا۔ ہوا کی خنکی تیز تر ہوتی گئی اور نتھنے اس کے ہر فیلے لمس سے سُن ہو گئے اور پھر چاند نکل آیا۔"

("پورے چاند کی رات" ـــ اجنتا سے آگے ـــ صفحہ ۸)

"..... رنگ برنگ کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ جن کی مہک سے ساری ہوا معطر تھی۔ سنبلو اور رس بھری کی جھاڑیاں پھلوں سے لدی پھندی تھیں۔ چلتے چلتے ہم کسی پھل دار جھاڑی کے پاس ٹھہر جاتے اور جھکی ہوئی شاخوں سے پکے ہوئے سنبلو اور سرخ سرخ رس بھریاں توڑ توڑ کر کھاتے، کہیں شمشاد کے نازک بوٹے کھڑے تھے تو کہیں اخروٹ کے قد آور درخت لانبے لانبے ڈال پھیلائے ہوئے سایہ کر رہے تھے اور ان پر جنگلی پرندے بیٹھے تھے۔ جنگلی طوطے، ککڑ، رت گلے اور نہوے جن کے پر تیتریوں کی طرح رنگین تھے اور جن کی بولیاں بلبل کے نغموں کی طرح دل فریب تھیں۔ کبھی کوئی پرندہ پر پھیلائے کوکو کرتا۔ قوسِ قزح کی طرح چمکتا ہوا سامنے سے گزر جاتا اور آنکھوں کو روشن کر جاتا۔"

("لاہور سے بہرام گلہ تک" ـــ طلسم خیال ـــ صفحہ ۱۲۶)

"..... میں اپنی اسکیچ بک اور پنسل ہاتھ میں لیے کسی مزے دار کارٹون کی تلاش میں شہر کے بازاروں اور کوچوں سے چلتا، گھومتا، مڑتا، لوگوں سے بچتا، ٹکراتا، ایک ایسے علاقے میں پہنچ گیا، جہاں اِس سے پہلے میں کبھی نہ گیا تھا یہاں گلیاں اس قدر تنگ و تاریک تھیں، موریوں میں غلاظت کے اتنے انبار جمع تھے، کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں سے ایسی سڑاند آ رہی تھی کہ میں سوچنے لگا، شاید اس علاقے کے مکینوں کی ناکیں نہ ہوتی ہوں گی۔ کیونکہ یہ تو ناممکن ہے کہ آدمی اپنے چہرے پر ایک ناک رکھے اور پھر ایسی جگہ وہ رہ سکے۔ دو تین جگہوں پر تاریکی میں ٹھوکر کھانے کے بعد مجھے خیال آیا کہ ان اندھیری گلیوں میں ناک تو کیا آنکھ کی بھی ضرورت نہیں ہے۔"

("گل دان" ـــ دل کسی کا دوست نہیں ـــ صفحہ ۴۶ ـ ۴۷)

"..... ہمارے سامنے ساحل تھا۔ ساحل کے سامنے سمندر تھا۔ سمندر کی لہروں پر جھاگ تھا۔ بیر کے گلاسوں پر بھی جھاگ تھا۔ آسمان پر ہلکے پھلکے اڑتے ہوئے بادل مسرت کا کف معلوم ہوتے تھے۔ ساحل کی ریت پر کھڑا ایک گوانی اسپینی گیٹار بجا رہا تھا۔ اُس کے قریب ایک نوجوان مرد اور عورت بانہوں میں بانہیں ڈالے ایک دوسرے کی آنکھوں میں اُن سپنوں کو دیکھ رہے تھے جو صرف جوانی میں کھلتے ہیں۔ مضبوط اور سانولا لڑکا بے حد وجیہ اور پُروقار معلوم ہوتا تھا۔ گورے رنگ کی ماڈرن لڑکی اپنے سنہرے گیسوؤں کو جھٹکاتی ہوئی بے حد خوبصورت معلوم ہوتی تھی۔"

("دل کسی کا دوست نہیں" ـــ صفحہ ۹۱)

"..... کناٹ پلیس کے گول چکر کے باہر ایک اور گول چکر شرنارتھیوں کی دکانوں کا کھنچا ہوا ہے۔ یہ دکانیں زیادہ تر

کھو کھے کی لکڑیوں، ٹین کی چھتوں یا ترپال کی دیواروں سے تیار کی گئی ہیں۔ ان میں سے بیشتر دو کانیں ڈھابہ نما ہوٹلوں میں تبدیل ہو چکی ہیں"۔۔۔۔۔۔

("وزیروں کا کلب" ۔ دل کسی کا دوست نہیں ۔ صفحہ ۱۹۱)

"۔۔۔۔۔ دھوری گاؤں کو آتے جاتے میں نے بس میں سے اکثر جوگی کی کٹیا کو دیکھا تھا۔ ملنگ پیر کے قبرستان سے آگے جا کر ناریل کے درختوں کے درمیان ایک خوش نما ہری ہری گھاس کے قطعے کے بیچ میں جوگی کی کٹیا تھی جس پر ناریل کے خشک پتوں کی چھت تھی۔ اس چھت کے اوپر کدو، کریلے اور لوکی کی بیلیں لپٹی ہوئی تھیں قطعے سے سو گز کے فاصلے پر ایک اونچے ٹیلے پر درگا ماتا کا مندر تھا۔ اس جوگی سے پہلے یہ مندر سنسان اور ویران تھا"۔۔۔ ("جوگی" ۔ دل کسی کا دوست نہیں ۔ صفحہ ۱۹۳ ۔ ۱۹۴)

"۔۔۔۔۔ قطب صاحب کی لاٹ پر بڑی رونق تھی، قطب سے پہلے حوضِ خاص آتا ہے۔ یہ پرانے کھنڈر ہیں۔ حوضِ خاص میں پرانے مقبرے ہیں۔ یوں تو ساری دلی قبروں سے پٹی پڑی ہے۔ جتنی دنیا دلی کے نیچے آباد ہے اتنی اوپر نہیں۔ حوضِ خاص کسی زمانے میں ایک بہت بڑا تالاب ہوا کرتا تھا۔ اب ایک جوہڑ سا بنا ہوا ہے۔ ٹوٹی ہوئی شکستہ عمارات میں جا بجا لوگ باگ کونوں میں دبکے بیٹھے تھے۔ کئی لوگ کھانے کا سامان لائے تھے۔ حقے اور پاندان اور بیویاں یاداشتائیں۔ کہیں سارنگی سنائی دیتی تھی کہیں قہقہے۔ ایک ہنگامہ بپا تھا۔ حوض کا بہت سا حصہ سوکھا پڑا تھا اور اس کی ریت پر چند لوگ فٹ بال کھیل رہے تھے"۔۔۔۔۔۔

("پورب دیس ہے دلی" ۔ ٹوٹے ہوئے تارے ۔ صفحہ ۱۴)

"۔۔۔۔۔ داتا یہ سنگم ہے۔ ایک پیسہ دو۔ یہ سنگم ہے۔ گاڑی پل پر سے گزر رہی تھی اور چھوٹے چھوٹے برہمن لڑکے پل کے لمبے کے شہتیروں سے چمٹے ہوئے پیسے مانگ رہے تھے۔ داتا۔ ایک پیسہ۔ گنگا مائی تمھارا کلیان کریں گی۔ صرف ایک پیسہ۔ یہ تو ترسنگم ہے۔ اپنے کلیان کے لیے براہمن کو ایک پیسہ دیتے جاؤ۔ مسافر اپنے کلیان کے لیے پیسے پھینک رہے تھے۔ پیسے گنگا مائی تک پہنچنے نہ پاتے کہ براہمن لڑکے انھیں راستے ہی میں دبوچ لیتے تھے"۔۔۔۔۔۔ ("ایک سفر" ۔ ٹوٹے ہوئے تارے ۔ صفحہ ۸۹ ۔ ۹۰)

"۔۔۔۔۔ گاڑی پونہ کے قریب پہنچ رہی ہے۔ مغربی گھاٹ جگہ جگہ سے پھٹ گئے ہیں، اور دور مشرق میں نشیب تک وادیاں اور میدان اور گھر اور کھیت نظر آ رہے ہیں۔ سامنے کے کھیتوں میں کسان کا ہل نشیب کو جاتا ہوا یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ہل کی لکیریں دھرتی کے سینے کے اندر جا رہی ہوں۔ ہماری گاڑی بلندی پر ہے اور دور دور تک مشرق میں زمین نیچے گرتی چلی جا رہی ہے"۔۔۔۔۔۔

("ایک خط، ایک خوشبو" ۔ کتاب کا کفن ۔ صفحہ ۱۵۳)

"۔۔۔۔ لوہے کے زنگ آلود تاروں کو کوتے ٹھٹھر رہے تھے۔ نم آلود بنچوں پر کائنات کی بدصورت ترین مخلوق بیٹھی ہوئی پان کی جگالی کر رہی تھی، مونگ پھلی کھا رہی تھی، رانیں سہلا رہی تھی۔ چنے کی خشک دال میں کاندہ، نمک اور سرخ مرچ اور نیبو کا رس ڈال کر اپنے دانتوں کی چکی تلے پیس رہی تھی اور بار بار آنکھیں جھپک کر ریل کی چمکتی ہوئی لائن دیکھنے میں معروف تھی"۔۔۔

("بھوت" ۔ تین غنڈے ۔ صفحہ ۱۰۰)

اسلوب

کرشن چندر ایشیا کے واحد افسانہ نگار ہیں جو اپنے مخصوص اسٹائل کی وجہ سے بقائے دوام حاصل کر چکے ہیں۔۔۔ زبان و بیان کے معاملہ میں اردو ادب کو کرشن چندر جیسے عظیم المرتبہ ادیب پر ناز ہے۔ کرشن چندر کی زبان بڑی صاف، شستہ آئینے کی طرح روشن، دل کش اور موثر ہے۔ موصوف کی تحریر میں بے ساختگی اور شاعرانہ لطافت بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ بیشتر میں

اُن کے طرزِ ادا کی جان ہیں اور روح کو ایک گونہ مسرت بخشتی ہیں۔ کرشن چندر کا اسلوب بہت ہی لطیف اور پاکیزہ ہے۔ اس میں ایک انوکھا پن اور ندرت ہے۔ تشبیہ و استعارے کے ذریعہ کرشن چندر ساحری کرتے ہیں۔ ان کی سحرکارانہ جدت آپ اپنی مثال ہے۔ اُن کے پاس الفاظ کا ذخیرہ ہے۔ وہ الفاظ کے بادشاہ ہیں، جہاں ضرورت پڑتی ہے وہ خزانے سے الفاظ نکالتے ہیں اور نگینے کی طرح جڑ دیتے ہیں۔ اُن کی طرزِ نگارش بالکل ایسی ہی معلوم ہوتی ہے جیسے کسی نے مرمر پر خوبصورت نگینے جڑ دیے ہوں، ایسے نگینے جو دیکھنے میں دل کش اور جاذبِ نظر ہوں۔ کرشن چندر کے اندازِ بیان میں سختی اور کرختگی کا فقدان ہے۔ کبھی کبھی وہ پنجابی لہجہ بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ مثلاً :

(۱) "اگر کسی نے آپریشن کرانا ہو، اگر کسی کا مقدمہ ہو، کسی کو دمے کی بیماری ہو، کسی کی بیوی بھاگ گئی ہو، وہ فوراً لاہور آ کر مجھ سے صلاح طلب کرتا ہے"۔۔۔۔۔ ("ہوائی قلعے"۔ صفحہ ۱۱)

(۲) "خدایا تیرا ہزار ہزار شکر۔ شیر علی خاں بلوچ نے گرج کر کہا۔ آپ پھر ان کو ملیں گے نا"۔۔۔۔۔ ("ہوائی قلعے"۔ صفحہ ۱۳)

لیکن یہ انداز اُن کے شروع کے افسانوں میں ملتا تھا۔ جیسے جیسے اُن کے شعور میں پختگی آتی گئی، اُن کے قلم میں بھی روانی آتی گئی۔ اب ان کی زبان بالکل نتھری ستھری ہے اور پڑھنے میں بے کیفی محسوس نہیں ہوتی، بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم ارضِ جنت کی سیر کر رہے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ شاعرانہ انداز میں محوِ گفتگو ہیں۔ جب افسانے پڑھتے پڑھتے ہم کچھ افسردگی محسوس کرنے لگتے ہیں تو کرشن چندر فوراً اپنی شاعرانہ شعبدہ بازی شروع کر دیتے ہیں اور ہمیں اپنے اندازِ بیان، تشبیہ و استعارے کو کوہ قاف کی سیر کرانے لگتے ہیں اور خوبصورت اور نازک اندام پریوں کے جھمگٹے میں لا کھڑا کرتے ہیں۔

کرشن چندر کے فن کی عظمت کا راز اُن کے مخصوص اندازِ بیان میں مضمر ہے۔ وہ اپنے موثر طرزِ نگارش کی وجہ سے افسانے میں جان ڈال دیتے ہیں اور افسانے کی روح میں تازگی پھونک دیتے ہیں۔ کرشن چندر کے افسانوں میں مزدوروں، نوکروں، فقیروں، راہگیروں، عوام، عورت، مرد، طوائف، کنواری اور مذاقیہ ہر قسم کی زبان ملے گی۔ ان سب پر کرشن چندر کو قدرت ہے۔ کرشن چندر کے افسانے اندازِ بیان کی وجہ سے بےمثل ہیں۔ موصوف کی طرزِ نگارش میں کہیں سپاٹ پن، اکھڑا پن، سطحیت اور بے کیفی نہیں ملے گی۔

کرشن چندر ہندوستان کے واحد افسانہ نگار ہیں، جن کا اسلوب دوسرے ادیبوں سے بالکل جدا ہے۔ اپنے دل کش اور خوبصورت اندازِ بیان کی وجہ سے کرشن چندر صاحبِ طرز (STYLIST) کہلاتے ہیں۔ آج کی نئی پود پر کرشن چندر کی گہری چھاپ ہے۔ لوگ اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کر رہے ہیں اور موصوف سے حد درجہ متاثر ہیں۔ نفسِ مضمون اور اظہارِ بیان کی بے تعصبی کی وجہ سے کرشن چندر کا درجہ دوسرے افسانہ نگاروں سے ممتاز ہے۔ اور یہی اُن کی کامیابی کا راز ہے۔ کرشن چندر کی زبان و بیان کی دل کشی کی وجہ سے چند ادیب بے حد متاثر ہیں۔ مثلاً : "سچی بات یہ ہے کہ کرشن کی نثر پر مجھے رشک آتا ہے۔ وہ بے ایمان شاعر ہے جو افسانہ نگار کا روپ دھار کے آتا ہے اور بڑی بڑی محفلوں اور مشاعروں میں ہم سب ترقی پسند شاعروں کو شرمندہ کر کے چلا جاتا ہے۔ وہ اپنے ایک ایک جملے اور فقرے پر غزل کے اشعار کی طرح داد لیتا ہے اور میں دل ہی دل میں خوش ہوتا ہوں کہ اچھا ہوا اس ظالم کو مصرعے موزوں کرنے کا سلیقہ نہ آیا۔ ورنہ کسی شاعر کو پنپنے نہ دیتا ۔ ۔ ۔ ۔ تحریر میں سیلاب کا سا بہاؤ ہے اور اثر انگیزی بے پناہ ہے۔ دشمن اور نکتہ چیں بھی اس کے قائل ہیں۔ میں اس کی تحریر کو سیلابِ حسن کہتا ہوں"۔۔۔۔۔

(دیباچہ : "جب کھیت جاگے"۔ صفحہ ۱-۲۔ سردار جعفری)

"..... کرشن چندر کے پاس حسین اور خوبصورت الفاظ کا اتنا بڑا ذخیرہ ہے جو ہم میں سے کسی ادیب کے پاس نہیں ہے اور وہ اُسے خوبصورتی کے ساتھ خرچ کرنا بھی جانتا ہے جو ہم میں سے بہت سے ادیب نہیں جانتے۔ ہمیں اور دوسرے ادیبوں کو خوبصورت الفاظ کے لیے سر کھپانا پڑتا ہے اور کرشن چندر کو اس کی قطعاً تکلیف نہیں کرنی پڑتی۔ وہ خوبصورت الفاظ کا شہنشاہ ہے وہ جاگیر ہیں اس کی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خوبصورت الفاظ اُس کی میراث ہیں جو اُس کے لیے مخصوص ہیں"۔

(عادل رشید — ایک ذاتی گفتگو میں)

کرشن چندر کی طرزِ نگارش کے چند خوبصورت نمونے درج ذیل ہیں:-

"..... ہم نے اس آگ کو بار بار چکھا ہے۔ اس آگ کے ذائقہ میں، اس کی دوامی لذت میں کوئی فرق نہیں پایا۔ یہ شعلہ فزوں تر ہے۔ یہ محبت جاوداں ہے۔ تو میری زندگی کا ماحصل ہے۔ میں تیری حیات کا مرکز ہوں، ایک ہی کشش ہے، ایک ہی محور ہے، ایک ہی شدت ہے۔ جیسے ساز کے مختلف تاروں سے ایک ہی نغمے کی تعمیر ہوتی ہے۔ جیسے چقماق کے دو ٹکڑوں سے ایک ہی شعلہ بلند ہوتا ہے، اسی طرح ہم نے اپنے دل، روح اور قلب کو ایک دوسرے میں مُدغم کرکے ایک آہنگِ نو کی تخلیق کی ہے، کیونکہ جب جسم اور جان، محبت کے آتش کدے میں جلتے ہیں تو پھر کچھ باقی نہیں رہتا۔ صرف آگ ہی آگ..... شعلہ خدا ہے"۔

("ٹکڑے" نغمے کی موت — صفحہ: ۱۱—۱۲)

"..... تمھارے حصے میں وقت کی اتنی ہی لپک، آفاق کی اتنی ہی وسعت، زمین کی اتنی ہی گردش آئی ہے۔ اس لیے سوال وسعتِ حیات کا نہیں ہے۔ سوال حیات کا ہے۔ اپنی زندگی میں تم نے کیا کیا؟ کسی سے سچے دل سے پیار کیا؟ کسی دوست کو نیک صلاح دی؟ کسی دشمن کے بیٹے کو محبت کی نظر سے دیکھا؟ جہاں اندھیرا تھا وہاں کبھی روشنی کی کرن لے گئے؟ جتنی دیر تک جیے، اس جینے کا کیا مطلب تھا؟"—　　("ایک خط۔ ایک خوشبو" کتاب کا کفن — صفحہ ۱۵۲)

"صاحب، اب ہم کیا کریں گے؟" — زینی نے گلوگیر لہجہ میں کہا —

"اب ہمارا اس دنیا میں کوئی نہیں — ایک خاوند تھا، وہ پردیس چلا گیا"—

"عزیزا چھوٹا سا بچہ ہے......

"میں عورت ذات ہوں......

"ہائے اب کیا ہوگا؟"—　　("جنت اور جہنم" نظارے — صفحہ ۲۴)

نیلا بولی — "تمھارا نام رَبھی ہے"؟ —

"ہاں — رفیع"! —

"رَبھی"! —

"رَبھی کیا نام ہے؟" — نیلا نے اپنی چھوٹی سی ناک کو اونچا کرکے کہا —

"رَبھی نہیں — رفیع"! —

نیلا بولی: — "میرا نام نیلا ہے، ہم وہاں رہتے ہیں (انگلی سے اشارہ کرکے) وہ اُن اخروٹ کے درختوں کے پیچھے"—

("بچپن" نظارے — صفحہ ۱۱۱—۱۱۲)

"...... جب شاموں بہاری کو میں گھر لے کے آیا تو کشتی بے حد خفا ہوئی۔ ساڑی کے پلو میں لٹکا ہوا چابیوں کا گچھا گھماتے ہوئے بولی: "آخر تم کیا چاہتے ہو؟ میں کوئی کام نہ کروں۔ بیٹھے بیٹھے موٹی ہوتی جاؤں اور تم بڑے آرام سے چند سالوں کے بعد کوئی دوسری بانکی لے آؤ۔ نہیں جی۔ میں نہ سنوں گی۔ میں اس نوکر کو نکال دوں گی"۔۔۔۔۔۔

("دودھ کا دودھ، پانی کا پانی"۔ دل کسی کا دوست نہیں۔ صفحہ ۵۵)

"جوگی استری جاتی سے اکیلے میں بات نہیں کرتے!"

"جوگی نے تہدیدی انداز میں بتایا۔ بول مائی۔ سب کے سامنے بول"!

"ادھیڑ عمر کی عورت نے سر جھکا لیا۔ آہستہ سے بولی: "میرے تیرہ بچے ہیں سب کے سب جندہ ہیں۔ گھر میں کھانے کو پورا نہیں پڑتا، مجھے اور بچہ نہیں چاہیے"۔۔۔۔۔۔ ("جوگی"۔ دل کسی کا دوست نہیں۔ صفحہ ۱۹۰)

"ماتا دین حلوائی کا لونڈا پوچھ رہا تھا۔ یار شدو! یہ دلیپ کمار سر میں کونسا تیل لگاتا ہے"؟۔۔۔۔۔۔

"دھانسو تیل"۔۔۔۔۔۔

"یہ کونسا تیل ہوتا ہے"؟۔۔۔۔۔۔

شدو نے ایک بند الماری کا تالا کھولا، اور اس میں سے ایک شیشی بہت احتیاط سے نکالی اور ماتا دین حلوائی کے لونڈے کے ہاتھ میں دے کر کہنے لگا: "یہ دھانسو تیل ہے۔ اس کا نسخہ میرے اور دلیپ کے سوا کوئی نہیں جانتا"۔۔۔۔۔۔

("دلیپ کمار کا نائی"۔ کتاب کا کفن۔ صفحہ ۱۱۶)

"..... رام پیاری چھوڑیے جی بھولا جی ......! ممکن ہے بھولا نہ کہے ڈوڈو کہے۔ آئیں۔ کہئے دو جی ...... وہ ڈوڈو بھی کہے تو اچھا معلوم ہوگا۔ "دوڈو ...... ڈوڈو"، اس نقرئی ہنستی ہوئی باریک آواز میں کتنا بھلا معلوم ہوگا "ڈوڈو..... سچ مچ کسی فرانسیسی عطر کا نام معلوم ہوتا ہے۔ ڈوڈو! تم مردوں کی ذات ہی بے وفا ہوتی ہے۔ اتنے برس سے ہمارے محلے میں رہ رہے ہو، کبھی میری طرف پلٹ کے نہیں دیکھا"۔۔۔۔۔۔

("ڈوڈو"۔ کتاب کا کفن۔ صفحہ ۵۰)

"وہ لیتھو کا پتھر مجھ سے ٹوٹ گیا، منیجر صاحب"۔۔۔۔۔۔

"کیسے ٹوٹ گیا؟"۔۔۔۔۔۔

"یہ کیسے بتاؤں، بس ہاتھ سے چھوٹ گیا، اور دو ٹکڑے ہو گیا۔ دیکھیے اس ۔۔۔۔ (ماں کی گالی) پتھر کو آج ہی ٹوٹنا تھا۔ دو سال ہو گئے، مجھے اس حرامی پریس میں کام کرتے ہوئے۔ دیکھیے کبھی ایسی واردات نہیں ہوئی"۔ یہ کہہ کر آپ نے سر کھجایا! اور سر سے ایک جوں نکال کر اُسے اپنے ناخنوں کی چٹکی میں پیستے ہوئے بولے:

"ہٹ تیری جوں کے منہ میں سور کے کباب"۔۔۔۔۔۔ ("تین غنڈے"۔ صفحہ ۱۲۲)

"وہ بولا۔ کیوں۔ کوئی چھوکری ہے"۔۔۔۔۔۔

میں حیرت سے اُس کی طرف تکنے لگا۔ اُس نے میری حیرت کا اندازہ کر لیا اور اپنی غلطی کا بھی۔ کھسیانی ہنسی ہنس کے بولا۔

"تم وہ نہیں ہے۔ تو اس بنچ پر کیوں بیٹھا۔ یہ بنچ لڑکیوں کے دلال کا ہے۔ ہیں کیا سمجھے، تمہارے پاس لڑکی نہیں ہے تو اس بنچ پر کاہے کو بیٹھتا ہے۔ سالا، خالی پیلی حیران کرتا ہے"۔۔۔۔۔۔ "گوپال کرشن گوکھلے"۔ سمندر دور ہے۔ صفحہ ۹۰)

سماجی فلسفہ

کرشن چندر کے افسانوں میں صحیح قلبی کیفیات کی مکمل تصویر ہمیں ملتی ہے۔ معاشرتی تفریق کا امتیاز، ناروا ظلم و تشدد، بے جوڑ شادی، اونچ نیچ کی تفریق اور اسی قبیل کے افسانوں سے وہ سماج کو ایک صحت مند اور مثبت انداز میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ عوام کی سسکیاں اور آہیں، جن کے سرپرست سرمایہ دار ہیں۔ کرشن چندر ان کے خلاف علم بغاوت بلند کرتے ہیں۔ نہ صرف کرشن چندر بلکہ اُن کا پورا ادب سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ ذہنیت کے خلاف ہے۔

کرشن چندر جب دیکھتے ہیں کہ اُن کے دیش کے مختلف حصّوں میں کس طرح لوگ بھوک، بیکاری اور حکومت کے عتاب کا شکار ہو رہے ہیں تو وہ وفورِ جذبات سے چیخ اُٹھتے ہیں اور خطیبانہ انداز میں کہتے ہیں کہ ہم زمانے کا رُخ موڑ دیں گے۔ دراصل کرشن چندر کے افسانے ہندوستان کے ضمیر کی آواز ہیں۔ اُن کے افسانوں میں ہمیں ناانصافی، لوٹ کھسوٹ، سرمایہ پرستوں کے خلاف شدید نفرت (جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے) بے کسوں اور متوسط طبقوں کے ساتھ ہمدردی اور جذبۂ ترحّم کی نمایاں جھلک نظر آتی ہے۔ کرشن چندر غریبوں اور کسانوں کے بے حد ہمدرد ہیں۔ موصوف بوسیدہ سرمایہ دارانہ ذہنیت کے خلاف ہماری نفرت کو بھڑکاتے ہیں اور ہمیں ایک مثبت صحت مند اور اشتراکی سماج کی تعمیر کے لیے تلقین کرتے ہیں اور اپنے قلم کے ذریعہ عوام کو امن کے پلیٹ فارم پر جمع کر رہے ہیں۔ کرشن چندر اپنے افسانوں کے ذریعہ لوگوں کو اُمید کی مشعل لیے آگے بڑھنے کو کہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ عوام کو اُن کا حق ملے گا اور وہ وقت ضرور آئے گا جب سب انسان برابر ہوں گے اور انسانیت پھر سے حیاتِ نو کے پرچم لہراتی ہوئی اپنی جگہ مسلم کرلے گی۔ کرشن چندر کے نزدیک زندگی اُس جد و جہد کا نام ہے جو انسان اپنی آخری سانس تک امن اور ایک نیا سماج قایم کرنے میں وقف کرتا ہے۔ جہاں ہمیں روٹی کپڑا اور ضروریاتِ زندگی مل سکیں۔ کرشن چندر کے نزدیک زندگی بہت اہم ہے کیونکہ خوبصورتی روٹی سے پیدا ہوتی ہے، اور جب روٹی نہ ملے تو خوبصورتی مرجاتی ہے۔ کرشن چندر ہمیں جینا سکھاتے ہیں۔ لڑنا سکھاتے ہیں، کاہل ہونا نہیں، پست ہمت ہونا نہیں۔ کرشن چندر کے نزدیک انسان کیسی کیسی حالتوں میں مرجاتا ہے، زیادہ اہمیت نہیں رکھتا، بلکہ انسان کیسی کیسی حالتوں میں زندہ رہ سکتا ہے، زیادہ اہم ہے۔

کرشن چندر نے اپنے سماجی فلسفے کو عموماً ہر افسانے میں پیش کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ اگر اُن کے افسانوں کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اُن کا سماجی فلسفہ اُن کے افسانے میں کسی نہ کسی صورت میں نظر آئے گا۔ وہ اپنے افسانوں میں سماجی فلسفے کو ایک ضروری اور لازمی عنصر سمجھتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجیے۔ اس سے اُن کے سماجی فلسفے کی پوری طرح وضاحت ہوجائے گی۔

"..... پھر اُسے خیال آیا کہ ہندوستانی سماج میں سنیاسی اور فقیر لوگ خاص عزّت کے مالک ہیں۔ خدا کے یہ لاکھوں بندے کھاتے پیتے لوگوں سے بھیک مانگ کر اُن کے ضمیر کو تسکین پہنچاتے ہیں۔ عمل اور جو تیش سے اُن کے مستقبل کو روشن اور دل کش بناتے ہیں۔ کایا کلپ کرتے ہیں۔ مبارک ہیں اُن کی زندگیاں اور محبّت سے لبریز ہیں اُن کی روحیں۔ اس لیے اُس کا "سنیاسی" کے ساتھ بھاگ جانا چنداں تعجب خیز نہ تھا۔" ("زندگی کے موڑ پر"۔ صفحہ ۲۷)

"..... انسان کو یہ سپنوں کی دنیا کیوں پیاری ہے اور کیوں وہ ان سپنوں کو حقیقت نہیں بنا لیتا۔ سورج، پانی، چاند، ہوا کی طرح اگر زمین اور اُس کی ساری پیداوار بھی سب انسانوں میں مشترک ہو جائے تو ہر گھر ان سُندر سپنوں کا جگمگاتا ہوا شیش محل بن جائے، پھر انسان ایسا کیوں نہیں کرتا۔ وہ کیوں غاصب ہے۔" "اشتراکی" کیوں نہیں، کیا اس میں اتنی سی عقل بھی نہیں

کہ اس سیدھی سادی بات کو سمجھ سکے!" ——— ("بالکونی" زندگی کے موڑ پر ۔ صفحہ ۱۵۴)

"۔۔۔۔۔ کیا عبداللہ آج سے چند سال بعد نہ مر سکتا تھا۔ شاید اُس کا بیٹا پڑھ لکھ کر اس کے تخیل کے سپنے سچے کر دیتا، یعنی یہ کونسا طریقہ ہے مرنے کا کہ صاحب لوگوں کے لیے پانی کی بالٹیاں بھرتے بھرتے مر گیا۔ کیا وہ اپنے کھیتوں میں "اپنے جھونپڑے" سے باغیچے میں "اپنے مٹی کے گھر" میں نہ مر سکتا تھا۔ میں پوچھتا ہوں، یہ کیسا مذاق ہے؟ اس طرح مرنے کا کیا حق تھا، وہ اسی طرح کیوں فاقے کرتے کرتے، ایڑیاں رگڑتے رگڑتے، جھوٹے سپنے دیکھتے دیکھتے مر گیا، دنیا میں لاکھوں، کروڑوں عبداللہ شب و روز اسی طرح کیوں مرتے ہیں؟ کیوں جیتے ہیں؟ کیوں رہتے ہیں؟ یہ کیا مذاق ہے؟ کیسا تماشا ہے، کیسی خدائی ہے؟" ———

("بالکونی" زندگی کے موڑ پر ۔ صفحہ ۱۶۰ ۔ ۱۶۱)

"تم جانتے ہو، مجھے طوائفیت سے، پرانے ساختی نظام سے کوئی تعلق نہیں۔ میں تو طوائفیت کو مٹا کر عورت اور مرد دونوں کو برابر کا درجہ دینا چاہتا ہوں ۔ میں تو ایک ایسا سماج چاہتا ہوں جہاں کوئی کسی پر ظلم نہ کر سکے اور یہ اُسی وقت ہو سکتا ہے جب سب برابر ہوں ۔ مساوات، مکمل مساوات کا حامی ہوں الزبھائی ۔ تم میرے قول اور فعل میں کبھی کوئی تضاد نہ پاؤ گے۔ یہ فلسفۂ زندگی میری حیات کا جزوِ عظیم ہے" ——— ("ہم سب غلیظ ہیں" نغمے کی موت ۔ صفحہ ۱۲۳)

"تو تم کیا چاہتے ہو"؟ ——— دادا بھائی بولے۔

"تنخواہ میں اضافہ"! ———

"ہاں مالک، مہنگائی بہت ہے اور خرچ زیادہ ہے اور زندگی مصیبت ہے"۔

"تو مل مالک سے کیوں نہیں کہتے"۔

"بہت کہا مالک، مگر انھوں نے نہیں سُنا"۔

"تو سرکار سے کہو۔ اپنی سرکار سے کہو۔ اب تو اپنی سرکار ہے"۔

"اپنی سرکار نے بھی نہیں سنی ۔ اُنھوں نے ہمیں گولی مار دی ہے ۔ مالک ۔ یہ ماتھے پر گولی کا نشان ہے ۔ میں امل نیرل کا مجبور ہوں، میرے تین بچے ہیں ۔ ایک بیوی ہے ۔ ایک بڈھی ماں ہے، ایک بڈھا باپ ہے اور سب کا خرچ مجھ پر ہے اور مجھے مار دیا گیا ہے، وہ سب لوگ بھوکے ہیں اور میں نے ہمیشہ کانگریس کو چندہ دیا ہے اور آجادی کے لیے ہڑتال بھی کی ہے ۔ مگر آج آجادی آگئی ہے اور اس کی پہلی گولی میرے ماتھے پر ہے مالک"۔ ———

("بُت جاگتے ہیں" اجنتا سے آگے ۔ صفحہ ۹۳ ۔ ۹۴)

"۔۔۔۔۔ جب فصل پکتی ہے تو جاگیردار اپنا حصّہ لے لیتا ہے ۔ اسی طرح جب عورتیں جوان ہوتی ہیں تو جاگیردار اپنا حصّہ لے لیتا ہے ۔ لگان وہ اپنے خزانے میں داخل کرتا ہے اور عورتیں اپنے حرم میں ۔ یہ جاگیردارانہ سماجی زندگی کا ایک سیدھا سادا اصول ہے، جس میں چون و چرا کی گنجائش بہت کم ہے ۔ نواب آسمان جاہ بہادر یار جنگ نے کبھی اس میں کوئی گنجائش روا نہ رکھی تھی"۔ ———

("اجنتا سے آگے" ۔ صفحہ ۱۲۹)

"مل مالکوں نے کروڑوں روپیہ کمایا ہے ۔ آپ کو یاد ہوگا، ایک دفعہ آپ نے کنٹرول اٹھوا دیا تھا ۔ چند دنوں میں مل مالکوں نے کروڑوں روپے کا ہیر پھیر کر لیا"۔ ———

"ہاں۔ وہ میری غلطی تھی"۔۔۔۔

"غلطی آپ کی تھی، مزا نہیں آرہا ہے، چیزوں کے دام بڑھتے جارہے ہیں، جوں جوں سوراج کی عمر لمبی ہوتی جارہی ہے۔"

"تم آخر کیا چاہتے ہو۔۔۔ بونس؟"۔۔۔۔

"کمال نے کہا: "نہیں میں اپنی حکومت چاہتا ہوں ۔۔ میں سارے کارخانے خود چلاؤں گا، سارے کھیت خود بوؤں گا، ساری محنت خود کروں گا، سارا پھل خود کھاؤں گا"۔۔۔۔ ("باپو کی واپسی"۔۔ میں انتظار کروں گا ۔۔ صفحہ ۴۶-۴۷)

"میں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ تقدیر بھی بدل جاتی ہے، جب سب مزدور مل جاتے ہیں۔ تم لوگ تو زندگی کی سچائی ہو، سوچو تو دراصل وہ کان تمہاری ہے۔ اُس میں کام تم کرتے ہو۔ پہاڑ میں بارود کا فلیتہ تم لگاتے ہو۔ چٹان کو "ڈائنامیٹ" سے تم اڑاتے ہو، پتھروں کو تم توڑتے ہو، پتھر کاٹ کر لاری میں تم لادتے ہو۔ جب یہ ساری محنت تم کرتے ہو تو اپنی محنت کا پھل کسی دوسرے کو کھانے کیوں دیتے ہو"؟۔۔۔۔

میری بات سنتے ہی اُس کا چہرہ لال ہو گیا۔ وہ سلاخ سہلا رہا تھا، سہلاتے سہلاتے اُس نے زور لگا کر اُسے دُہرا کر دیا۔

اُس نے کہا: یہ بالکل نئی بات تم نے بتائی ہے۔۔۔

میں نے کہا، نئی بات نہیں ہے، سو سال پُرانی ہے، آزمائی بھی جا چکی ہے۔۔

وہ سلاخ اٹھا کر اٹھ گیا۔ بولا۔ ہم بھی آزما سکتے ہیں۔ کل میں اپنے ساتھیوں سے بات کروں گا اور بتاؤں گا"۔۔۔۔

("پانچ روپے کی آزادی"۔۔ میں انتظار کروں گا ۔۔ صفحہ ۵۸)

"۔۔۔۔۔ پیشکار نے مِثل نکال کے لکھن سنگھ کے ہاتھ میں تھما دی۔ لکھن سنگھ نے اپنی جیب سے دو روپے نکال کر پیشکار کے ہاتھ میں تھما دیے۔ پیشکار نے بُرا سا منہ بنا کے کہا۔ اوں ہوں۔ دو نہیں پانچ روپے ہوں گے!

"یہ کہہ کر اُس نے مِثل فوراً واپس لے لی"۔

"مگر پہلے تو تم نے دو روپے لیے تھے۔ اپنا سنگھ کے پہلے کیس میں فرنگیوں کے زمانے میں!" لکھن سنگھ نے پوچھا۔

"جب کی بات اور تھی، اب تو پانچ روپے لگیں گے۔ باپو کا فرمان ہے"۔۔

"باپو کا؟" لکھن سنگھ حیرت سے بولا۔

"ہاں"۔ چالاک پیشکار فوراً بولا: "اگر مجھ پر اعتبار نہیں ہے تو اس تصویر کو دیکھ لو"۔۔۔

("باپو تیرے نام پر"۔۔ کرشن چندر کے افسانے ۔۔ صفحہ ۸۸، ۸۹)

"۔۔۔۔۔ کدھر ہے وہ گڈریا، جو کہتا تھا، موہنجو دارو کے آخری ٹیلے میں اس کا سب سے بیش قیمت خزانہ دفن ہے؟"۔۔۔۔

تینوں نے مل کر اُس سمت دیکھا جدھر گڈریا بھیڑ بکریاں چرا رہا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہو، جیسے وہ گڈریا مسکرا رہا ہے۔ پھر مجھے ایسا محسوس ہوا، جیسے جہاں پر گڈریا تھا وہاں پر اب ایک صلیب ہے!۔۔ پھر یکایک صلیب کے پیچھے سے آفتاب نکل آیا اور اُس کی سنہری کرنوں میں وہ "روٹی" یکایک ایک سونے کی تھال کی طرح چمک اٹھی اور یکایک اُن تینوں کی سمجھ میں کچھ آگیا اور موجمدار نے "ڈیوڈ" سے اشارہ کرکے کہا۔ اس "روٹی" کو چھپالو ۔۔۔ اس "روٹی" کو چھپالو، مزدور کام پر واپس آرہے ہیں۔۔ "ڈیوڈ" نے گھبرا کر "روٹی" کو جلدی سے اپنے دامن میں چھپا لیا اور اُفق کی طرف دیکھا۔۔۔۔ اُفق پر واقعی صبح ہو چکی تھی اور مزدور کُدالیں اُٹھائے

کام پر واپس آرہے تھے"——

("موہنجو دارو کا خزانہ" کرشن چندر کے افسانے — صفحہ ۱۲۵)

"..... تیری بیوی کا بچّہ ہے تو پھر تو اُسے پالنے میں کیوں رکھ کے آیا؟"——

میری بیوی مرچکی ہے حضور! دس دن ہوئے، وہ ایک ماہ کا بچّہ چھوڑ کر مرگئی۔ گھر میں جو کچھ تھا اُس کے کفن دفن پر لگ گیا۔ میں چھ ماہ سے بیکار ہوں۔ کہیں کوئی کام نہیں ملتا۔ گھر میں پانچ بچے ہیں۔ یہ چھٹا ایک مہینے کی ننھی سی جان کل رات سے بھوکا بلک رہا تھا۔ تین دن سے گھر کے سب لوگ فاقے ہیں، مگر کسی نہ کسی طرح اِس کے لیے ہم دودھ لاتے رہے۔ کل رات سے اس کے لیے دو گھونٹ دودھ بھی نہیں ملا، کیسی دنیا ہے یہ مالک؟ یہاں ننھے بچے کے لیے دودھ بھی نہیں ہے۔ تین دن سے میرے سب بچے میرے ساتھ فاقے کر رہے ہیں، وہ مرجائیں گے میں جانتا ہوں، وہ مرجائیں گے، میں بھی مرجاؤں گا، میں نے سوچا یتیم خانے کے لوگ اس کی پرورش کرسکیں گے، اسی لیے ننھی سی جان کو وہاں ڈال آیا ہوں"——

("پالنا" بیسویں صدی۔ دہلی۔ دسمبر ۱۹۶۰ء)

کرشن چندر کے اُن کے اپنے منفرد آرٹ اور تکنیک کی جو مثالیں میں نے کہیں کہیں سے پیش کی ہیں وہ اُن کی عظمت کی ایسی نشانیاں ہیں جنھیں اُن کا ہر قاری محسوس کرتا ہے اور جن پر ہر زبان کے نقادوں کو اتفاق ہے۔

(بہ شکریہ شاعر۔ بمبئی۔ کرشن چندر نمبر)

سچائی کا علمبردار
صفحہ ۳۹ سے آگے

رہائی کے لیے سب سے اونچی آواز میں بولنے پر مجبور کرتی رہی۔

فرقہ وارانہ دیوانگی کے دور میں انھوں نے بعض نام نہاد دانشوروں کی طرح اس کی عصبیت کو ہی یاد نہیں رکھا انسان کی تمام کمزوریوں اور کج رویوں کے باوجود اس کی انسانیت بھی اُن کے پیشِ نظر رہی۔ ایک عظیم اور سچے دانشور کے لیے مکمل سچائی سے مفر نہیں۔ ادھوری سچائی سے فن تکمیل کی منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔ ایسا ہی حادثہ شیراز کے سعدی کو بھی پیش آیا تھا۔ معاشی بدحالی کے سبب جب لوگ عشق کو فراموش کر بیٹھے تھے تو سعدی نے قحط کو بھی یاد رکھا تھا کہ یہی مکمل سچائی ہے اور اسی میں ان کی عظمت ودوامیت کا راز مضمر ہے۔ کرشن نے کبھی ادھوری بات نہیں کہی۔ انھوں نے ہمیشہ مکمل سچائی پر ایمان رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج گوشت پوست کا کرشن ہم میں نہیں ہے لیکن ان کی تخلیقات کا بیشتر حصہ ہمارے ادب کا اس وقت تک جزو بنا رہے گا جب تک برصغیر میں ایک بھی اردو بولنے والا زندہ رہے گا۔

افکار کا "برطانیہ میں اردو ایڈیشن"
تیاری کی منزل میں

سردار جعفری

کرشن چندر۔ میر کارواں

حریف بادِ مخالف، حریف فصلِ خزاں
چمن میں موسمِ گل کا مزاج داں نہ رہا

وہ خود جو شعلہ تھا شعلوں میں ہو گیا پیوست
شرار و برق کے گلشن کا باغباں نہ رہا

وہ جس کی آہ تھی شمشیرِ حسن، تیغِ جمال
وہ جس کے نالوں سے تھی سطوتِ فغاں نہ رہا

کرے گا سجدہ کہاں آسمانِ ذوقِ ادب
کہ بارگاہِ امانت کا آستاں نہ رہا

کدھر کو جائے گا اب کاروانِ حرف و بیاں
سیاہ دشت ہے اور میرِ کارواں نہ رہا

افضل پرویز

کرشن جی!

موت کو رام کر لیا ہوتا — تو نے امرت کوئی پیا ہوتا
پاس ہمارا ہی کچھ کیا ہوتا — پردیسیوں کو نہ دکھ دیا ہوتا
اور کچھ روز تو جیا ہوتا

ظلم کے واسطے تبر تھا تو — اپنے رن بیروں کی سپر تھا تو
دھوپ میں سایۂ شجر تھا تو — دل دریدوں کا بخیہ گر تھا تو
اپنا دامانِ جاں سیا ہوتا
اور کچھ روز تو جیا ہوتا

جتنا رادھا — جگت ہے بندرا بن — گوپیوں کی چبھن — ترے درشن
تو تھا مُرلی دھر اور من موہن — کرشن! تو ہی تھا اُن کا تن من دھن
زخم اُن کو نہ یہ دیا ہوتا
اور کچھ روز تو جیا ہوتا

تو نے دُکھیوں سے میٹھے بول کہے — وہ تری رَچنا کی شرن میں ہے
تیری موجوں میں کرودھ کنٹ بہے — کس کا بوتا تھا تیری کاٹ سہے
کون تھا جس میں یہ ہیا[1] ہوتا
اور کچھ روز تو جیا ہوتا

سر پہ چڑھ بولتا ترا جادو — تو نے برتائے رنگ اور خوشبو
گھور اماوس میں روشنی تھا تو — جس سحر کے لیے جلایا لہو
انتظار اُس کا ہی کیا ہوتا

[1] حوصلہ

قمر ہاشمی

کرشن چندر کی یاد میں

نہ کوئی خط
نہ ملاقات کی نوید کوئی
بس اک خفیف سی اُمید وصل و مجلس کی
میں خود فریش ہوں
ناقدریٔ زمانہ سے
ہے اپنی موت کا ہفتوں سے انتظار مجھے
اچانک ایک دن
اخبار میں ذرا سی خبر
علیل صبح کی محرومیوں کا خمیازہ
نظر خلا میں بھٹکتی رہی سوال کے بعد
نہ تھی کرشن کی مرلی
تری کہانی تھی
ترے قلم کی روانی سے زندگی تھی رواں
میں اپنی بالکنی پر کھڑا ہوا اِک دن
یہ سوچتا تھا کہ گرجن کی شام کیا ہو گی ؟
سڑک میں کون سی رومانیت کا پہلو ہے

کہانی کار کی معجز نمائیوں نے اسے
بنادیا ہے طلسمِ خیال کا توسن
کبھی اسی کو سمجھتا ہے میوزیم فاری

یہ کھیت اور یہ بل کھاتی اُجلی پگڈنڈی
یہ کارخانہ دھواں چھوڑتی ہوئی چمنی
یہ ننگی بھوکی جواں نسل کی پریشانی
یہ ایشیا کے سیاسی لٹیرے خوں آشام
یہ افریقہ کے بہادر سپوت رزم آرا
تری کہانی کے کردار ختم کیا ہوں گے

عزیز دوست
دلوں کی کہانی جب تک ہے
کتابِ دل میں ہمیشہ رہے گا تو زندہ
تو اپنے دور کا چیخوف تھا موپاساں تھا
میں گورکی سے نہیں مل سکا تجھے دیکھا
جب آدمی کے حسیں خواب مُسکرائیں گے
تری کہانیاں رادھا کا روپ دھاریں گی
تو ولولوں کے جھروکے سے جھانکتا ہوگا

ادیب سہیل

پانی کا پیڑ

وہ یاد کے منچ[1] پر کھڑا ہے
آنکھوں میں کنول جلائے
کن حرفوں سے کروں میں اُس کا سواگت
کن لفظوں کی آرتی اُتاروں
سب لفظ ہی پستہ قد سے لگ رہے ہیں

بے آب وگیاہ پتھروں میں
پانی کا وشال[2] پیڑ تھا وہ
پربت سے اُتر کے نیچے آیا
ہموار زمیں کے بازوؤں میں
اِک جوئے خوش رواں کی صورت ــــ
ــــ اک سمت اِک سفر تھا
جیون کی سماپتی[3] تک اُس کی اُجلی سوچیں
اس جوئے خوش رواں کے دائیں بائیں
پُل کی طرح تنی ہوئی تھیں
آگا ہی بکھیرتی رہی تھیں

جیون کی سماپتی تلک مگر خود
پُل کے بائیں طرف کھڑا ہوا تھا

---

[1] روسٹرم [2] عظیم [3] اختتام

حزیں لدھیانوی

کرشن تو چاند ایشیا کا تھا

جس جگہ تو نے بے بسی دیکھی
کرب میں قید زندگی دیکھی
جس جگہ تو نے تیرگی دیکھی
تو وہیں پہنچا روشنی لے کر

جس جگہ راج جبر کا دیکھا
جس جگہ وہم صبر کا دیکھا
جس جگہ قہر قبر کا دیکھا
تو وہیں پہنچا زندگی لے کر

جس جگہ راج جھوٹ کا دیکھا
جس جگہ تاج جھوٹ کا دیکھا
جس جگہ کاج جھوٹ کا دیکھا
تو وہیں پہنچا راستی لے کر

جس جگہ زد پڑی اُصولوں پر
جس جگہ آگ برسی پھولوں پر
جہل جب بھی ہنسا رسولوں پر
تو وہیں پہنچا سرکشی لے کر

کرشن تو چاند ایشیا کا تھا
ماند ہوگی نہ روشنی تیری
راستوں کے گھنے اندھیروں میں
جگمگائے گی آگہی تیری

آندھی یہ لَو بجھا نہیں سکتی
کرشن کو موت آ نہیں سکتی

محسن بھوپالی

وہ بانسری خموش ہے

کرشن چندر کا قلم،
وہ بانسری تھا
جس نے امن و آشتی کی لے میں
زندگی کو اک نئے سفر سے آشنا کیا
توہمات کو خیال و فکر کی نئی ڈگر سے آشنا کیا
سسکتی محنتوں کو عظمتِ ہنر سے آشنا کیا

وہ بانسری خموش ہوگئی
مگر وہ لے امر ہے جو
نیا شعور دے گئی
نئی زبور دے گئی ــــــ

حسن سوز

گہرا بادل

(کرشن چندر کی یاد میں)

فصلیں اچھی سوچوں کی
اور سُندر سپنوں کی
رستہ دیکھ رہی تھیں
ننھے پودے
جھانک رہے تھے
ذہنوں کی دھرتی سے
پاپی پیٹ جھڑ، چوس رہا تھا
خون، دلوں کے گلشن کا
ایسے میں اک گہرا بادل
تنہا جھوم کے اُٹھا
بن گرجے ہی
کچھ دن ٹوٹ کے برسا!

رُت بدلی،
فصلیں لہرائیں
اچھی اچھی سوچوں کی
اور سُندر سپنوں کی
ننھے پودے
اُوپر آئے، ذہنوں کی دھرتی سے

بستی بستی، رستے رستے
پیار کے رنگ بکھیرے
پگ پگ پھول کھلائے! !

سوچو تو ——،
اس جھوٹے جگ میں
انسانوں کی خاطر
دھرتی ماں، ممتا کی روگی
کس کس روپ میں آئی
کیسے کیسے ناٹک کھیلے
کیا کیا سوانگ رچائے
کیا کیا بادل آیا
جھوما، ٹوٹ کے برسا
جو کچھ بھی جھولی میں تھا ——
سب دے کر ہی مُسکایا!
کرشن چندر بھی اک بادل تھا
گہرا اور بھرپور
جس کی سوچ کے سچے موتی
جگ مگ، جگ مگ برسے!

ماہ طلعت

کرشن چندر

ابھی تو فٹ پاتھ کے مکینوں کی قسمتوں میں،
گھروں کے سپنے ابھی نامکمل،
ابھی تو سڑکیں طویل ہیں
راہ میں گڑھے ہیں
ابھی تو جنگیں ہیں، سرحدیں ہیں، مہاجرت ہے۔
ابھی تو ذاتوں کا دیوتا مسکرا رہا ہے۔
ابھی شکستیں ہیں چار جانب،
ابھی محبت برہنہ پا ہے،
ابھی ہے شہرِ بتاں کی حسرت،
بہت سا ریشم، بہت سی چاندی، بہت سا سونا؟
ابھی تو انسان تُل رہا ہے۔
ابھی ہوائیں جلا وطن ہیں،
ابھی ہے خوشبو گریز پا، کُہر ہے، دھواں ہے
ابھی سرنگیں ہیں لمبی لمبی،
اندھیرا گھُپ ہے۔
اور اِن سرنگوں کے پار کیا ہے ——
کسے پتہ ہے ——؟
کہ اب وہ آنکھیں نہیں رہیں،
جن میں روشنی تھی ——!

میرزا ادیب

گہرے پانیوں کے مسافر کو آخری سلام

یہ بات صرف چند ماہ پہلے کی ہے۔

بمبئی سے کرشن چندر کا خط آیا تھا اور یہ میرے نام اُس کا آخری خط تھا۔ اس خط میں اُس نے اپنی عزیز بہن سرلا دیوی کے حادثۂ انتقال کی دردناک خبر سنائی تھی۔ سرلا دیوی اپنے بھائی کو اپنے سارے عزیزوں کو، اپنے تمام ملنے جلنے والوں کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئی تھی اور کرشن کے اس خط کا ایک ایک لفظ گہرے درد و کرب میں ڈوبا ہوا تھا۔ کرشن نے خود کو ایک ایسے درخت سے تشبیہ دی تھی جس کی ساری شاخیں ہوا کے تیز و تند جھونکوں سے بے برگ و بار ہو گئی ہوں اور وہ چپ چاپ افسردہ و پژمردہ اور اداس کھڑا ہو۔

کرشن چندر کا مجھ سے اولین غائبانہ تعارف اُس وقت ہوا تھا جب اُس کی اولیں افسانوی تخلیق "جہلم میں ناؤ پر" ماہنامہ ہمایوں میں چھپی تھی۔ بعض اہلِ قلم اپنی پہلی ہی تخلیق پر شہرت کے پر لگا کر کہیں سے کہیں پہنچ جاتے ہیں اور لوگوں کو محسوس ہو جاتا ہے کہ ادب کے افق پر ایک نیا تابناک ستارہ طلوع ہو چکا ہے۔ کرشن چندر بھی انہی خوش نصیب مصنفوں میں شامل تھا۔ اس کا افسانہ چھپتے ہی پڑھنے والوں کے دلوں میں اتر گیا اور میں نے جب یہ افسانہ پڑھا تو مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا کہ کرشن چندر دریائے جہلم کے پانیوں پر رواں دواں اُس کنارے کی طرف چلا آ رہا ہے جہاں میں کھڑا ہوں اور میرے ساتھ اور بھی بہت سے لوگ کھڑے ہیں۔ ہم سب اُس کا خیر مقدم کر رہے ہیں۔ چند لمحوں کے بعد اُس کا نرم نرم ہاتھ میرے ہاتھ میں آ جاتا ہے اور ہم دونوں خاموشی کے ساتھ کھڑے دریا کے چمکتے دمکتے پانیوں کو دیکھ رہے ہیں۔

تو بہت مدت پہلے دریائے جہلم کے کنارے میں نے کرشن چندر کو دیکھا تھا۔ اُس کا مسکراتا ہوا معصوم چہرہ مجھے بڑا پیارا لگا تھا۔ اس چہرے کی تشکیل اُس کے ایک نہایت خوبصورت افسانے نے کی تھی۔ ایک ایسے افسانے نے جس میں چاند کی ملایم کرنوں کی صباحت کے ساتھ ساتھ جہلم کے پانیوں کی چمک دمک بھی شامل تھی، اور جب کرشن لاہور میں آ گیا تو اس کے شب و روز افسانوں کی تخلیق میں گزرنے لگے۔ اُن دنوں میں نے اور ادبِ لطیف کے منیجر چوہدری نذیر احمد مرحوم نے طے کیا کہ کرشن چندر سے ملاقات کی جائے اور اسے ادبِ لطیف کے قلمی تعاون پر رضامند کیا جائے۔

تجویز اچھی تھی اور بظاہر فوری طور پر قابلِ عمل بھی لگتی تھی۔ لیکن جب کرشن چندر کے گھر کا پتہ معلوم کرنے کی کوشش کی

گئی تو کافی دقت ہوئی — وہ نیا نیا وارد لاہور ہوا تھا۔ بہت کم لوگوں کو اُس کی رہایش گاہ کا علم تھا۔ آخر بڑی تگ و دو کے بعد پتہ چل گیا کہ وہ گھوڑا اسپتال کے قریب ایک پرائیویٹ ہاسٹل میں رہتا ہے اور ایل۔ ایل۔ بی کا طالب علم ہے۔

آج کل جس جگہ اینمل ہسبنڈری کالج کا ہوسٹل واقع ہے اس کے پہلو میں سنت نگر کو جانے والی سڑک کے اوپر دائیں جانب ایک پرانی عمارت کھڑی ہے۔ اس عمارت کے نیچے تین چار دکانیں ہیں اور اوپر کئی کمرے ایک دوسرے کے ساتھ ملحق ہیں —

مجھے خوب یاد ہے کہ اس روز دوپہر کا وقت تھا۔ شاید جاڑے کے آخری دن تھے۔ میں اور چودھری نذیر احمد ایک پھاٹک کے اندر داخل ہوئے اور ایک طرف چھوٹی چھوٹی سیڑھیوں پر چڑھنے لگے — اوپر پہنچے تو ہمارے سامنے ایک معمولی سا کمرہ پھیلا ہوا تھا۔

کمرہ نہ تو بڑا تھا اور نہ بہت چھوٹا۔ فرش پر ایک پھٹی پرانی دری بچھی تھی اور اس دری کے اوپر چند نوجوان بیٹھے بڑے انہماک و شوق سے تاش کھیل رہے تھے۔ اسی دری کے ایک سرے پر ایک ایسا نوجوان بھی بیٹھا ہوا تھا جس کے چہرے میں بلا کی دل کشی تھی۔ اس دل کشی میں ایک ایسی اُداسی تھی جو کشمیر کی وادیٔ گل پوش کی ایک خاموش شام میں ہوتی ہے۔

میں نے اس کے چہرے کو دیکھا اور دل نے کہا۔ یہی کرشن چندر ہے۔

اس کے بیٹھنے کا انداز بتا رہا تھا کہ اسے تاش سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ کھڑکی میں سے باہر دیکھ رہا تھا اور خود بخود مسکرائے جا رہا تھا ——

میں نے تاش کھیلنے والوں میں سے ایک صاحب کو مخاطب کیا۔

"ہم کرشن چندر صاحب سے ملنے کے لیے آئے ہیں" ——

جن صاحب کو مخاطب کیا گیا تھا اس نے بیزار نوجوان سے کہا ——

"بابا! آپ سے ملنے کے لیے آئے ہیں" ——

وہ نوجوان ذرا کسمسایا اور اٹھ بیٹھا ——

اُس وقت، تاش کھیلنے والوں نے دری کے اوپر ذرا ذرا پیچھے کھسک کر ہمارے لیے بیٹھنے کو تھوڑی سی جگہ بنا دی۔ ہم دونوں سمٹ سمٹا کر بیٹھ گئے۔ کرشن چندر سے اب تعارف کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی اس لیے میں نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے اُس کے افسانے کی تعریف کی، جسے سن کر اُس کے چہرے کا رنگ خاصا متغیر ہو گیا۔ کانوں کی لویں سرخ ہو گئیں ..... وہ غیر ارادی طور پر دائیں ہاتھ سے اپنا پاؤں کھجانے لگا ——

"کرشن صاحب!" — میں نے کہا "آپ جانتے ہیں لاہور سے ایک ادبی پرچہ بھی شایع ہو رہا ہے" ——

"ادبِ لطیف میں پڑھتا ہوں" — کرشن نے ذرا مسکرا کر کہا ——

"یہ تو بہت اچھی بات ہے، آپ اس کے لیے لکھنا پسند کریں گے!" ——

"ظاہر ہے" ——

"کیا ظاہر ہے؟" یہ سوال چودھری نذیر احمد کا تھا ——

"لکھوں گا"——
بغیر مزید بات چیت کے وہ نتیجہ نکل آیا جس کی توقع میں اور چودھری صاحب دل میں لے کر گئے تھے۔
اس پہلی ملاقات میں کرشن چندر مجھے بڑا پیارا انسان لگا۔ اس نے کوئی لمبی چوڑی گفتگو نہیں کی تھی۔ کسی قسم کے تکلف سے کام نہیں لیا تھا۔ کوئی شان دار وعدے وعید نہیں کیے تھے۔ صرف دو لفظ کہے تھے۔ "لکھوں گا" اور یہ دو لفظ کہتے ہوئے اُس کے چہرے کا تاثر بتا رہا تھا کہ یہ حرف حرف اس کے ہونٹوں سے نہیں دل سے بھی نکلے ہیں اور اس بات کی صداقت تیسرے ہو تھے دن ہی ظاہر ہو گئی۔ کرشن چندر دفتر میں آگیا——
میں نے تعظیماً کھڑے ہو کر مصافحہ کیا۔ اور وہ سامنے کرسی پر بیٹھ گیا——
"آپ نے افسانہ مانگا تھا"——
"جی ہاں۔ عرض کی تھی"۔ میں نے کہا——
"یہ لیجیے۔ حاضر ہے"——
اس نے جیب سے تہ کیے ہوئے کاغذ نکالے اور میری طرف بڑھا دیے۔ کاغذ کی پیشانی پر افسانے کا عنوان درج تھا "یرقان"—— کرشن نے میرے چہرے کے تاثر سے بھانپ لیا کہ میں یرقان کا مفہوم سمجھنے سے قاصر ہوں——
"آپ کبھی یرقان میں مبتلا نہیں ہوئے غالباً" اس نے کہا——
"جی نہیں"——
"میں مبتلا ہوا تھا۔ اس بیماری میں ہر چیز زرد دکھائی دیتی ہے"——
"اچھا"——
"ویسے دلچسپ بیماری ہے"——
"جب آپ اس میں مبتلا رہ چکے ہیں تو یقیناً دلچسپ ہوگی"——
کرشن مسکرانے لگا۔ وہ قہقہہ نہیں لگاتا تھا۔ مسکراتا رہتا تھا مگر اس کی مسکراہٹ قہقہے سے زیادہ نشاط آفریں ہوتی تھی۔ یہ مسکراہٹ بڑی صاف ستھری ہوتی تھی۔ سفید گلاب کی طرح اور اس کی مسکراتی ہوئی آنکھیں تو یوں لگتا تھا جیسے شام کے وقت ایک نکھری ہوئی جھیل کی سطح پر دو بہت خوبصورت کنول تیر رہے ہوں——
میں نے بارہا اُسے سنجیدگی کے عالم میں بھی دیکھا تھا مگر مجھے اس کی گمبھیر سنجیدگی میں بھی مسکراہٹ کا گمان ہوتا تھا——
پہلا افسانہ دینے کے بعد کرشن چندر اوّل تو ہر روز ورنہ دوسرے دن لازماً دفتر میں آجاتا تھا ایک روز میں نے پوچھا——
"کرشن جی! ایک بات تو بتایئے"——
"کہو میرزا!"——
آپ کرشن چندر ہیں اور ایک کرشن مہاراج بھی تھے۔ آپ دونوں میں فرق کیا ہے؟"——
کرشن دو تین لمحے مسکراتا رہا۔ پھر بولا——
"دیکھو میرزا وہ کرشن مہاراج مکھن چراتے تھے اور میں مکھن نہیں چراتا۔ ہم دونوں میں شریف کون ہے تم خود سمجھ سکتے ہو"۔

کرشن کوئی بات بھی دل میں چھپا کر نہیں رکھتا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ہمیشہ وہی کچھ ہوتا تھا جو اس کے دل میں ہوتا تھا۔ اوپندر ناتھ اشک کو وہ پرلے درجے کا کنجوس سمجھتا تھا اور اس کا برملا اظہار بھی کرتا تھا ـــــ

میں نے ایک دن کہا ـــــ

"کرشن جی! یہ اوپندر ناتھ اشک کیا ہوا" ـــــ

"کیا ہوا!" کرشن میرا سوال سمجھ نہیں سکا ـــــ

"میں کہتا ہوں ہمارے دوستوں میں سب سے زیادہ قہقہے کون لگاتا ہے"؟ ـــــ

"اوپندر ناتھ اشک" کرشن نے فوراً جواب دیا ـــــ

"پھر اشک تخلص رکھنے کا مطلب؟" ـــــ

کرشن مسکرا کر بولا ـــــ

"میرزا سوال یہ نہیں ہے کہ وہ اشک کیوں ہے، بلکہ سوال یہ ہے کہ وہ اشک ریز کب ہوتا ہے!" ـــــ

"کب ہوتا ہے؟" میں نے پوچھا ـــــ

"اس وقت جب اس کی جیب میں سے ایک دھیلا بھی نکل کر زمین پر گر پڑے اور گم ہو جائے" ـــــ

پاس بیدی گوپال متل، کنھیا لال کپور اور چودھری نذیر احمد بیٹھے تھے۔ سب نے ایک پر زور قہقہہ لگایا اور دوسرے ہی دن یہ خبر اشک تک پہنچ گئی۔ اشک کا مزاج برہم ہو گیا ـــــ ادبِ لطیف کے دفتر میں آ گیا اس حالت میں کہ غصے سے کھول رہا تھا۔

"کہاں ہے وہ؟" ـــــ

"کون اشک جی!" میں نے پوچھا ـــــ

"وہ جو "سوڈی صراف" بنا پھرتا ہے" ـــــ

ظاہر ہے اشک کی مراد کس سے تھی ـــــ میں نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیا ـــــ

"کون جی!" ـــــ

اشک مجھ پر برسنے کی تیاری کر رہا تھا کہ کرشن آ گیا ـــــ اس نے سمجھ لیا کہ سچوایشن کیا ہے۔ بڑے ادب اور احترام سے کہنے لگا: ـــــ

"اشک جی آداب عرض" ـــــ

اشک جواب کیا دیتا۔ گرج کر بولا ـــــ

"میں کنجوس ہوں۔ دھیلا" ـــــ

"اشک جی! ـــــ یہ بات نہیں۔ نقصان پر ہر کوئی افسوس کرتا ہے ـــــ آنسو بہاتا ہے۔ اگر میری ایک دمڑی بھی گر جائے تو کیا ہو گا ـــــ آپ جانتے ہیں نا! میں رو پڑوں گا ـــــ آپ بھی رو پڑیں گے البتہ" ـــــ

"البتہ کیا؟" ـــــ

"غالب نے خوب کہا ہے ـــــ روئیے زار زار کیا، کیجیے ہائے ہائے کیوں" ـــــ

بہ ہزار دقت اشک مان گئے ——اور منٹل نے اپنے خوفناک لہجے میں یہ شعر پڑھا۔

لائے اس بت کو التجا کر کے
کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے

کرشن اشک کو نہ صرف بخیل گردانتا تھا بلکہ یہ بھی کہتا تھا کہ اشک پورا پورا بنیا ہے۔ ایک دمڑی بھی کسی کو معاف نہیں کرتا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ اشک نے ادبِ لطیف کے لیے چودھری نذیر احمد کو ایک افسانہ دیا۔ ظاہر ہے اس کا معاوضہ اشک کو ملنا چاہیے تھا مگر روایت یہ بیان کی گئی کہ چودھری صاحب نے افسانہ وصول کرنے اور اسے میز کی دراز میں بہ حفاظت تمام رکھنے کے بعد اشک کو اپنے کوٹ کی خالی جیب دکھادی اور مکتبہ اردو سے باہر چلے گئے ——

کرشن کہتا تھا کہ راوی کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ اشک پیسے لیے بغیر افسانہ کسی کو نہیں دیتا ——

راوی جو غالباً گوپال منٹل تھے، کہتے تھے۔ اب کے چودھری صاحب اشک کو جُل دے گئے ہیں ——

کرشن یہ بات ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ منٹل اور کرشن میں شرط لگ گئی۔ شرط شاید مٹھائی تھی یا بھاٹی دروازے کی کھیر——کرشن بھاٹی دروازے کی کھیر بڑے شوق سے کھاتا تھا ——

چودھری صاحب سے اس معاملے میں استفسار کیا گیا کیونکہ وہی "اتھارٹی" کی حیثیت رکھتے تھے۔ انھوں نے اس وقت بھی کوٹ کی خالی جیب دکھادی ——

"وہ مارا" کرشن نے نعرہ مارا ——

منٹل بولے:——

"نہ صاحب! یہ بات نہیں ہے ——چودھری صاحب نے کہا ہے۔ میری جیب خالی تھی میں کیا دیتا" ——

"نہیں منٹل! ——چودھری صاحب کا مطلب ہے —— میں نے اشک کو معاوضہ دے کر جیب خالی کر لی ہے" ——

فیصلہ نہ ہو سکا اور "اتھارٹی" نے دخل دینا مناسب نہ سمجھا ——

کرشن سے میری آخری ملاقات نئی دہلی میں ہوئی تھی ——

ڈاکٹر تارا چند کی دعوت پر پاکستان کے کچھ اہلِ قلم اُس زمانے کے مرکزی وزیرِ تعلیم جناب ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی زیرِ قیادت نئی دہلی پہنچے تھے۔ وفد میں زیڈ۔ اے بخاری۔ شوکت تھانوی، ابنِ انشا، ابراہیم جلیس، حمایت علی شاعر——حبیب جالب۔ شاہد احمد دہلوی کے علاوہ اور بھی کئی ادبا شامل تھے۔ لاہور سے صرف میں گیا تھا ——

تقریبات کے بعد انتظامیہ کی طرف سے مہمانوں کو فلم "مغلِ اعظم" دکھائی گئی —— ہم لوگ سینما کی گیلری سے باہر نکلنے ہی والے تھے کہ کرشن نے مجھے، ابنِ انشا، ابراہیم جلیس، شاہد احمد دہلوی اور دو تین دوستوں سے کہا ——

"آپ سب لوگ نیچے میرے ساتھ کھانا کھائیں گے" ——

"نہیں آپ ہمارے ساتھ ہوٹل میں چلیں" —— ابنِ انشا نے کہا ——

"انشا جی بے خبری کی بات مت کرو —— مانا کہ آپ انشائے بے خبر نہیں —— کرشن کا اشارہ خواجہ غلام غوث خاں بے خبر کی تصنیف "انشائے بے خبر" کی طرف تھا —— اس پر خوب قہقہہ پڑا ——

میں اُس وقت سینما کی چھت پر جنگلے سے پشت لگائے کھڑا تھا۔ کرشن نے مجھے دیکھا تو بولا ——

" میرزا چھلانگ مت لگاؤ۔ صحرا نیچے نہیں ہے — اُفق کے پار ہے "——

کرشن نے میری صحرانوردی پر چوٹ کی تھی مگر اس انداز میں کہ مجھے خطرے سے خبردار بھی کر دیا تھا ——

میں جنگلے سے الگ ہو گیا ——

آج سوچتا ہوں کرشن نے کہا تھا صحرا افق کے پار ہے —— اب میں کیسے اُس سے پوچھوں ؟——

"کرشن! صحرا تو میرا افق کے پار ہے۔ پھر تم کیوں ادھر چلے گئے ہو۔ میرے کرشن! تمھارا تو سب کچھ یہیں تھا —— سینما کے آس پاس۔ سینما کے نیچے انسانوں کی آبادی میں　تمھارا واسطہ تو انسانی زندگی سے تھا —— انسانی زندگی کے خوبصورت پہلوؤں سے —— انسانی زندگی کے بدصورت پہلوؤں سے —— تمھیں اُدھر جانے کی کیا ضرورت تھی —— جاتا تو میں جاتا —— تم کیوں چلے گئے۔ بولو کرشن! تم کیوں اُفق کے پار چلے گئے ہو —— تمھارا اُدھر کیا کام ؟ کرشن! —— کیا تم میرے سوال کا جواب نہیں دو گے !"——

"کرشن! تم بہت مدت پہلے دریائے جہلم میں ایک ناؤ پر بیٹھ کر آئے تھے —— تم نے ہمیں کیا کچھ نہیں دیا تھا۔ تم نے اپنے دل و دماغ کی خوبصورتیوں سے زندگی کو کس قدر خوبصورت بنا دیا تھا —— صبح کے وقت شبنم میں نہائے ہوئے سفید گلاب جیسا —— مگر آج تم اس ناؤ میں بیٹھ کر اس سمندر کے بیکراں پانیوں میں اُتر گئے ہو جہاں تاریکی ہی تاریکی ہے۔ جس کا کوئی کنارہ نہیں، کوئی ساحل نہیں ——

اے گہرے پانیوں کے مسافر! تجھے میرا آخری سلام! ——

غدّار

میں صرف تمھارا اور تمھارے ایسے لوگوں ہی کا غدار نہیں ہوں —
میں تو ہر اُس آدمی، ہر اُس خیال اور ہر اُس عقیدے کا غدار
ہوں جو نہ صرف ہندوستان اور پاکستان بلکہ کسی بھی دو ملکوں کے
درمیان جنگ چاہتا ہے ——
میں غدّار ہوں نفرت کا، جنگ کا اور بربادی کا —— اور وفادار
ہوں قوموں کے درمیان محبت کا —— وفا کا —— پیار کا —— میں تو وفادار
ہوں بہنوں کی عصمت کا اور محبوبوں کے پیار کا اور دشمن ہوں عورتوں کی
بوٹی کا، محبت کے قاتلوں کا اور تمھارے ایسے منافع خور سوداگروں کا جو اسٹاک
ایکسچینج پر غریبوں کی قبریں بیچتے پھیرتے ہیں ——

—— کرشن چندر

قدوس صہبائی

کرشن چندر۔ چند یادیں

کرشن چندر مرگیا۔ لیکن وہ کیسے مرسکتا ہے، وہ ایک تیزگام مسافر تھا جس نے منزل کو پالیا۔ بھٹکنے والے بھٹکتے رہیں۔ ایسی ایسی باتیں سوچ کر بھی میں اُس کی موت کے خیال سے مفاہمت نہیں کرسکتا۔ آٹھ دس سال میں نے اُس کے ساتھ گزارے ہیں کبھی بہت قریب رہ کر، کبھی دور ادور —— ہزار ہا یادیں اُس کی شخصیت، اُس کی انسانیت، انسانوں سے محبت، اُس کے فن، اس کی شرافت اور اُس کے خلوص کی آج بھی میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ اگر لکھ سکوں تو خدا جانے ختم بھی کرسکوں یا نہیں۔ کچھ نہ کچھ لکھنا ضرور چاہتا ہوں حالات نے ساتھ دیا تو لکھتا رہوں گا، کیونکہ ۶۶۔ ۶۷ سال کی عمر کو پہنچ چکا ہوں۔ جسمانی حوادث نے قویٰ مضمحل کردیے ہیں۔ ہمت ہار چکا ہوں —— ایک عظیم فن کار، ایک ہمدرد بنی نوعِ انسان کے ایک مخلص اور بے ریا ساتھی کی زندگی ایسی تو نہیں ہوسکتی کہ چند صفحوں میں اس کا احاطہ کرلیا جائے۔ یادوں کا یہ ہجوم اتنا بڑا ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کس بات کو لکھوں، کس کو نظر انداز کردوں۔ جستہ جستہ کچھ اشارے بھی شاید اس کی عظمت کا ثبوت دے سکیں —— میں ۱۹۳۶ء سے کرشن چندر کا نام سن رہا تھا، پھر "ادب لطیف" میں اُس کے دو چار افسانے پڑھے۔ اس وقت میں کلکتے کے روزنامہ "ہند" کا ایڈیٹر تھا۔ ۱۹۴۲-۴۳ء میں دہلی نے کھینچ بلایا اور ۱۹۴۳ء میں بمبئی آگیا۔ بمبئی میری مادرِ علم ہے کرشن چندر اس وقت پونا میں ڈبلیو زیڈ احمد کی فلم کمپنی کا اسٹوری اور اسکرپٹ رائٹر تھا۔ میں ہفت روزہ نظام بمبئی کا مدیر تھا۔ چنانچہ میں نے کرشن سے خط وکتابت کا سلسلہ شروع کیا۔ میں اُسے نظام میں لکھنے کی دعوت دیتا اور وہ اکثر عذر کردیتا۔ ہاں دو چار مہینے میں کوئی افسانہ بھیج دیتا، ایک بار میں نے توجہ نہ کرنے کی شکایت کی تو اُس نے ایک خط میں (یہ اوریجنل خط اتفاق سے اب تک میرے پاس محفوظ ہے) لکھا کہ:

"—— خط کا جواب دیر سے دے رہا ہوں، معافی چاہتا ہوں۔ یہاں آج کل پلیگ زوروں پر ہے میں نے پلیگ کا ٹیکا لگا لیا تھا۔ چار پانچ روز بخار میں پڑا رہا۔ سوچ رہا تھا کہ خط کے ہمراہ اپنا افسانہ بھی بھیج دوں۔ لیکن افسانہ ابھی تک مکمل نہیں ہوا پانچ چھ صفحے لکھے رکھے ہیں۔ بالعموم یوں نہیں ہوتا ایک ہی نشست میں افسانہ لکھ ڈالتا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے یہ افسانہ غیر مختتم ہی رہے گا —— رہا معاوضہ —— تو معاوضہ تو کافی لیتا ہوں یہ افسانے کا معاوضہ کم سے کم پچیس ہے لیکن محبت اور رفاقت کا سوال ہو تو افسانہ بلا معاوضہ بھی بھیج دیتا ہوں۔ تجارت مقصد نہیں۔ مگر یہ بات ذہن میں رکھیں کہ سال میں دو تین افسانوں سے زیادہ آپ کی نذر نہیں کرسکتا"——

میں اپنے اخبار کا ایک افسانہ نمبر شایع کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔ میں نے کرشن سے افسانے کے ساتھ اُس کی زندگی کا خاکہ اور تصانیف کی تفصیل مانگی۔ بڑی مستعدی اور محبت سے اُس نے جواب دیا۔ اپنی دس بارہ تصانیف کے نام لکھے اور پوچھا کہ "—— آپ افسانہ نمبر کب شایع کر رہے ہیں۔ دیکھیے میں پوری کوشش کروں گا کہ اس میں شریک ہو سکوں۔ میرے لایق کوئی اور خدمت ہو تو لکھیے —— جواب کا انتظار رہے گا"——

کچھ عرصے کے بعد کرشن چندر پونا سے بمبئی ٹاکیز میں بمبئی آ گیا۔ وہ ملاڈ میں رہتا تھا۔ بمبئی میں اُس کی آمد کے بعد کرشن سے روز ہی ملاقات ہونے لگی۔ سجاد ظہیر کا مکان سارے ادیبوں کا مرکز تھا۔ بلراج ساہنی بھی اُس وقت بمبئی میں موجود تھے۔ کبھی کبھی ڈاکٹر ملک راج آنند بھی آتے تھے، پھر جوش ملیح آبادی بھی آ گئے۔ کیفی اعظمی اور مجروح سلطان پوری بھی، مرزا اشفاق بیگ، محمد مہدی، مہندر ناتھ، وشوامتر عادل، نیاز حیدر، احمد علی خاں، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور اور صفِ اول کے اور بھی بہت سے ترقی پسندوں کا مجمع رہنے لگا۔ ساحر، علی سردار جعفری، سبط حسن، ساغر نظامی اور سجاد ظہیر وہاں پہلے سے موجود تھے —— میں گرانٹ روڈ پر وسط شہر میں رہتا تھا۔ تھوڑے ہی فاصلے پر جے جے ہسپتال کے مقابل نظام کا آفس تھا۔ پھر تو یہ معمول رہنے لگا کہ اکثر نظام کے آفس میں، کبھی کسی ریستوران میں، کبھی سجاد ظہیر کے مکان پر، کبھی ہفت روزہ قومی جنگ کے دفتر میں ترقی پسندوں میں سے دو چار، دس ادیب ہر وقت جمع رہتے، ادبی مباحث پر گفتگو کرتے، لڑتے جھگڑتے اور ترقی پسندی پر فخر کرتے۔ یہ ایسی بھرپور ادبی زندگی تھی کہ بمبئی کے بعد میں اسے دیکھنے کو ترس گیا۔

ایک بار بمبئی میں شدید قسم کے ہندو مسلم فساد ہو رہے تھے۔ بمبئی تھا ہی فسادات کا شہر۔ کبھی ہندو مسلم فساد، کبھی مزدور اور سرمایہ دار کا فساد، کبھی شیعہ سنّی جھگڑا، کبھی طلبہ کی تحریک اور کبھی خواتین کے جلوس پر ویسا ہی لاٹھی چارج، جیسا اب ہم کبھی کبھی پاکستان میں بھی دیکھ لیتے ہیں —— یہ وہ زمانہ تھا جب برطانیہ کے شہنشاہی اقتدار کا سایہ ڈھل کر ہندوستان کے عروس البلاد بمبئی کی سڑکوں اور بلند و بالا عمارتوں پر رینگ رہا تھا —— لیکن بمبئی کے باشندے ایسے فسادات سے متاثر ہونے کے باوجود ڈرتے نہ تھے۔ یہ اُن کی عادتِ ثانیہ بن چکی تھی۔ بس تھوڑی سی ذاتی حفاظت اور احتیاط شرط تھی۔ میں بمبئی کا قدیم باسی تھا۔ سالہا سال گزار چکا تھا، میری ہی طرح سجاد ظہیر، علی سردار جعفری، سلطانہ، سبط حسن، کرشن چندر، مہندر ناتھ، بلراج ساہنی، وشوامتر عادل، ساحر لدھیانوی، حمید اختر، ابراہیم جلیس، نیاز حیدر، احمد علی خاں، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور اور بہت سے ترقی پسند ساتھیوں کا ٹھکانا بمبئی بن چکا تھا ——

بس ایسے ہی فسادات کے زمانے میں، کرشن چندر، ساحر، حمید اختر، وشوامتر عادل، نیاز حیدر، میں اور ایک دو اور ساتھی بمبئی کے اسلامی علاقے بھنڈی بازار کے ایک ریسٹوران میں بیٹھے۔ اس ریسٹوران کے مشہورِ زمانہ گائے کے گوشت کے کباب کھا رہے تھے —— سارے ترقی پسند ہندو اور مسلمان ادیب اور شاعر اس ریسٹوران میں گائے کے گوشت کے کباب کھانے آتے رہتے تھے۔

کرشن چندر فلمی دنیا کے لکھنے والوں میں ممتاز ترین مقام حاصل کر چکے تھے۔ ساحر اور حمید اختر فلمی کمپنیوں کے چکر کاٹ رہے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ ترقی پسند ادبی تحریک کے لیے جوش اور سرگرمی سے کام کر رہے تھے۔ میں دو تین سال سے ہفت روزہ نظام بمبئی کی ادارت کر رہا تھا۔ نظام ترقی پسندوں اور ترقی پسند ادبی تحریک کا نقیب خاص اور ترجمان تھا۔ بہت

ہی ڈھیلی ڈھالی ادبی گپ شپ اور کباب خوری ہو رہی تھی۔ ساحر لدھیانوی اپنی بقراطیت جتا رہا تھا۔ وہ ادب کی قسمیں گنوا رہا تھا دو تین قسموں میں اُس نے ایک نئی قسم کا اضافہ کیا اور اُسے اُس ادیب کے نام سے معنون کیا جو اُس دور میں بقول مرزا ادیب افسانوں میں تاریخ لکھا کرتا تھا (میں اُس ادیب دوست کا نام اس لیے لکھنا مناسب نہیں سمجھتا کہ وہ اب مرحوم ہو چکا ہے) ادب کی اس قسم کو ترقی پسندوں نے اب تک نظر انداز کر رکھا تھا۔ ساحر کہہ رہا تھا یہ تیسری قسم ہے —— "ادب برائے شہرت" —— کرشن چندر نے اس پر گرہ لگائی —— "ادب برائے شکم" —— "کہو بھائی"۔

ہم سب قہقہے لگاتے رہے اور نیچے سڑکوں اور گلیوں میں فساد کی گونج کبھی کبھی سنائی دیتی رہی کیونکہ جب اس اسلامی علاقے میں ہندو آکر پھنس جاتے تو وہ خنجر قاتل کی پذیرائی سے بچ نہ سکتے تھے بالکل اُسی طرح جس طرح کہ مسلمان فساد زدہ ہندو علاقوں سے بچ کر نہ نکل سکتے تھے۔ ہر آدھ گھنٹے، پندرہ منٹ کے بعد جب سڑک پر کچھ غیر معمولی قسم کا شور سا مچتا تو ہم سمجھ جاتے کہ کوئی نہ کوئی فساد کا شکار ہو گیا ہے۔

ہماری بحث کا کوئی سر پیر تو تھا ہی نہیں۔ پلٹا کھایا تو شاعروں کی خیر نہ رہی۔ ن۔ م۔ راشد تنقید کا ہدف تھا۔ اسے عظیم رجعت پسند کہا جا رہا تھا اور ایک نئے نئے ترقی پسند شاعر، مجروح سلطان پوری کی مدح و ستائش ہو رہی تھی، کرشن چندر خاموش تھا، آنجہانی مہندر ناتھ (کرشن چندر کا بھائی) مجروح کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا رہا تھا۔ نیاز حیدر مجھے الزام دے رہا تھا کہ "مجروح کو قدوس صہبائی نے "نظام" میں چھاپ چھاپ کر آسمان پر چڑھایا اور ترقی پسندی کا لیبل لگا دیا ہے، ورنہ وہ کیا ہے بس غزل کہتا ہے اور گاتا ہے ——"

میں خفیف ہو رہا تھا اور بحث کے موضوع کو بدلنا چاہتا تھا۔ اس لیے بڑی جد و جہد کے بعد پھر نثری ادب کی جانب رُخ موڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے افسانے کی داخلی اور خارجی ہیئت پر الٹی سیدھی باتیں کہنی شروع کر دیں۔ کرشن چندر مسکراتا رہا کیونکہ میری گفتگو میں کرشن چندر کے رپورتاژ "پودے" کا بھی سرسری سا تذکرہ آگیا تھا۔ میری بات کاٹ کر کرشن چندر نے کہا —— "بھئی تم بھی "پودے" پر تنقید کر رہے ہو حالانکہ اس میں تمھارا بھی تذکرہ ہے" —— میں کچھ کھسیانا سا ہو گیا اور صرف یہ کہہ سکا —— "ہاں کرشن جی ہے تو سہی مگر ......"

کرشن نے فوراً جواب دیا —— "مگر! کیا یار، شاید تمھیں یہ شکایت ہوگی کہ اُس میں تمھاری افسانہ نویسی کے بارے میں زیادہ نہیں لکھا گیا۔ تم نے حیدر آباد کانفرنس میں افسانہ پڑھا ہی نہیں حالانکہ میں تم کو مجبور کر رہا تھا" —— وشوامتر عادل نے کرشن کی بات کاٹ دی —— "افسانہ نہیں پڑھا تو کیا ہوا، کرشن تم اپنے رپورتاژ پر نظر ثانی کرو تم نے صہبائی کا افسانہ ردِ عمل ضرور سُنا اور پڑھا ہے —" مگر کرشن نے وشوامتر کی بات ان سنی کرتے ہوئے نئی بات شروع کر دی —— "بھائی وشوامتر قدوس نے ترقی پسند ادب کی ترویج و اشاعت میں نئی روح پھونک دی ہے۔ جعفری (علی سردار جعفری) اور بنّے بھائی (سجاد ظہیر) نے قدوس کو نظام کی ادارت کے لیے بلوا کر نئی زندگی بخشی ہے —" پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہا —— "مگر بھائی قدوس تم اگر افسانے لکھنا ہی چاہتے ہو تو اس زندگی سے (سڑک کی جانب اشارہ کرتے ہوئے) اور قریب ہو جاؤ ——"

میں نے وعدہ کیا کہ میں کوشش کروں گا۔ ہندوستان میں وہ زمانہ ترقی پسند ادبی تحریک کے ہمہ گیر عروج کا زمانہ تھا۔ بنّے بھائی نے بڑے منظم پیمانے پر تحریک کو آگے بڑھانے کا پروگرام بنایا تھا۔ بمبئی کے ویکلی "نظام" کو تحریک کا ترجمان بنانے کا

انتظامیہ سے معاہدہ ہو گیا تھا اور مجھے دہلی سے بمبئی بلوا کر نظام کی ادارت سونپ دی گئی تھی۔ میں نے پورے خلوص اور جانفشانی سے نظام کو تحریک کا ترجمان بنانے کے لیے کام کیا اور بڑی حد تک کامیاب رہا۔ چونکہ بمبئی ترقی پسند ادبی تحریک کا مرکز بن چکا تھا اور اکثر ممتاز ترقی پسند ادیب اور شاعر بمبئی میں یا تو فلمی زندگی سے وابستہ ہو کر وہاں آ چکے تھے۔ یا دوسرے علمی ادبی میدانوں میں کام کر رہے تھے۔ سارے نام مجھے یاد نہیں، کیونکہ یہ سطریں میں محض ذہنی یادداشت کی بنیاد پر قلم برداشتہ لکھ رہا ہوں، مگر جو یارانِ شعر و ادب اُس وقت بمبئی میں موجود تھے، اُن میں، جوش ملیح آبادی، کرشن چندر، بلراج ساہنی، ساحر لدھیانوی، ابراہیم جلیس، سبط حسن، وشوامتر عادل، نہندر ناتھ، علی سردار جعفری، ظ۔ انصاری، خواجہ احمد عباس، ذوالفقار بخاری، سجاد ظہیر، نیاز حیدر، محمد مہدی، احمد علی خاں، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، اوپندر ناتھ اشک، مرزا اشفاق بیگ کے نام اب تک مجھے یاد ہیں۔ ہندوستان کے دوسرے ادیب و شاعر بھی اکثر و بیشتر بمبئی کے دورے کرتے رہتے تھے۔ ان میں پروفیسر فراق گورکھپوری، احتشام حسین، قاضی عبدالغفار، وامق مجتبیٰ، احسن علی خاں، صہبا لکھنوی، سکندر علی وجد، مسلم ضیائی اور بہت سے دوسرے جب بھی بمبئی آتے تو انجمن ترقی پسند مصنفین کے اجلاسوں میں ضرور شریک ہوتے۔ یہ ہفت۔ وزہ اجلاس بڑی پابندی کے ساتھ سجاد ظہیر کے مکان، واقع مالا بار ہل پر منعقد ہوتے تھے۔ مجھے یاد ہے کرشن چندر، سردار جعفری، سبط حسن اور سجاد ظہیر ہر اجلاس پر چھائے رہتے تھے۔

اسی زمانے کے لگ بھگ کرشن چندر کا رپورتاژ "پودے" شایع ہوا تھا۔ سب سے پہلے نظام اور انجمن کے ماہ نامے "نیا ادب" نے اسے شایع کیا۔ یہ رپورتاژ، حیدرآباد دکن میں منعقد ہونے والی ایک یادگار ترقی پسند کانفرنس پر لکھا گیا تھا جس میں بمبئی سے میں اور تقریباً بیس ترقی پسند شاعر اور ادیب شریک ہوئے تھے۔ بمبئی کے علاوہ دوسرے علاقوں سے بھی متعدد ادیب حیدرآباد کانفرنس میں شامل ہوئے تھے جن میں سے مولانا حسرت موہانیؔ، قاضی عبدالغفار، احمد مجتبیٰ وامق کے نام مجھے یاد ہیں۔

ایک دلچسپ واقعہ میں اب تک نہیں بھولا ہوں۔ غالباً کرشن چندر یا سجاد ظہیر نے ایک سیشن میں تجویز پیش کی کہ۔ "ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کو عریاں جنسی شعر و ادب کی تخلیق سے گریز کرنا چاہیے"۔۔۔۔۔۔ کانفرنس کے بیشتر شرکا اس تجویز کے حامی تھے۔ سب کی توقع کے مطابق، مولانا حسرت موہانی جب تجویز پر بولنے کے لیے آئے تو ان کا زبردست خیر مقدم کیا گیا۔۔۔ مگر سب کی توقع کے بالکل خلاف، مولانا نے تجویز کی بڑی شدت سے مخالفت کی، سب حیران اور خاموش مولانا کی تقریر سن رہے تھے۔ آدھ گھنٹے تک وہ عریانی کے حق میں دلائل دیتے رہے کسی کو انھیں ٹوکنے یا اُن کی تقریر کے دوران اعتراض کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔۔ مہدی اور احمد عباس مولانا کی مخالفت کرنا چاہتے تھے۔ لیکن قاضی عبدالغفار اور غالباً جوش ملیح آبادی جیسے سینئر ترقی پسندوں نے مولانا کی بھرپور حمایت کی۔ اور ان دونوں کی تقریروں کے بعد تحریک کے مجوز نے یہ تجویز واپس لے لی۔

مجھے یاد تھا کہ کرشن چندر نے مجھے زندگی سے اور زیادہ۔۔۔۔ اور زیادہ قریب آنے کے لیے کہا تھا، ایک موقع پر کچھ ایسی ہی گپ شپ ہو رہی تھی۔ سردار جعفری، نہندر ناتھ اور کرشن چندر افسانے پر اظہار خیال کر رہے تھے۔ میں نے کرشن کو یاد دلایا کہ میں نے ایک افسانہ "سات سمندر پار" لکھا ہے اور اُن تمام لوازم کو مدنظر رکھا ہے جو تم مجھے اختیار کرنے کو کہتے رہے ہو۔ میں نے کہا یہ افسانہ میں انجمن کے اگلے اجلاس میں سناؤں گا اور تمھاری رائے کا منتظر رہوں گا۔ حیدرآباد کانفرنس سے واپس آنے کے چند ماہ بعد میں نے یہ افسانہ لکھا تھا اور اس میں رومان پسندی کو ثانوی حیثیت دی تھی۔ میں نے کرشن سے یہی بات کہی۔ اور اس نے

کہا، مجھے افسانہ سناؤ تو کہوں ـــــ میں نے کہا وہ تو میں اجلاس میں سناؤں گا، لیکن خود تم نے "پلو دے" میں ایک رومان پسند انقلابی کا کردار زیادہ اُجاگر کیا ہے۔ اب تم شہرت کے پر لگا کر اُڑ رہے ہو کس میں ہمت ہے کہ تم پر تنقید کر سکے۔ کرشن حسب عادت ہنستا رہا۔ اُس نے کہا، "تم تنقید کر رہے ہو اس لیے یہ بات تو غلط ہو گئی کہ مجھ پر کوئی تنقید نہیں کر سکتا۔

میں نے بڑی کاوش اور فکر کے ساتھ اس افسانے "سات سمندر پار" پر بیسیوں بار نظر ثانی کی اور پورے ایک ہفتے چھ چھ سات سات گھنٹے مصروف رہ کر اُسے اگلے اجلاس میں سنانے کے لیے تیار کر لیا، جب یہ افسانہ انجمن کے اجلاس میں پڑھا گیا تو ڈاکٹر اشرف اور کرشن چندر نے اس کی بہت تعریف کی اور اجلاس ختم ہونے کے بعد کرشن نے مجھ سے کہا ـــــ

"قدوس تم بڑے ضدی ہو، میرے ریمارکس کو جھٹلانے کے لیے تم نے یہ خوبصورت افسانہ لکھا ہے اگر تم اسی معیار کے افسانوں کا مجموعہ مرتب کر لو تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ اُس مجموعے پر مقدمہ لکھوں گا" ـــــ

لیکن مجھے افسانوں کا مجموعہ مرتب کرتے کرتے دو برس لگ گئے اور کرشن چندر نے وعدے کی پاسداری میں پھر اُس پر مقدمہ لکھا ـــــ

کرشن چندر نے میرے افسانوی مجموعے پر جو مقدمہ لکھا وہ اب تک کرشن کی تحریر میں اوریجنل میرے پاس محفوظ ہے اور جب بھی حالات نے اجازت دی تو میرے افسانوی مجموعے کے ساتھ یہ مقدمہ بھی شایع ہو جائے گا۔ یہ زمانہ برصغیر پاک و ہند کی آزادی سے قربت کا زمانہ تھا۔ برطانوی ملوکیت ہندوستان میں قدم جمائے رکھنے اور آزادی کو پیچھے ڈھکیلنے کے لیے شدید جدوجہد کر رہی تھی۔ روزانہ کوئی نہ کوئی جھگڑا، فساد یا ہنگامہ ہوتا رہتا تھا۔ لیکن اسی ہنگامی حالت میں ہندوستان اور پاکستان آزاد ہو گئے۔ ترک وطن کرنے والے ہزاروں لاکھوں، مسلمان اور ہندوؤں کے قافلے ہندوستان سے پاکستان اور پاکستان سے ہندوستان آ رہے تھے۔ ٹرینیں روک لی جاتی تھیں اور مسافروں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ ڈالا جاتا تھا۔ میں نے اُس زمانے میں کرشن چندر کو جتنا مصیبت زدہ دیکھا اُس کا اظہار الفاظ میں نہیں ہو سکتا۔ اس زمانے میں وہ جب بھی گفتگو کرتا تو اس کا موضوع اُن ہزاروں لاکھوں انسانوں کے قتلِ عام پر المیہ تاثرات کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ اسی زمانے میں کرشن چندر نے "پشاور ایکسپریس" لکھ کر افسانوی ادب کو حیاتِ جاوداں بخشی ـــــ

کرشن چندر، بڑی سادگی، محبت اور خلوص کے ساتھ ہر دوست اور ادیب سے گفتگو کرتا تھا جو نئے افسانہ نگار اور ادیب اُس سے مشورہ لیتے تو وہ اُن کی بہت حوصلہ افزائی کرتا اور انھیں حقیقت نگاری، ترقی پسندی اور رجعت پسندی کا فرق سمجھاتا۔ وہ ہر ادیب اور شاعر سے ایک بات ضرور کہتا کہ کسانوں، مزدوروں اور نچلے متوسط طبقے کے کروڑوں عوام کے مسائل دیکھو، انھیں سمجھو، اور اُن سے ملو، پھر لکھو ـــ وہ خود بھی ایسا ہی کرتا تھا ـــ بمبئی کے بہت سے مزدور لیڈروں اور ٹریڈ یونین کے ورکروں سے اس کی دوستی تھی۔ یہ لوگ کرشن چندر سے اکثر ملتے رہتے تھے۔ وہ اُن سے اُن کے مسائل سمجھتا۔ دوسرے تیسرے روز کرشن چندر "نظام" کے آفس ضرور آتا۔ یا کہیں سے فون کر کے مجھے بلوا لیتا۔ "نظام" کے دفتر میں بھی چند ادیب یا شاعر اکثر موجود ہوتے اور وہ خواہش کرتے کہ انھیں بھی کرشن سے ملایا جائے۔ میں اکثر ذہین ادیبوں اور شاعروں کا کرشن چندر اور دوسرے ادیبوں سے رسمی تعارف بھی کرا دیتا اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ سب سے یگانگت اور محبت سے پیش آتا۔ جب کرشن چندر ملتا تو اس کے ساتھ دو چار اور لوگ بھی ہوتے، خصوصاً کوئی مزدور یا مزدور لیڈر اُن میں ضرور شامل ہوتا۔ میں کرشن چندر کے اس معمول سے واقف تھا اور

اکثر اُسے چھیڑا کرتا تھا کہ تمھیں ادیب یا افسانہ نگار کے بجائے مزدور لیڈر ہونا چاہیے تھا اور وہ اپنی روایتی خوش مزاجی سے اس کا جواب یہ دیتا کہ تم بھی اگر ایسا ہی کرو تو مجھ سے بھی بڑے افسانہ نگار بن سکتے ہو۔ مگر مجھے اُس کو چھیڑنے میں ہمیشہ ایک خوش گوار لطف محسوس ہوتا تھا۔ اس سے مجھے بڑا فائدہ پہنچتا تھا۔ کیونکہ اس چھیڑ چھاڑ کے نتیجے میں وہ ادب پر جو رائے بھی ظاہر کرتا وہ ترقی پسندی اور حقیقت نگاری کی جان ہوتی تھی، اس طرح میں بہت کچھ حاصل کرتا تھا۔

میں کرشن چندر سے کبھی کبھی کہا کرتا تھا کہ تمھاری کہانیوں میں ساری خوبصورتی، حقیقت پسندی اور فنی مہارت کے باوجود کردار نگاری بہت کمزور ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے تم اور جوش ملیح آبادی، ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہو۔ جوش صاحب ترقی پسند ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں کوئی کیوں جھٹلائے ــ لیکن میں نے جس حد تک جوش صاحب کو سمجھا ہے مجھے ایسا لگتا ہے کہ اُن کا ماضی انقلابی رہا ہوگا۔ انھوں نے شعر و ادب کو بہت کچھ دیا ہے۔ لیکن حقیقت میں وہ ایک بورژوا رومان پسند ہیں۔ ترقی پسندی کا تقاضا ہے کہ رومان پسندی ختم کی جائے اور صرف عوامی انقلاب پسندی کی راہ پر چلا جائے۔ اس مقصد کے لیے انھیں وہ تمام روابط منقطع کر دینے چاہئیں جو وہ قومی اور بین الاقوامی ردعمل کے خوف سے باقی رکھے ہوئے ہیں۔ اُس زمانے میں میری سوچ یہی تھی۔ جوانی کا زمانہ تھا۔ قویٰ بھی مضمحل نہ ہوئے تھے۔

کرشن چندر ایسی باتوں کا بُرا نہ مانتا تھا۔ وہ ایک عظیم فطرت شناس تھا اور میری ایسی تنقید کا راز سمجھتا تھا اور اسی لیے تنقید کے جواب میں وہ سب کچھ مجھے دے دیتا تھا جس کے لیے میں تنقید کرتا تھا۔ لیکن وہ باتوں کو بھولتا بھی نہیں تھا۔ اسی لیے وہ "پودے" پر اس تنقید کا ذکر کرنا نہ بھولا جو میں نے "سرائے کے باہر" پر کی تھی۔ یہ جستہ جستہ یادیں چھوٹے چھوٹے واقعات اور تاثرات کے بارے میں اتنی ہیں کہ میں ان سب کو اگر مربوط کرکے پیش کرنا چاہوں تو ایک ضخیم تصنیف کی شکل اختیار کر لیں گی اور مجھے ان کی ترتیب میں مہینے لگ جائیں گے۔

جس زمانے میں پاکستان کا قیام عمل میں آیا اُس وقت متحدہ ہندوستان کے ترقی پسند یہ نہ سوچ سکے کہ نئی ریاست میں جو ایک نئی فکری تخلیق تھی وہی مشترک ادبی اقدار باقی رہیں گی۔ جواب تک تھیں یا اُن میں ایک نیا انقلاب آجائے گا، اور افکار و اقدار بھی تقسیم ہو جائیں گی۔ قیام پاکستان کے ڈھائی سال بعد تک میں ہندوستان ہی میں مقیم رہا۔ ہفت روزہ "نظام" بمبئی کے مالک جو پاکستان کے ہی رہنے والے تھے، اگر نظام کو بمبئی سے لاہور نہ لے جاتے تو میں نہیں کہہ سکتا کہ میں ہندوستان ہی میں رہتا یا پاکستان آجاتا۔ نظام ۱۹۴۸ء کے آخر میں بمبئی سے لاہور منتقل ہوا مگر میں بمبئی اور بھوپال ہی میں ۱۹۴۹ء کے آخر تک رہا۔ ان دو تین سالوں کے عرصے میں ہندوستانی ادیب اپنی روایتی ترقی پسند راہوں پر گامزن رہے۔ شروع شروع میں پاکستانی ترقی پسندوں نے بھی یہی راہ اپنائی اور انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان نے جس کے سکریٹری اُس وقت ساحر لدھیانوی تھے۔ نومبر ۱۹۴۷ء میں پاکستانی ادیبوں شاعروں، صحافیوں اور رفن کاروں کی جانب سے ایک اعلان شایع کیا جس میں اس احساس کا اظہار کیا گیا کہ اگر اس وحشت و بربریت کا جو اس وقت ہندوستان اور پاکستان میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے قتل عام کی صورت اختیار کر چکی ہے اور بڑے پیمانے پر جبری تبادلۂ آبادی کا سبب بن گئی ہے۔ سدِّباب نہ کیا گیا تو قومی آزادی خطرے میں پڑ جائے گی اور ادب، آرٹ اور کلچر کے سرچشمے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خشک ہو جائیں گے۔ اس اعلان پر کم و بیش پاکستان کے سوا دیوں، دانشوروں، فن کاروں، صحافیوں اور شاعروں کے دستخط تھے جن میں فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، ابن انشا، حفیظ جالندھری، شورش

کاشمیری، ظہیر کاشمیری، باری علیگ، میرزا ادیب، ہاجرہ مسرور، فکر تونسوی، فارغ بخاری، رضا ہمدانی کے نام مجھے یاد ہیں۔ پاکستان کے ادیبوں نے یہ اعلان ہندوستانی ترقی پسند مصنفین کی اپیل کے جواب میں جاری کیا تھا۔

جہاں تک مجھے یاد ہے ہندوستان کی ترقی پسند مصنفین کی انجمن نے یہ اپیل کرشن چندر، سجاد ظہیر، سردار جعفری اور سبط حسن کی تجویز پر ہر پاکستانی ادیبوں سے کی تھی۔ کرشن چندر بڑی مستعدی اور خلوص کے ساتھ پاکستانی ادیبوں سے رابطہ قایم کیے ہوئے تھا۔ وہ اُس پُرآشوب زمانے میں بھی لاہور کا ایک چکر لگانا چاہتا تھا، لاہور اس کی تربیت گاہ اور مادرِ علم تھا۔ لاہور سے کرشن چندر کا لگاؤ غیر معمولی تھا۔ لاہور کے دوستوں کو وہ اُسی طرح یاد کرتا تھا جس طرح بھائی کو بھائی اور ماں باپ کو بچے یاد کرتے ہیں۔ دوستوں نے اُس کے لاہور جانے کے خیال کی مزاحمت کی اور حالات کی ناہمواری اور خطرناکی کی وجہ سے کرشن دل مسوس کر رہ گیا۔ اس اپیل کا خوش آیند اور مثبت نتیجہ یہ ضرور نکلا کہ پاکستانی ادیبوں نے بھی پاکستان میں عوامی ادب اور آرٹ کے ذریعے زندگی کی حقیقتوں کو بے نقاب کرنے، قومی زندگی میں رجعت پسند عناصر کی مخالفت کرنے، آزادیٔ اظہار وخیال کے لیے جد وجہد کرنے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ترقی پسند مصنفین اور ترقی پسند ادب کے حقوق کا تحفظ کرنے کا مسلک اختیار کیا۔ مجھے یاد ہے پاکستان کا شاید ہی کوئی قابلِ ذکر ادیب و فن کار باقی رہ گیا ہو جس نے اس اعلان پر دستخط نہ کیے ہوں — البتہ سعادت حسن منٹو نے اس پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ منٹو کے روایتی مزاج کی ایک جھلک تھی۔ کرشن چندر نے پہلے ہی ہم سب سے کہا تھا کہ سب پاکستانی ادیب ہماری اپیل کی حمایت کریں گے منٹو مخالفت کرے گا۔ وہ منٹو کو اچھی طرح جانتا تھا اور منٹو اُسے منہ پر بھی "منافق" کہا کرتا تھا۔ کرشن چندر ہنس ہنس کر منٹو سے بار بار اپنے اس خطاب کو سُننا چاہتا تھا، وہ کہتا تھا منٹو بڑا پیارا انسان، معصوم اور بہت عظیم ادیب ہے۔ لیکن بچوں کا سا ضدی مزاج رکھتا ہے —— وہ سچ ہی کہتا تھا منٹو نے کبھی ترقی پسندوں کی حمایت نہیں کی، وہ ہمیشہ یہی کہتا رہا کہ میں منافقت کو پسند کرکے "بھیڑ چال" نہیں چل سکتا۔ ہم کہتے تھے "منٹو جنسی مریض ہے" — مگر کرشن چندر کا کہنا تھا کہ "فسادات نے اُسے جنسی ادب پیدا کرنے پر مجبور کیا ہے۔ وہ حوادث وانقلاب اور آفات کے دور میں سماج کی برائیوں کو عوام کے جذبات ابھارنے کے لیے اجاگر نہیں کرنا چاہتا، بلکہ وہ اس دور میں قاری کے لیے ایک لمحہ آسودگی پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اُس کے جنسی افسانوں میں سے اکثر اس کی مثال ہیں"۔

مجھے تاریخ اور مہینہ یاد نہیں رہا۔ البتہ یہ ۱۹۴۹ء کی بات ہے — آزادی کے بعد سے ہی ہند اور پاکستان کی حکومتیں رجعت پسند متوسط طبقوں کے ہاتھ میں چلی گئی تھیں اور کانگریس اور مسلم لیگ دونوں ملکوں پر حکمرانی کر رہی تھیں۔ دونوں ملکوں میں سوشلزم اور ترقی پسند تحریکوں کی شدید مخالفت کی جا رہی تھی۔ ابتدائی دور کے متعلق پاکستان کے بارے میں مجھے علم نہیں۔ لیکن ہندوستان کی حکومت نے، ترقی پسند مصنفین کی اُس کانفرنس کے انعقاد پر پابندی عاید کر دی تھی، جو بمبئی میں منعقد کیے جانے کی تجویز تھی۔ ہندوستان کے موجودہ وزیر اعظم مرارجی ڈیسائی اُس وقت بمبئی کے وزیر اعلیٰ اور وزیر داخلہ تھے۔ مرارجی نے بمبئی کانفرنس کے مندوبین کے اجتماع کی بھی اجازت نہیں دی تھی۔ اس پابندی کی وجہ سے دوسرے صوبوں کے اکثر ڈیلی گیٹ اور سوویٹ یونین اور بعض یوروپی ملکوں کے نمایندے جو آنا چاہتے تھے نہ آ سکے۔ کیونکہ حکومتِ ہند نے ان ملکوں کو سرکاری طور پر مطلع کر دیا تھا کہ کوئی کانفرنس منعقد نہیں ہو رہی ہے۔ اس کے باوجود فرانس اور انگلستان کے بعض ادیب پہنچ گئے۔ منتظمین نے جلد جلد انتظامات کرکے یہ کانفرنس صوبہ بمبئی کے ایک چھوٹے سے شہر بھیمڑی میں منعقد کرنے کا اہتمام کر لیا۔ بمبئی سے سوا سو،

مندوب، شدید بارش کے دوران بھیگتے ہوئے لبوں میں شہرِ تھانہ کے راستے بھیمڑی پہنچے۔ اس زمانے میں دو درجن سے زیادہ ترقی پسند ادیب جیلوں میں بند تھے۔ جن میں بلراج ساہنی، علی سردار جعفری اور امر شیخ بھی شامل تھے۔ ہندوستان میں حکومت پر ترقی پسندوں کی مخالفت کا ایسا بھوت سوار تھا کہ کانفرنس کے موقع پر یوپی کی حکومت نے پریم چند آنجہانی کے جاری کردہ رسالے "ھنس" کی اشاعت پر پابندی عاید کر دی۔ حالانکہ "ھنس" محض اصلاح پسند غیر سیاسی جریدہ تھا۔

کرشن چندر بڑا صاف اور سلجھا ہوا انسان تھا۔ وہ سمجھ بوجھ سے کام لے کر کوئی قطعی قدم اٹھاتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ — "استبداد کے ذریعے حکومت، ہمارے کلچر کو جلا کر بھسم کر رہی ہے۔ لیکن بھیمڑی ہو یا کوئی گاؤں ہماری کانفرنس کے اجتماع میں ہم ہی تنہا ادب کی نمایندگی کر رہے ہیں —"

اس اجتماع میں اردو، ہندی، بنگالی، پنجابی اور سندھی ادب کی نمایندگی بھی کی گئی تھی۔ زبان کا مسئلہ سب سے اہم موضوع تھا۔ کانفرنس کے نئے منشور پر کرشن چندر کی تقریر اردو ادب کی جانب سے اور سوشیل جانا کی تقریر بنگالی ادب کی جانب سے، بہت پسند کی گئیں۔ عصمت چغتائی، مجلس استقبالیہ کی چیرمین تھیں، کانفرنس نے ایک مجلس صدارت منتخب کی جس کے ارکان، کرشن چندر، ڈاکٹر ملک راج آنند، سوشیل جانا اور رام بلاس شرما تھے۔ بیرونی ممالک سے کانفرنس کو جو پیغامات ملے، ان میں پاکستان کا پیغام بھی تھا، جن مصنفین، ادبا، اور علما نے کانفرنس کو پیغامات بھیجے، ان میں پال رابسن، جولیو کیوری، اراگان اور سین او کاسی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

کرشن چندر نے اپنے خطبۂ صدارت میں کہا: —

"ترقی پسند ادب نے ۱۹۴۷ء کے بعد فسادات کے خلاف، عوام پر تشدد اور استبداد اور اقتصادی جمہوریت کے علاوہ اقتصادی جمود و تعطل پر ایک قطعی اور مثبت فیصلہ کیا ہے اور ادیبوں نے عوام کے معیارِ زندگی کی برتری، جمہوریت اور سوشلزم کی زبردست جدوجہد کرنے کا عزم کر رکھا ہے —"

میرے قیام ہندوستان میں ترقی پسندوں کا یہ آخری اجتماع تھا جس میں مجھے شرکت کا موقع ملا کیونکہ اس کے کچھ روز بعد ہی میں پاکستان آ گیا۔ اسی زمانے کے لگ بھگ احسن علی خاں، حبیب فخری، صہبا لکھنوی، مولانا ارشد تھانوی، احمد علی خاں (رائیڈ ٹیرڈ وان) بھوپال اور دوسرے علاقوں کے بہت سے ترقی پسند پاکستان آ چکے تھے۔ کچھ عرصہ پہلے سجاد ظہیر، سبط حسن اور ڈاکٹر اشرف بھی پاکستان آ چکے تھے۔ یہ تینوں پاکستان میں ترقی پسند تحریک کے فروغ اور احیا کی کوششوں میں پاکستانی ادیبوں کو مدد دینے کے لیے آئے تھے لیکن ان کی کوششوں کو پاکستانی معاشرے اور حکومت نے گوارا نہ کیا — سجاد ظہیر اور سبط حسن، راولپنڈی سازش کیس میں ملوث کر دیے گئے۔ اس کیس میں فیض احمد فیض بھی ملزم تھے۔ ڈاکٹر اشرف بچ نکلے اور واپس ہندوستان چلے گئے۔ سجاد ظہیر کو بھی ہندوستان بھیج دیا گیا۔ سبط حسن پاکستان میں موجود ہیں اور علمی، ادبی مصروفیات میں وقت گزار رہے ہیں۔ پاکستان میں ترقی پسند مصنفین کو سیاسی جماعت قرار دے کر پابندی لگا دی گئی، لیکن اسی زمانے میں ہندوستان کے اندر بھی ترقی پسند ادبی تحریک کے خلاف سخت استبدادی اقدام کیے جا رہے تھے۔ بہت سے ادیب گرفتار کر لیے گئے تھے — بہت سے انڈر گراؤنڈ ہو چکے تھے اور بہت سے ہندوستان سے پاکستان یا دوسرے ملکوں میں جا چکے تھے۔

کرشن چندر، برصغیر میں ترقی پسند تحریک کے خلاف ان اقدامات سے بہت متاثر تھا اور بھیمڑی کی

کانفرنس میں اُس نے منشور کی حمایت میں جو تقریر کی اُس کا ادبی اور فن کارانہ حصہ تو میرے ذہن میں محفوظ نہیں۔ البتہ ہندوستان کو نئی نئی آزادی ملنے کے بارے میں اُس نے پوری صفائی کے ساتھ کہا تھا کہ۔

" یہ آزادی گورے اور کالے استحصال پسندوں کا ایک نامقدس معاہدہ ہے "

اس نے انڈونیشیا اور فلپائن کی آزادی کی تحریک کے بارے میں تشویش کا اظہار کیا تھا اور قطعی اُمید ظاہر کی تھی کہ بہت جلد یہ ملک بھی آزاد ہو جائیں گے۔

اس نے ترقی پسند ادیبوں کو " مخلصانہ " مشورہ دیا تھا کہ انھیں آزادیٔ اظہار، جمہوری حقوق، تعلیم اور کلچر کی حفاظت اور عوام کے معیار زندگی بلند کرنے کے لیے برابر قلمی جنگ کرنا چاہیے۔ وہ ہمیشہ اپنے دوستوں کو یاد دلایا کرتا تھا کہ ہندوستان کا حکمراں طبقہ بڑی خوبصورتی کے ساتھ وقت کے عظیم عوامی مسئلوں کو فکری اور نظریاتی شکلوں میں بدل کر عوام کو فریب دینا چاہتا ہے۔ اس کے بھٹو ادیب "ادب برائے ادب" کا نعرہ لگاتے ہیں اور حکمران ادیب کو انحطاط پسند ادب تخلیق کرنے کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں، وہ طبقاتی جدوجہد کو عوامی مفاد کے خلاف ثابت کرتے ہیں ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس طرح ادب اور ادیب زندگی سے کٹ کر بالکل غیر سیاسی راہ اور غلط فکر و نظر اختیار کر لیں تاکہ وہ عوام پر استبداد کے لیے مسلط رہ سکیں۔ وہ ہمیشہ یہی کہتا رہا کہ کسی قسم کا ادب، اُس وقت تک عظیم ادب نہیں ہو سکتا، جب تک اُس میں عوام کی حقیقی سماجی، معاشی اور مجلسی زندگی کا بلند مقصد پوشیدہ نہ ہو۔

بمبئی میں کرشن چندر کے ساتھ جو چند سال میں نے گزارے اس میں بیسیوں ہی چھوٹے بڑے واقعات پیش آئے جنھیں اُس کی موت کے بعد میں محفوظ کر لینا چاہتا ہوں۔ کہہ نہیں سکتا کہ زمانہ، حالات اور میری کمزور صحت اس کی اجازت دے گی یا نہیں ۔۔۔ لیکن میں اصرار کے ساتھ یہ بتانا چاہتا ہوں کہ پاکستان میں اب بھی کرشن چندر کے ایسے رفیق موجود ہیں جو یہ فریضہ مجھ سے بہتر طور پر انجام دے سکتے ہیں ۔۔۔

بعض ممتاز ادیب اگر توجہ کریں تو وہ یہ کام کرنے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں، خصوصاً فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، احمد علی خاں، ابراہیم جلیس، صہبا لکھنوی، حسن علی خاں، طفیل احمد، حمید اختر اور میرزا ادیب۔ ایسے ترقی پسند اکابرین، جو کرشن کی ذات اور اُس کے نظریۂ حیات سے آشنا ہیں۔ بہت سے دوسرے محترم ادیب جو کرشن سے بہت قریب تھے، افسوس کہ بچھڑ گئے ۔۔ ان میں ایوب کرمانی، باری علیگ اور شاہد احمد دہلوی بطور خاص قابل ذکر ہیں ۔۔۔

حسنِ ذات اور حسنِ کائنات کے شاعر

عالمتاب تشنہ کا اولین مجموعۂ کلام

موج موج تشنگی

(عنقریب شائع ہو رہا ہے)

اختر جمال

میرے بھائی — کرشن جی

"سولورا کے حسن کو دیکھ کر آنکھیں جھپک جاتی تھیں۔ چند لمحوں کے لیے تو یہ باور کرنا بھی مشکل تھا کہ کوئی عورت اس درجہ حسین ہو سکتی ہے۔ صاف ستھری جگمگاتی جلد جیسے اندر سے کرنیں پھوٹ رہی ہوں۔ لانبی لانبی سنہری پلکوں کے اندر بڑی بڑی حیران پتلیاں۔ کندن کی طرح چمکتی ہوئی اور شانوں تک لمبے سنہرے بال جیسے سر سے کمر تک پگھلا ہوا سونا بہہ رہا ہو اور آواز ایسی میٹھی جیسے گلے میں سروں کے بجائے شہد کی دھاروں والا ستار بج رہا ہو۔"——

یہ سولورا کرشن جی کی کہانی کا ایک کردار ہے۔ لیکن مجھے یوں لگتا ہے کہ یہ سولورا جیسے کرشن جی کی اپنی روح ہے، اور جب میں نے ان کی موت کی خبر سنی تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ سولورا مریخ سے اتر کر انھیں لینے آ گئی تھی——!

سولورا نے کرشن جی کو بتایا تھا کہ "ہمارے سائنس دانوں نے ایک ایسا خفیہ آلہ ایجاد کیا ہے، جس کی مدد سے زمین کے شاعروں، ادیبوں، سائنس دانوں، مفکروں اور سیاست دانوں کے دماغ اُن کی کھوپڑی سے نکال کر لے جاتے ہیں اور مریخ کے تہہ خانوں میں انھیں محفوظ کر لیتے ہیں، ان سے سارے راز اگلوا لیتے ہیں۔ آپ لوگ سمجھتے ہیں کہ فلاں شاعر ادیب یا سائنس داں مر گیا۔ اصل میں اس کی کھوپڑی خالی ہو جاتی ہے . . . . . . یہی وجہ ہے کہ میں ہندوستان کی چھ زبانیں جانتی ہوں"——

سولورا کو غالب، اقبال، ٹیگور، کے علاوہ میرا کے بھجن بھی پسند تھے۔ لیکن کرشن جی کوئی راز مریخ پر ساتھ نہیں لے گئے۔ ان کا قلم تو سب راز زمین پر ہی اُگل گیا تھا——!

سولورا شاید مریخ سے بہت پہلے ہی زمین پر آ چکی تھی اور راوی کے کنارے گندم اور مکی کے ہرے بھرے کھیتوں میں کام کرتی تھی۔ اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے موتیوں کی طرح چمکتے تھے——! اُس کے ہاتھوں میں مکی کے بھٹے ہوں گے جن میں سوندھی سوندھی خوشبو ہوگی دھرتی کی خوشبو——! اس نے کہا ہو گا——"لو—— یہ بھٹا کھاؤ دیکھو کیسا مزے دار نرم نرم دودھیا بھٹا ہے—— تم لاہور کے لیے بہت تڑپ رہے تھے—— اس بھٹے میں راوی کے پانی اور مٹی کی خوشبو ہے——! آؤ—— چلو میرے ساتھ——! یہ جسم تھک گیا ہے، اسے چھوڑ دو——! اس میں سے نکل کر آدمی اتنا ہلکا پھلکا ہو جاتا ہے، سب فاصلے سب دوریاں مٹ جاتی ہیں۔ آؤ ہم راوی کی سیر کریں—— ایک ننھی سی ناؤ میں جس کا سپید بادبان ہو——!"

کرشن جی کی پتلیاں چمکنے لگی ہوں گی ۔ انھوں نے جلدی سے اپنے مشینی دل کو جھٹکا دے کر الگ کیا ہوگا ——! اس لمحہ اُن کا جی تو چاہتا ہوگا کہ وہ سلمیٰ بھابی کو بتائیں کہ —— "دیکھو یہ سولوزا پچھلے جنم میں دیتی تھی ——!" (شکست کی ہیروئن) لیکن اس لمحہ لفظ ساتھ چھوڑ دیتے ہیں، اور خاموشی ہی زبان بن جاتی ہے ——!

کرشن جی جب اس ناؤ میں بیٹھے ہوں گے جس کا بادبان سفید ہوگا تو وہ ازلی اور ابدی سچائی کا راز جان گئے ہوں گے! جو وہ جاننا چاہتے تھے ——

"اس نے بھگوان سے پوچھا تم کیا ہو ——؟"

بھگوان نے سر جھکا کر انتہائی سادگی سے کہا —— "میں آدمی ہوں" ——

"تو کیا بھگوان آدمی ہوتا ہے ——؟ یعنی اتنا اونچا جتنا اونچا آدمی —— اتنا ہی نیچا جتنا آدمی —— اتنا ہی تنگ جتنا آدمی —— اتنا ہی بے کنار جتنا آدمی —— اتنا ہی سطحی جتنا آدمی —— اتنا ہی گہرا جتنا آدمی —— کیا یہ سچ ہے کہ بھگوان نے انسان کو اپنے عکس سے بنایا ہے ۔ کیا یہ سچ ہے کہ انسان نے اپنے عکس میں بھگوان کو دیکھا ہے ——؟"

"بھگوان تم نے مجھے صرف اتنا بتایا جتنا آدمی آج تک جان چکا ہے ۔ لیکن میں اس سے زیادہ جاننا چاہتا ہوں —— آج تو مجھے آخری سچائی بتا دو ——!" (دادر پل کے بچے)

موت نے انھیں آخری سچائی بتا دی ——! کاش آخری سچائی جان کر بھی وہ قلم اٹھا سکتے ——! اور کہانی لکھ سکتے ——! منٹو نے منوں مٹی کے نیچے یہ سوچا تھا کہ وہ بڑا افسانہ نگار ہے 'یا خدا ——! لیکن کرشن جی نے سر جھکا کر کہا ہوگا —— بھگوان تو نے انسان کی کہانی بہت خوبصورت لکھی ہے! —— انسان اگر خود اپنی کہانی لکھتا تو وہ اتنی خوبصورت نہ ہوتی ——! کہانی لکھنے والا ہی اچھی کہانی کی داد دے سکتا ہے ——! بھگوان کو وہ حمد اتنی پسند آئی ہوگی کہ انھوں نے سورگ کے سارے دروازے کھلوا دیے ہوں گے ۔ اور کرشن جی اپنے من پسند دروازے میں سے سولوزا کا ہاتھ پکڑے ہوئے اندر داخل ہو گئے ہوں گے!

کرشن جی بچوں کی سی معصومیت لیے حیران آنکھوں سے خدا کی ہر خوبصورت تخلیق کو دیکھتے تھے ۔ انھیں حسن سے پیار تھا اور سچائی کو وہ زندگی کا حسن سمجھتے تھے ۔ انھیں بڑی بھابی سے بھی محبت تھی اور سلمیٰ بھابی کی اور ان کی محبت تو رفاقت کی ایک خوبصورت مثال ہے ۔ انھیں اپنے بچوں سے بھی محبت تھی ۔ ماں باپ، بہن بھائی، دوستوں، ادیبوں، ساتھیوں، اور سب مظلوم اور مجبور انسانوں کی محبت ——! وہ دل، جو سمندر سے بھی گہرا تھا محبتوں کے کتنے خزانے اس میں دفن ہو گئے! —— مگر ایک محبت ایسی تھی جس کے لیے وہ بہت تڑپتے تھے —— اور وہ تھی شہر لاہور کی محبت! —— لاہور میرا لاہور! ——

"لاہور کیسا ہے؟ —— لاہور کا کیا حال ہے —— کتنے دن رہیں تم لاہور میں ——"

وہ لاہور سے آنے والوں کو ایسے رشک سے دیکھتے کہ اُن کا بس چلتا تو آنکھوں سے لاہور کی سڑکوں، گلیوں، مکانوں اور درختوں کی تصویریں حاصل کر لیتے —— بار بار لاہور کی باتیں سن کر اُن کا جی نہیں بھرتا تھا —— لاہور کے ادیبوں کا حال نام لے لے کر پوچھتے۔ کبھی کبھی تو میرا جی چاہتا کہ لاہور کی برائیاں کروں، اور بتاؤں کہ لاہور جاتی ہوں تو جی چاہتا ہے کہ سب ادیبوں سے ملوں ۔ مگر کسی سے نہیں مل پاتی ۔ آپ کے لاہور میں دنیا کے سب سے ظالم ٹیکسی والے بستے ہیں ۔ اسٹیشن پر اتر کر ہی آدمی کا رونے کو جی چاہتا ہے ۔ میلوں دھوپ میں چلتے رہیے ۔ ایک ایک رکشا اور ٹیکسی کو ہاتھ دکھایئے، مگر وہ یوں زن سے گزر جائیں گے، جیسے آپ انسان ہی نہیں!

اس شہر میں ہم آپ جیسے لوگ تو رہ ہی نہیں سکتے، بس بور ژوا ہی رہ سکتے ہیں! ـــــ مگر کرشن جی لاہور کے بارے میں ایسی محبت سے مجسم سوال بنتے کہ یہ کہنا پڑتا۔ لاہور بہت اچھا ہے ـ دارالخلافہ تو اسلام آباد ہے مگر پاکستان کا دل لاہور ہی ہے۔ بہت خوبصورت موسم ـ خوبصورت سڑکیں ـــــ سایہ دار درخت ـــــ اور لوگ! ـــــ اور سب لوگ آپ کو بہت یاد کرتے ہیں ـ طفیل بھائی، ندیم بھائی وغیرہ وغیرہ ـــ اور لاہور بہت پھیل گیا ہے ـ پھیلتا ہی جا رہا ہے ـ گل برگ کا ذکر ایسے کرتی کہ کرشن جی کو لگتا کہ کشمیر جنت نظیر اب لاہور کے سامنے ماند ہے ـــــ یہ سب باتیں کرشن جی کو خوش کرنے کے لیے تھیں۔ اس لیے کہ جب وہ لاہور کی اور لاہور کے لوگوں کی تعریف سنتے تو ان کا چہرہ کھل جاتا تھا، آنکھیں چمکنے لگتی تھیں ـ لاہور کی تعریف اُن کی تعریف تھی۔ اور اگر کبھی میں نے لاہور کی بُرائی کی ہوتی تو مجھے یقین ہے کرشن جی میرے سر پہ چپت رسید کرتے! ـــــ

سمندر جیسے دل والے آدمی کو وہی شہر پناہ دے سکتا تھا جس کے دل میں سمندر ہو! کرشن جی نے بمبئی کو اور بمبئی نے کرشن جی کو اپنا لیا ـ بمبئی میں دو سمندر ہیں ایک طرف پانی کا سمندر اور دوسری طرف انسانوں کا سمندر، اور یہ دونوں سمندر ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور ان میں گھرا ہوا انسان بھی اپنی ذات کو اتنا پھیلا لیتا ہے کہ سمندر بن جاتا ہے ـ کرشن جی نے ایک سمندر سے لکھنے کے لیے روشنائی لی اور دوسرے سمندر سے کہانیوں کے کردار ـــــ اور جیتے جاگتے انسانوں کی لازوال کہانیاں لکھیں! ـــــ

کرشن جی کو اپنے ماضی سے بہت پیار تھا ـ ماضی کا پیار ہی حال میں اعتماد اور مستقبل میں یقین پیدا کرتا ہے ـ جن لوگوں کو ماضی سے پیار نہیں ہوتا انھیں حال میں دلچسپی نہیں ہوتی اور مستقبل پر اعتماد نہیں ہوتا ـــ آدمی اگر ایک درخت ہے تو ماضی اس کی جڑ ہیں! ـــ کرشن جی کو اپنے ماضی کی یادوں سے جو پیار تھا وہ انھیں پاکستان کے لیے اور زیادہ تڑپاتا تھا ـــ وزیر آباد میں وہ پیدا ہوئے تھے ـ کشمیر میں بچپن اور لاہور میں جوانی گذاری تھی ـــــ

ان چند سالوں میں جب بھی اُن سے ملاقات ہوئی، انھوں نے پاکستان آنے کی خواہش کا اظہار کیا "مرنے سے پہلے ایک بار جی چاہتا ہے پاکستان جاؤں، لاہور دیکھوں ـــــ"

انھوں نے نقوش میں میرا خاکہ "راکھی" بہت پسند کیا اور مجھے خط لکھا ـ یہ ان کا آخری خط ہے ـ اس میں بھی لاہور آنے کی خواہش ظاہر کی ہے ـــــ

۱۹۷۵ء میں ایک ماہ بمبئی میں رہنے کا اتفاق ہوا ـ کرشن جی سے اکثر ملاقات ہوئی ـ مرلا بہن کی وفات کے بعد راکھی کا پہلا تہوار آرہا تھا، اس لیے میں خاص طور پر راکھی باندھنے کو رُک گئی اور روانگی کی تاریخ آگے بڑھادی ـ کرشن جی اس بات سے بہت خوش ہوئے کہ میں راکھی کے لیے رک رہی ہوں ـ ۲۱ اگست کو راکھی کا تہوار تھا ـ میرے ساتھ زہرہ، تزئین اور احسن بھی تھے ـ اس موقع پر کچھ تصاویر بھی لی گئی تھیں ـــــ

سردار جعفری نے اس تقریب کی نظم بھی بنائی تھی ـ کرشن جی کے گھر پر ہی وہ ٹی وی والوں کو لے کر آگئے تھے، اور اس موقع پر چند باتیں پاکستان کے ادب اور ادیبوں کے متعلق بھی مجھ سے پوچھی تھیں ـ یہ پروگرام راکھی کی شام کو "بہن بھائی" کے عنوان سے بمبئی ٹی وی سے دکھایا گیا تھا ـ مجھے اُس روز اپنی راکھی ہندوستان اور پاکستان کی دوستی کی علامت معلوم ہوئی ـ اس پروگرام کا ایک حصہ بعد میں امرتسر ٹی وی سے بھی دکھایا گیا تھا جو لاہور میں اکثر لوگوں نے بہت پسند کیا تھا ـ ۱۹۷۶ء میں جب والدہ

کینسر میں مبتلا ہوئیں تو انھوں نے اپنے ایک خط میں مجھے لکھا کہ تم کرشن جی کو خط لکھو کہ مجھے وہ راکھی والی فلم ہی دکھا دیں" میں تڑپ اٹھی! ——میری ماں بلا کی صابر عورت ہیں۔ مگر یہ جملہ کہہ رہا تھا کہ وہ میرے لیے تڑپ رہی ہیں —— میں نے سوچا وہ فلم نہیں —— میں خود اپنی ماں کے پاس جاؤں گی اور ایک بار پھر ان کے قدموں میں سر رکھ کر ان کے چھوٹے چھوٹے خوبصورت پیروں کو چوموں گی! —— انتہائی دوڑ بھاگ کے بعد مجھے ویزا ملا۔ میں نے امی کو جولائی کے پہلے ہفتہ میں آنے کو لکھا تھا۔ محکمہ سے اجازت نامہ، پھر لاہور سے سی۔آئی۔ڈی کا اجازت نامہ لینا تھا۔ میں دس جولائی کو بمبئی پہنچی! —— والدہ کا میرے پہنچنے سے چار روز پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ اسٹیشن سے سیدھی قبرستان گئی۔ جوہو میں سمندر کے کنارے ایک طرف بچوں کا پارک ہے اس کے سامنے قبرستان۔ سفید مسجد، گھنے سایہ دار درخت، ٹھنڈا سایہ اور ہر طرف پانی دیکھ کر مجھے وہ قبر جنت کا نشان معلوم ہوئی" اور ایک سکون بھری طمانیت محسوس ہوئی کہ امی بہت آرام سے ہیں —— زندگی کے دیے ہوئے سب دکھ ختم ہو گئے! —— اب راحت ہی راحت ہے! ——

ایک دن جاوید نے مجھے بتایا کہ میں نے کرشن جی کو آپ کی آمد کی اطلاع دے دی ہے۔ وہ اور سلمیٰ بھابی آئیں گے ہمارے گھر تعزیت کے لیے لوگ آ جا رہے تھے۔ میں نے سوچا کرشن جی اگر آئے تو غم انگیز باتیں سنیں گے —— دل کے مریض ہیں۔ ان کے لیے یہ مناسب نہ ہوگا۔ اور یہ سوچ کر میں راشد کو ساتھ لے کر ایک روز صبح کے وقت کرشن جی کے ہاں گئی ——

کرشن جی کو اس بات کا بہت دکھ تھا کہ مجھے ماں کی صورت دیکھنا نصیب نہ ہوئی! —— میں نے کہا کرشن جی خدا نے سب سعادتیں زہرہ اور سب بہن بھائیوں کے نصیب میں ہی لکھی تھیں۔ میں اُن کی کوئی خدمت نہ کر سکی۔ مر کر تو سب ہی بچھڑتے ہیں، مگر میں تو زندگی میں بھی دور رہی! ——

کرشن جی مجھے بہت تسلّی دیتے رہے —— سلمیٰ بھابی بھی بہت متاثر تھیں۔ کرشن جی نے کہا "ہم لوگ کل تمھارے پاس آ رہے تھے مگر ساحر کی والدہ سخت بیمار ہیں۔ شام کو وہاں چلے گئے۔ لیکن آج شام ہم نے طے کر لیا تھا کہ کچھ بھی ہو ضرور تمھارے پاس جائیں گے۔ لیکن تم نے بہت اچھا کیا کہ آ گئیں" ——

سلمیٰ بھابی بہت اُداس تھیں۔ کرشن جی نے بتایا کہ "ان ہی دنوں بلّو کے والد کا بھی انتقال ہو گیا۔ وہ بہت اچھے انسان تھے۔ بڑے اچھے مصور تھے۔ ہمیں اُن کی موت کا بہت دکھ ہے۔ اور بلّو تو اپنے باپ کی موت سے بہت ہی زیادہ متاثر ہے" پھر بلّو اور اُن کی دلہن اندر سے آئے۔ ان کی دلہن بڑی پیاری سی ہیں۔ کچھ دیر وہاں بیٹھ کر وہ اندر چلی گئیں ——

کرشن جی نے احسن کے اور بچوں کے متعلق پوچھا۔ میں نے بتایا کہ امی کی بیماری کی خبر پا کر میں تنہا ہی آئی ہوں سب کا آنا ممکن نہ تھا ——

پوچھا کب تک قیام ہے؟ اب کے تو کچھ دن ٹھہرو گی نا ——؟

میں نے کہا آٹھ دس روز اور رکوں گی۔ بیٹی کو پہلی مرتبہ اکیلا چھوڑا ہے پھر اگلے ماہ بیٹا بھی امریکہ جا رہا ہے۔ اس لیے جلدی جانا ہے۔ بھوپال بھی چند روز ٹھہروں گی —— کرشن جی نے کہا "ہم لوگ کسی دن آئیں گے —— زہرہ کے پاس بھی اب تک نہ جا سکا۔ ہم لوگ تو اجمیر شریف عرس میں گئے ہوئے تھے، واپس آئے تو والدہ کے انتقال کی خبر ملی ہے ——"

کرشن جی نے پھر حسبِ معمول اپنے لاہور اور لاہور والوں کا حال پوچھا۔ ندیم قاسمی اور محمد طفیل کے خط آئے ہیں ——

طفیل نے آنے کو بھی لکھا ہے۔ بلکہ آج ہی کل میں آنے والے ہیں "۔۔۔

میں نے کہا "یہ تو بڑی اچھی بات ہے اگر میری موجودگی ہی میں طفیل بھائی آجائیں "۔۔۔

پھر فیض صاحب کے متعلق پوچھا۔ میں نے کہا " سنا ہے کہیں باہر گئے ہوئے ہیں بلغاریہ وغیرہ۔۔۔"

میں نے طفیل بھائی کی "معظم" اور فیض کی " رات دی رات " انھیں پیش کیں۔ کتابیں لے کر بہت خوش ہوئے۔ فیض صاحب کی پنجابی نظمیں پڑھیں۔ بلند آواز سے پڑھتے رہے ۔۔۔ سلمیٰ بھابھی بھی توجہ سے سُن رہی تھیں۔ پھر بولے "وہ بات نہیں جو اردو شاعری میں ہے"۔۔ پھر دیباچہ پڑھ کر بولے ۔" اور جو کچھ میں محسوس کر رہا ہوں وہی بات یہ خود کہہ رہے ہیں آخری حصہ پڑھ کر سنایا۔۔۔"

سلمیٰ بھابی ہنس کر بولیں " جناب آپ کو کرشن چندر اور فیض کو فیض اردو نے ہی بنایا ہے، اردو کا آپ لوگوں پر احسان ہے آپ نے اردو پر احسان نہیں کیا ہے۔۔۔"

کرشن جی ہنس کر بولے " ہم کب انکار کرتے ہیں۔ جناب ہمیں اردو سے محبت ہے اور اردو ہماری ہے "۔۔۔

اس نوک جھونک سے غم کی فضا بدل گئی۔ "معظم" کی طباعت انھیں بہت پسند آئی۔ کہا پڑھوں گا۔۔ واہ واہ۔۔ ایسی کتابیں پاکستان ہی میں چھپ سکتی ہیں "۔۔۔ میں نے کہا "آپ تو دونوں ممالک میں سفارتی تعلقات قایم ہوگئے اب آنا جانا آسان ہو جائے گا اب آپ ویزا کی درخواست دیجیے اور ضرور پاکستان آیئے۔۔۔" کہنے لگے "ہاں بہت جی چاہتا ہے۔ ایک بار تو لاہور جانا چاہتا ہوں۔ اسلام آباد اور کراچی بھی آئیں گے"۔۔ پھر بولے " مگر اتنی جگہ کا ویزا مل جائے گا۔۔؟"

" آپ کو تو ہر جگہ کا ویزا مل جانا چاہیے۔ ضرور مل جائے گا۔ سلمیٰ بھابی نے کہا " دلی میں آپ ندا حسن صاحب سے ملیے گا"۔

" ہاں اب تو براہِ راست دلی سے ہی ویزا مل سکتا ہے بس آپ ارادہ کیجیے"۔ میں نے اُن کی تائید کی ۔۔۔

" اچھا دیکھو۔۔ کوشش کریں گے ۔۔" کرشن جی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا ۔۔ لاہور سے ایک طالب علم نے مجھے خط لکھا تھا!۔۔ اب جلد دونوں ملکوں کے درمیان اچھے تعلقات کا دور شروع ہونا چاہیے "۔۔۔

کرشن جی ان دنوں کانگریس کے زبردست حامی تھے اور ایمرجنسی کے حق میں تھے۔ کہنے لگے ایمرجنسی نے ہندوستان کو تباہی سے بچالیا۔ ملک میں قانون کوئی چیز ہی نہیں رہ گیا تھا۔ لوگوں نے آزادی کا مطلب اپنے کو تباہ کرنے کی آزادی سمجھ لیا تھا۔ وہ برصغیر کی سیاست کا تجزیہ کرنے لگے۔ کرشن جی کو یقین تھا کہ برصغیر، ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کے درمیان ایک اچھے اور پُرامن دور کا آغاز ہونے والا ہے!۔۔۔ وہ وقت ضرور آئے گا!۔۔۔

کاش وہ وقت ان کی زندگی میں ہی آجاتا!۔۔۔ وہ مرنے سے پہلے ایک بار پاکستان آسکتے۔ انھوں نے لاہور دیکھا ہوتا۔۔۔ ان کا جسم ہندوستان میں تھا اور روح جسے میں نے " سولزرا " کہا ہے لاہور میں تھی ۔۔۔

مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ جس دن اُن کی ارتھی بمبئی میں جل رہی ہوگی، وہ خوشی خوشی شالامار باغ میں گھوم رہے ہوں گے، اور راوی کی سیر کر رہے ہوں گے۔ ایک ننھی سی ناؤ میں جس کا بادبان سپید ہوگا۔۔ بھگوان سے انھوں نے کہا ہوگا۔۔ " سورگ میں آنے سے پہلے ذرا لاہور دیکھ آؤں ۔۔۔"

احمد جمال پاشا

ان کی یادوں کے چنار

ہماری اُن کی ۵۵ء ۱۹ء (اسی صدی سے) یاد اللہ تھی۔ کرشن چندر کو آدمی کون کہے وہ تو فرشتہ تھے۔ پہلی ملاقات میں جو تپاک، خلوص اور انکساری تھی۔ آخری بات چیت اور مراسلت تک برقرار رکھی، بلکہ اسے آسمان تک پہنچا کر خود اوپر چلے گئے۔ بس ہم لکھنؤ کے پاپولر سندھ رلیستوراں میں ٹکرا گئے۔ وہ چائے پر پروفیسر احتشام حسین سے محوِ گفتگو تھے۔ برابر کے کیبن میں ہم سگریٹ سے دل جلا رہے تھے۔ پہلے احتشام صاحب کی آواز کانوں میں رس گھول گئی ——"بھئی! سمجھ میں نہیں آتا —— کیسے کیا ہو جاتا ہے؟" —— پھر کرشن چندر کا نام سُنا —— ملاقات کے لیے طبیعت بے تاب بلکہ بے قابو ہو گئی —— معذرت کرتے ہوئے اُن کے کیبن میں داخل ہو گیا۔ اپنا تعارف کرایا۔ بڑے تپاک سے گلے ملے ——"بھئی آپ کو بڑے شوق سے پڑھتا ہوں" —— پھر بولے ——"آپ تو خلافِ توقع اس قدر نکلے، میرے ذہن میں کسی پختہ کار بوڑھے کا تصور تھا —— آپ تو شاید ابھی نوجوان بھی نہیں کہے جا سکتے ——" اس پر ایک تکونہ قہقہہ پڑا —— اب تک بات چیت افسانہ نگاری پر ہو رہی تھی —— مزاح نگاری پر شروع ہو گئی —— شام کا وقت تھا —— رات کی گاڑی سے اُنھیں دہلی جانا تھا —— ریزرویشن بھی نہیں تھا —— بار بار گھڑی دیکھ رہے تھے —— رلیستوراں سے نکلے تو پروفیسر صاحب رخصت ہو گئے —— ہم سائے کی طرح کرشن چندر کے ساتھ ساتھ تھے ——

اسٹیشن پر ریزرویشن کے بعد یورپین اسٹائل ریفریشمنٹ روم میں جا بیٹھے —— پطرس کی باتیں، سالک اور حسرت کی باتیں، ہری چند اختر کے لطیفے —— پھر خاموش ہو گئے —— ہم نے کچھ دم لے کر "ہوائی قلعہ" سے بات شروع کی۔ انھوں نے ظ۔ انصاری والے "شاہراہ" میں شایع ہونے والے ہمارے طنزیہ، مزاحیہ مضامین پر کئی زبانی سرٹیفکیٹ اِشو کیے۔ میں نے سوال اٹھایا ——"کرشن صاحب! جب آپ نے لکھنے کی ابتدا اتنے شاندار مزاحیہ مضامین سے کی تھی۔ تو افسانہ نگاری کے میدان کو کیوں زیر و زبر کر ڈالا ——؟" کرشن جی بولے ——"پاشا صاحب! آپ کا سوال بہت دلچسپ ہے۔ بات یہ ہے کہ ہمارے یہاں افسانے کے ناقد پیدا ہوتے ہیں —— طنز و مزاح کے نہیں —— نہ وہ اس صنف سے انصاف کر پاتے ہیں۔ نہ اس پر عملی تنقید ان کے بس کی ہوتی ہے —— کیونکہ وہ پڑھتے تو افسانے اور اُن پر تنقیدیں ہیں۔ نہ کہ ظرافت پارے —— کچھ تو اس لیے طبیعت مکدر ہو گئی —— کچھ یہ کہ میری طبیعت کو افسانہ نگاری سے مناسبت ہے۔ بات یہ بھی ہے کہ جدھر نشیب ہوتا ہے اُسی

طرف بہاؤ کا رُخ خود بخود ہو جاتا ہے "————— ہم دونوں " بہاؤ " کے نکتے پر ہنس دیے — گاڑی آئی، چلی گئی — ہم بجلی کی روشنی میں پٹری چمکتی دیکھتے رہے — پھر گھر لوٹ گئے —

اس کے بعد خطوط اور ملاقات کا سلسلہ برابر جاری رہا — دہلی، حیدر آباد، لکھنؤ، بمبئی — ملاقاتیں، طویل ملاقاتیں، طویل ترین ملاقاتیں — گھر بسایا تو اطلاع دی، گھر بدلا تو مطلع کیا — بیرونِ ملک گئے تو یاد کیا، انعام اعزاز ملا تو خوش خبری سنائی — مہندر ناتھ چل بسے تو بڑا دردناک خط لکھا — بہن کے انتقال کی خبر نہ تھی ایک درد و الم میں بسا افسانہ تھا — موت کی شدید آرزو تھی — دُکھا دل اور تھکا لہجہ، ہر ہر لفظ سے خون ٹپک رہا تھا ——— میں نے گبرو جوان کرشن چندر کو دیکھا تھا ——— ادھیڑ دیکھا تھا — پھر بوڑھے کرشن چندر کو جو بیمار تھے مسلسل بیمار، جنھیں صدمات نے بالکل توڑ پھوڑ دیا تھا —

خطوں کے بارے میں انتہائی لاپروا ہوں — جواب دینے کا میرے یہاں سرے سے خانہ ہی نہیں — خط کے جواب کے کتنے آرزو مندوں سے بنے بنائے تعلقات بگڑ گئے — کتنے روٹھ گئے — بھول گئے — بھول گئے — کتنوں نے عاق کر دیا — سب سے زیادہ لاپروا خطوط کو سنبت کر رکھنے کے سلسلے میں ہوں — کیا بتاؤں، کس کس کے، کیسے کیسے خطوط عادت کے مطابق پڑھ کر چاک کر دیے ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیے — اگر یہ کمزوری نہ ہوتی تو آج کرشن چندر کے میرے پاس سیکڑوں خطوط ہوتے — لیکن اب مشکل سے دو سو یا کچھ زاید ہوں گے وہ بھی اس لیے کہ پہلے چھوٹا بھائی اور بعد میں بیوی انھیں سنیت سنیت کر رکھتی رہیں —

ریڈیو پر کرشن چندر کے انتقال کی خبر ہم پر بجلی کی طرح گری، اُن کی تصویر، اُن کے ساتھ تصویریں دیکھتے رہے — ہم دونوں اُن ہی کی باتیں کرتے رہے — اُن کے خطوط پڑھتے رہے — نیلے کاغذ پر پاکیزہ تحریریں، ٹپے کبھی ہاتھ سے، کبھی انگریزی میں ٹائپ — مختصر خطوط، طویل خطوط، گھریلو خطوط، علمی، ادبی، سیاسی خطوط، ادبی فرمائشیں —

" علی گڑھ میگزین " میں " ادب میں مارشل لا " پڑھ کر کرشن چندر نے لکھا تھا ——— " ادب میں مارشل لا " پڑھ کر میرا دل " ہوائی قلعہ " کے دور میں واپسی کے لیے مچل گیا ——— اس کے بعد کچھ کلماتِ رشک ادا کیے گئے تھے —

" ادیب علی گڑھ " انشائیہ نمبر کے جواب میں لکھا کہ " تم رئیس اور آپ اردو کا پہلا " انشائیہ نمبر " نکالنے اور اس صنف کی جانب اہلِ ادب کی توجہ سنجیدگی سے مبذول کرانے پر مبارک باد کے مستحق ہیں — " انشائیہ نمبر " کا کیا کہنا — آپ کے اچھے انشائیے وہ ہیں جو اس نمبر میں شامل نہیں — " سینہ گزٹ " سے کہیں بہتر آپ کا " ناپسندیدہ لوگ " رہا —

سرسید ہال (مسلم یونی ورسٹی) میگزین " اسکالر " کا " پیروڈی نمبر " نکالا تو پھڑک اٹھے — لفظی داد سے نوازا — کنھیا لال کپور " ایک تنقیدی اور تحقیقی مطالعہ " لکھنے کے بعد اگر نہ بھی لکھیں، تب بھی ظرافت کی ہر تاریخ میں آپ کی جگہ نمایاں رہے گی — زیادہ کیوں لکھیے — ادیب کوئی صحافی نہیں، صبح ہوئی اور کان پر قلم رکھ کر نکلے، یا میری طرح لکھنے کی مشین ہو جائیے — اسے سستانا بھی چاہیے — دم لے کر آگے بڑھنا چاہیے — بڑھنے سے پہلے پلٹ کر دیکھنا چاہیے کہ وہ آگے بڑھ بھی رہا ہے، یہ کیا کہ بس بڑھے چلا جا رہا ہے — کسی نقاد نے لکھ مارا کہ " اب ان کا قلم تھک گیا ہے — " اور لگے کا نمذی گھوڑا دوڑانے — یہ بھی کوئی بات ہوئی — بات تو تب ہے کہ کپور کے بعد اب میری بھی پیروڈی کر ڈالیں — قبلہ حکیم یوسف حسین صاحب نے بھی " نیرنگِ خیال " کا " پیروڈی نمبر " نکالا تھا — نہ دیکھا ہو تو ضرور دیکھیے " ———

انھوں نے تو مذاق میں لکھا تھا — مگر ہم نے سچ مچ " گدھے کا خط کرشن چندر کے نام " لکھ ڈالا — مرحوم نے بے حد

پسند کیا۔ اسے "اندیشۂ شہر" میں شامل کر لیا۔

"اندیشۂ شہر" کی رسید مختصر تھی ـــــــ "سوائے دو تین مضامین کے بقیہ سب سدا بہار ہیں ـــ "میری بہن کی سہیلیاں" "ما بہم ٹیبل" اگلے اڈیشن میں مجموعہ سے خارج کر دیجیے گا ـــ "چند حسینوں کے خطوط" کا سلسلہ جاری رکھیے۔ انھیں کتابی شکل دیجیے۔ اسی طرح مستقبل میں پیروڈیاں بھی الگ ہی شایع کریں۔ پیروڈی کے بارے میں سیریس ہو جایئے۔ یہ آپ کو قطعی زندہ رکھیں گی "ـــــ

"اودھ پنچ" نکالا، مضمون کی فرمائش کی، انھوں نے "مانگے کی کتابیں" بھیج دیا۔ یہ مضمون "ہوائی قلعہ" اور بے شمار ادبی رسائل میں شایع و نقل ہو چکا تھا۔ مگر وہی نیلے کاغذ پر ہاتھ سے لکھا ہوا تھا۔ ہم نے چھاپا۔ شکریہ ادا کیا۔ لکھا ـــــــ "کرشن جی! پھڑک اٹھا والله! کیا مضمون بھیج دیا آپ نے "ـــــ انھوں نے جواب میں ٹانگ کھینچ لی ـــــ

"خیر چھپڑ کے تو بہت پہلے ہو گئے، اب تو تم نے اسے صرف چھاپا ہے"ـــــ اور ہم جھینپ کر رہ گئے ـــــ

"لذتِ آزار" بھیجی تو برس پڑے ـــــــ اس میں گن کر ۲۲ مضامین ہیں۔ دس کم از کم بھرتی کے ہیں، انھیں اگر آپ نکال دیتے تو کتاب کافی تیکھی ہو جاتی۔ کتاب کو موٹا رکھنے کے لیے کم از کم دس اچھے مضامین لکھنے پڑیں گے ـــ جیرو م کے ڈھوالا بہت بہت شکریہ ـــ میری رائے میں رابرٹ لنڈ اور جان مائیکس کی سب کتابیں مزہ دیں گی ـــ "گولڈن ایس" والی بات وہی کر سکتا ہے جس نے یا اُسے نہیں پڑھا، یا "گدھے کی سرگزشت" نہیں پڑھی۔ آپ اسے پہلی فرصت میں پڑھ کر افواہ کی تردید یا تصدیق کیجیے ـــ میں نے اسے پھر پڑھا ہے اور مطمئن ہوں "ـــــ

کرشن چندر بے حد بامروت اور مرنجان مرنج انسان تھے۔ اگر انھیں یقین ہوتا کہ جس پر تنقید کی جائے وہ اس کا اچھا اثر لے گا تو سخت سے سخت تنقید اور صحیح رائے میں تکلف بھی نہ کرتے ـــ "فنِ لطیفہ گوئی"، ہجویاتِ میر، شوکت تھانوی کی مزاحیہ صحافت اور ملا نصیرالدین کے لطیفے" کی رسید میں انھوں نے لکھا ـــــ

"اردو میں طنز و مزاح پر تنقید اور اسے کھنگالنے کی یہ انتہائی مبارک کوشش ہے ـــ میری خواہش ہے کہ آپ ظرافت پر تنقید کے منصب کو بھی سنبھال لیں ـــ "فنِ لطیفہ گوئی" لطیفے پر تنقید کی میرے علم میں پہلی مثال ہے ـــ مگر بڑی روشن اور شاندار!"ـــــ

"مجاز کے لطیفے" بھیجی تو لکھا ـــــــ "اگر آپ مجھے کہتے تو میں مجاز کے بہت سے لطیفے آپ کو بھجوا دیتا ـــ دوبارہ اشاعت کی جب نوبت آئے تو جاں نثار اختر کو لکھیے گا، اس ضمن میں وہ آپ کی بڑی مدد کریں گے انھیں آپ مجازیات کا امام سمجھیں"۔

"نمکدان" کراچی ـــ طنز و مزاح نمبر (انیس سو باسٹھ کا بہترین طنز و مزاحیہ ادب نمبر) جس کا میں مہمان مدیر تھا۔ بھیجا تو پھڑک اٹھے ـــ "اب آپ کراچی تک خوب خون مار رہے ہیں ـــ کیا کیا چیزیں جمع کر دی ہیں ـــ نمبر کیا ہے ڈائکرٹ کی پوتھی ہے "ـــــ

"ماہنامہ کتاب" لکھنؤ "شوکت تھانوی نمبر" بھیجا تو لکھا ـــــ "ہندوستان کا میدان آپ کے ہاتھ رہا ـــ یہ مستقل اہمیت کی دستاویز ہے۔ اسے آپ کیوں نہ کتابی شکل میں بھی محفوظ کر دیں "ـــ

"ستم ایجاد" کی رسید میں انھوں نے لکھا ـــ "آٹھواں نمبر: چل مرے خامے بسم اللہ، پر دکھوے گئے، درخواستیں

مطلوب ہیں، "ڈارون کے ڈارون، شامتِ اعمال اور مونچھیں"۔ اگر آپ اس مجموعے میں شامل نہ کرتے تو کیا ستم ہو جاتا۔ آپ ہمیشہ انتخاب سے رسوا ہوتے ہیں۔ اب آپ اپنا انتخاب چھاپیے۔ "BEST OF PASHA" اپنے تمام مضامین کی فہرست بنا کر بھیج دیجیے۔ میں نشان لگا دوں گا۔ پھر ہم کوئی اچھا سا نام بھی اس کا سوچ لیں گے۔"

میں نے مضامین کی فہرست بھیج دی۔ انھوں نے نشان لگا دیے اور پوچھا۔ "مضامین پاشا" کیسا رہے گا؟" انتخاب اور نام پسند آ گیا۔ کتاب کا انتساب اُنھیں کے نام کر دیا۔ "مضامین پاشا" چھپ گئی۔ اس کے بارے میں لکھا۔

"مضامینِ پاشا" مغز و مواد کے اعتبار سے بے حد شاندار مجموعہ ہے۔ آپ کو بخشوانے کے لیے یہ بہت کافی ہے۔ مگر بے حد خراب چھپا ہے۔ کتابت کی غلطیاں بہت ہیں۔ اسے آپ دوبارہ خود چھپوائیے گا۔ صہبا، طفیل یا مکتبہ جامعہ سے۔ اس کا بہت صاف ستھرا چھپنا بہت ضروری ہے۔"

کرشن چندر کے خطوط اُن کی شخصیت کا آئینہ ہیں۔ نہ شکوہ نہ شکایت، نہ کبھی کسی کی برائی۔ ایک ایک لفظ محبت اور خلوص میں ڈوبا ہوا، اِن الفاظ سے جو تصویر اُبھرتی ہے وہ ایک فرشتے کی ہے، ایک بڑے فن کار کی ہے، ایک دلِ درمند کی ہے۔

یوں تو کرشن چندر سے دوسرے شہروں میں بھی ملاقاتیں ہوئیں اور باتوں کے لمبے لمبے دور بھی چلے، مگر لکھنؤ میں ان سے جو ملاقاتیں ہوئیں وہ آسانی سے نہیں بھلائی جا سکتیں۔ گھریلو یا ہنسی مذاق کی گفتگو کے علاوہ اُن سے ہمیشہ طنز و مزاح یا اس کے کسی پہلو پر، مزاح نگاروں، اور اُن کے کارناموں، مغرب کی ظرافت پر بیشتر بات چیت ہوئی۔ افسانے یا سنجیدہ ادب پر شاید ہی کبھی بات ہوئی ہو۔

کرشن چندر کسی ایوارڈ، اعزاز یا کانفرنس کے سلسلے میں لکھنؤ آتے۔ اُن کا بیشتر قیام "ہوٹل گلمرگ" میں ہوتا۔ رام لعل صاحب کے یہاں اُن کی آمد پر ضرور بہت بڑا اجتماع ہوتا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ دونوں ایک دوسرے کے بہت قائل تھے۔ اور افسانہ نگاروں کی ایک ہی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ رتن سنگھ انھیں گھیر گھار کر ریڈیو اسٹیشن لے جاتے۔

عام طور پر شہر میں جب کوئی بڑا ادیب آتا تو نئی نسل اُسے گھیر لیتی تھی۔ وہ ہر قسم کے انسانوں کے جمگھٹ میں گھرے رہتے تھے۔ ان کے میزبان بیشتر رام لعل صاحب یا اطہر نبی ایڈووکیٹ ہوتے جو پریشان رہتے کہ کرشن جی آرام نہیں کر پا رہے ہیں۔ اس بھیڑ بھاڑ کی وجہ سے اُن سے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھنا بڑے دل گردے کا کام تھا۔ وہ تو مروت والے آدمی تھے اپنی پریشانی ظاہر نہ ہونے دیتے تھے۔ میں نے اُن کی شخصیت اور فن پر ایک کتاب لکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس سلسلے میں ایک بے حد طویل سوال نامہ بھی تیار کیا تھا۔ منصوبہ تھا کہ کئی ماہ اِن کے ساتھ سائے کی طرح رہا جائے۔ اُن کے جواب ٹیپ کیے جائیں اور متعلقہ مواد اُن کے تعاون سے فراہم کیا جائے۔ جب میں نے اُنھیں اپنے ارادے سے مطلع کیا تو انھوں نے لکھا کہ "اس کام کے لیے ہم دونوں کو وقت نکالنا پڑے گا۔ مگر یہ کیسے ممکن ہو گا۔ آپ میرے لیے اتنے چکروں میں کیوں پڑیں؟" ملاقات پر پھر میں نے گھیرا کہ اب فیصلہ ہو جانا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ "اچھا آپ پوچھنا شروع کیجیے"۔ وہ کئی دن لکھنؤ میں رہے، مگر پہلے سوال کا جواب وہ مکمل نہ کر سکے۔ جو طنز و مزاح کے بارے میں اُن کے نظریات سے متعلق تھا۔ کیونکہ لوگ خیال کی رفتار سے اُن سے ملنے آتے تھے۔ اور ہمیشہ جملہ ادھورا رہ جاتا۔ وہ خود عاجز ہو گئے اور فیصلہ کُن انداز میں بولے۔

"کشمیر میں ایک جشنِ ظرافت ہونے جا رہا ہے۔ آپ اور سرور جمال اس میں مدعو ہوں گے۔ جشن کے بعد ہم کشمیر

میں رُک جائیں گے۔ نہ آپ کسی سے ملیں گے نہ ہم۔ کام نپٹا کر ہی دم لیا جائے گا"——

سرکاری اخراجات میں تخفیف کی لہر "جشنِ ظرافت" کو بھی اپنے ساتھ بہا لے گئی۔ مجھے لکھنؤ سے سیوان ہجرت کرنی پڑی اور کوئی ایسی مہلت زندگی نہ دے سکی کہ یہ کتاب پوری ہو سکتی۔

آپ شاید سوچیں گے ایسی بھی کیا قیامت تھی کہ اتنا اہم کام نہ ہو سکا۔ تو واقعی قیامت تھی۔ ایک طرف کرشن چندر دل کے عارضے میں مبتلا۔ صدمات سے چور چور۔ دوسری طرف یہ کہ وہ دم لینے کے لیے بیٹھے کہ معلوم ہوا کہ انگریزی، ہندی یا اردو کے کسی اخبار کا نمائندہ انٹرویو لینے کے لیے آ گیا۔ وہ انٹرویو لے رہا ہے کہ اُن کے فلاں مرحوم دوست کا کنبہ آ گیا۔ خیر سے اس میں پردے والیاں بھی ہیں۔ فوراً تخلیہ ہو گیا۔ سب باہر کھڑے ہیں۔ اخباری نمائندے صاحب بھی باہر ٹاپ رہے ہیں۔ خدا خدا کر کے پردہ ختم ہوا تو اُن کے کوئی ایسے مداح آ گئے جن کے وجود۔۔۔ سے خود اب تک ناواقف تھے۔ مداح سیدھا بوتل میں سے نکل کر چلا آ رہا ہے اور ایک ہی بات بار بار دہرا رہا ہے، اور وہ بھی مروت میں ہاں ہوں کیے چلے جا رہے ہیں۔ اُس سے نجات ملی تو کوئی اردو ادب کے "ڈاکٹر" نازل ہو گئے۔ حالانکہ ضرورت ایلو پیتھک "ڈاکٹر" کی ہے یا خود کرشن چندر کو انتظار ڈالی گنج کے "ڈاکٹر" رضوی صاحب کا ہے۔ "ڈاکٹر" صاحب شخصیت بلکہ عظمت کے خول میں لپٹے ہوئے پھونک پھونک کر اشاروں میں تبادلۂ خیال فرما رہے ہیں۔ بور ہونے والوں میں کرشن چندر بھی شامل ہیں۔ عصمت چغتائی کے کسی افسانے کو کرشن چندر کا بتا کر اُس پر بہت روک تھام کروا دے رہے ہیں۔ ہنسی روکنے میں ہم دونوں کو کافی دشواری ہوئی ہے۔ وہ ٹلے تو کلو صاحب آ گئے۔ کسی زمانے میں کرشن جی جب لکھنؤ ریڈیو پر ہوا کرتے تھے تو موصوف اُن کا کھانا پکاتے تھے۔ کرشن جی نہایت دلچسپی سے کرید کرید کر ایک ایک بات پوچھ رہے ہیں۔ کلو صاحب اُنھیں کھانے پر اپنے یہاں بلانے پر مصر ہیں۔ اُدھر "ڈاکٹر" کی طرف سے اُن کا مکمل پرہیز ہے۔ کلو صاحب کو کرشن چندر سمجھا رہے ہیں، دروازے تک پہنچانے جاتے ہیں۔ اور زبردستی اُن کی جیب میں کچھ نوٹ ٹھونسنے میں مصروف ہیں۔ کلو صاحب کو یہ رقم قبول کرنے میں بے حد تکلف ہے۔ کرشن چندر لوٹے تو اب کوئی صاحب اُن سے تنہائی میں "ایک بات" کرنا چاہتے ہیں— ایک ہزار باتوں پر بھی ان کی وہ ایک بات ختم ہونے میں نہیں آ رہی ہے— بہ مشکل تمام لوٹے تو کوئی لڑکی یا لڑکا افسانے پر اصلاح یا اُسے سنانے پر مصر ہے۔ افسانہ سن بھی لیا گیا، اُس پر رائے بھی دے دی گئی— دوا کی شیشی ہاتھ میں ہے یا ڈاکٹر رضوی انجکشن دینے کے لیے اُن کی آستین چڑھا رہے ہیں، مگر کرشن جی ہیں کہ انھیں باقاعدہ مطالعے کے مشورے دے رہے ہیں۔ کوئی صاحب اس پر بضد ہیں کہ ایک نشست اُن کے اعزاز میں ہو جائے— یہ انھیں "ڈاکٹروں کے نسخے" دکھا کر سمجھا رہے ہیں کہ "ڈاکٹر اور صحت اس کی اجازت نہیں دیتے"— یہاں تک کہ لوگ کسی نہ کسی طرح رخصت کیے جاتے ہیں۔ کمرے میں باہر سے تالا ڈال دیا جاتا ہے، یا کمرہ بدل دیا جاتا ہے۔ ہوٹل کا بیرا آنے والوں کو بتاتا ہے کہ "کرشن چندر صاحب ریل سے کہیں باہر گئے ہیں"——

انسان دوستی، زندگی اور زندہ دلی سے بھرپور اُن کی یادوں کے وہ چنار ہیں جو ہمیشہ ہمارے دلوں میں کھلتے رہیں گے— اُن کی یادوں کی اک آگ سی لگائے رکھیں گے اور ہمیشہ ہم اس عظیم فن کار اور عظیم ترین انسان کی یادوں سے لالہ زار رہیں گے——

سرورِ جمال

کرشن چندر — کچھ یادیں کچھ آہیں

وہ بڑا ہی منحوس دن تھا جس دن آل انڈیا ریڈیو نے یہ دل دوز خبر سنائی کہ موت کے مہیب ہاتھوں نے ہمارے محبوب مزاح نگار، افسانہ نگار، ناول نگار اور خاکہ نگار کرشن چندر کو ہم سے چھین لیا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا کان سنسنانے لگے اور دل ڈوبنے سا لگا۔ یقین نہیں آ رہا تھا لیکن یقین کرنا ہی پڑا۔ یہ وہ اذیت ناک حقیقت تھی جسے جھٹلانا ممکن نہیں تھا ان کی مختلف تصویریں نظروں کے سامنے بنتی مٹتی رہیں۔ لگتا ہے ان سے پہلی ملاقات گویا کل کی بات ہے۔

۱۹۷۶ء میں مجتبیٰ حسین نے مزاح نگاروں کی کل ہند کانفرنس کا ہنگامہ کھڑا کیا اور سب کو حیدر آباد کھینچ بلوایا۔ وہ ۱۴ مئی کی صبح تھی۔ اس سے پہلے میں کرشن چندر کو صرف پڑھتی رہی تھی۔ کب سے پڑھ رہی تھی خبر نہیں۔ غالباً اردو کی پہلی کتاب ختم کرتے ہی میں نے ان کے ناول "الٹا درخت" اور "چڑیوں کی الف لیلہ" پڑھ ڈالے تھے اور غالباً یہ ان کی بھرپور طنز نگاری کا اثر تھا کہ میں بھی اس میدان میں لڑکھڑاتی ہوئی چل پڑی تھی۔ بہرحال "گدھے کی سرگزشت" ہو یا "گدھے کی واپسی" "دادر پل کے بچے" ہوں یا "آسمان روشن ہے"، "شکست" ہو یا "ایک عورت ہزار دیوانے" ان سب نے لاکھوں لوگوں کو ان کا دیوانہ بنا رکھا تھا۔ میں نے بھی ان کی بہت سی تخلیقات پڑھ ڈالی تھیں اور ان سے ملنے کا دیوانگی کی حد تک اشتیاق تھا۔ لیکن جہاں ان سے ملنے کی خوشی دل میں گدگدی پیدا کر رہی تھی، وہیں ان کی عظمت کی ہیبت بھی دل پر طاری تھی۔ لیکن ان سے مل کر تو صرف خوشی ہی خوشی رہ گئی باقی جذبے حرفِ غلط کی طرح مٹ گئے۔ ایسا لگا جیسے میں ان کو برسوں سے جانتی ہوں۔ کتنی بے تکلفی، کتنا خلوص، کتنی اپنائیت اور شفقت تھی ان کی باتوں میں۔ وہ باتیں جو ان کے افسانوں سے مختلف نہ تھیں۔ اکثر بڑے آرٹسٹ اندر سے کچھ اور باہر سے کچھ ہوتے ہیں۔ لیکن کرشن چندر کی شخصیت تو بالکل اکہری تھی۔ شگفتگی، خلوص اور محبت کی جیتی جاگتی مورتی۔

تین دن تک ہم برابر ساتھ رہے۔ باتیں کرتے رہے۔ اردو کے مسائل پر۔ مزاح نگاروں کے مسائل پہ۔ ان کی تخلیقات پر۔ اور جب ہماری باتیں ختم ہوتیں، لگتا کہ علم و دانش کے اس سمندر سے ہم نے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ پھر تو ان سے بار بار ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ لکھنؤ میں، دلی میں، بمبئی میں، لکھنؤ میں جب وہ اپنا ایوارڈ لینے آئے، ترقی پسند مصنفین کانفرنس میں شرکت کے لیے یا "اردو کے غیر مسلم مصنفین کی کانفرنس" میں شرکت کے لیے آئے ہم سے ضرور ملے۔ آج مجھے لکھنؤ کی وہ رات یاد آ رہی ہے۔

بمبئی سے ترقی پسند مصنفین کا ایک وفد بہار کے سیلاب زدگان کے لیے ریلیف فنڈ اکٹھا کرنے آیا ہوا ہے۔ لکھنؤ کی

ادبی اور سیاسی فضا ٹھیک نہیں ہے۔ اس لیے رونداد کی اسر "اردو کی تقریب" میں "اردو کے مسائل پر کچھ کہنے سننے کی پابندی لگا دی گئی ہے۔ خواجہ احمد عباس اپنا افسانہ "وہ لڑکی" سناتے ہیں۔ اس پر لکھنؤ کے لوگوں کی غیرت جاگ اٹھتی ہے ایک ہنگامہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ اردو کے ایک ادیب نے اردو کا مسئلہ کیوں کھڑا کیا۔ اردو ادب سننے کے جو آتے شائقین آئے ہیں وہ اردو کے مسائل سے کیوں آگاہ ہوں۔ لکھنؤ کے ایک معتمد ہندی کے ادیب نہ صرف واک آؤٹ کر جاتے ہیں بلکہ اپنے یہاں کا دیا ہوا گرینڈ ڈنر بھی کینسل کر دیتے ہیں۔

جلسہ کے اختتام پر رات کے دو بجے سب بھوکے پیاسے رام لعل کے ملٹی اسٹوریڈ گھر پر حملہ کر دیتے ہیں۔ مہمان ڈبل گنتیں بھوک سے بے حال۔ میزبان ہر طرف کھانے کا انتظام کرنے کو دوڑ رہے ہیں۔ میں نے اور بھابھی جی (شریمتی رام لعل) نے کچن سنبھال لیا ہے۔ خواجہ احمد عباس، ساحر لدھیانوی، اندیور اور امرت لال ناگر وغیرہ چیخ چیخ کر اپنے غم و غصے کا اظہار کر رہے ہیں۔ لیکن ان تمام باتوں سے بے نیاز کرشن چندر بار بار کچن میں آ کر کہتے ہیں۔ سرور جلدی کوئی چیز تیار کرو، بھوک کے مارے دم نکلا جا رہا ہے۔ بہر حال تین بجے تک سارے مہمانوں اور میزبانوں کے کھانے کا انتظام ہو سکا اور سب نے خوب ڈٹ کر کھایا۔

بعد کی ضیافتوں سے پتہ چلا کہ کرشن چندر لذیذ اور چٹ پٹے کھانوں پر جان دیتے تھے۔ دہی بڑے اور مرغ ان کی کمزوری تھے۔ افسوس کہ قدرت نے ان سے یہ کھانے ان کی زندگی ہی میں چھین لیے۔ سلمیٰ آپا ایک مہربان لیکن سخت گیر گارجین کی طرح ان کے کھانے پینے کی نگرانی کرتی رہیں۔ اس وقت مجھے بمبئی کی وہ شام بھی یاد آ رہی ہے۔

کرشن چندر نے ہمیں اپنی قیام گاہ "دل نشیں" پر بلایا ہے۔ بمبئی کے انواع و اقسام کے شاعروں اور ادیبوں کے ساتھ میز پر انواع و اقسام کے لذیذ کھانے بھی چنے ہیں۔ سب کھانے پینے میں اور کرشن چندر محض باتوں میں مصروف ہیں۔ سلمیٰ آپا کسی کام سے اندر جاتی ہیں اور وہ جلدی جلدی دو تین دہی بڑے ایک کے بعد ایک نگل جاتے ہیں۔ اتنے میں سلمیٰ آپا آ جاتی ہیں ان کی نگران نگاہیں جیسے ہی ان کی طرف متوجہ ہوتی ہیں وہ جھٹ سے ایک شریر بچے کی طرح ہاتھ میں لی ہوئی مٹھائی کے دو تین ٹکڑے ایک ساتھ منہ میں ڈال لیتے ہیں۔ سب ہنس پڑتے ہیں لیکن مجھے بڑا دکھ ہوتا ہے۔

کرشن چندر بہت دنوں سے بیمار چلے آ رہے تھے، کبھی کبھی ان کی بیماری طول پکڑ لیتی۔ لیکن ان کی شگفتگی اور حس مزاح میں کبھی کمی نہیں آئی تھی۔ ایسی حالت میں وہ مذاق سے نہیں چوکتے تھے۔

ایک بار علالت کے دوران وہ مظہر امام کے نام ایک خط میں غلطی سے پرویز شاہدی کو "شاہد پرویزی" لکھ دیتے ہیں۔ مظہر امام جب جواب میں اس غلطی کی طرف توجہ دلاتے ہیں تو لکھتے ہیں:

"شاہد پرویزی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ توبہ توبہ۔ اگر میں اپنی علالت کے زمانے میں ان کا نام غلط لکھ گیا تو کیا مضائقہ، پرویز شاہدی کو بھی مجھے کرشن چندر کے بجائے "چرشن کندر" کہنے کا پورا حق ہے اور وہ اپنے حق کو استعمال کر سکتے ہیں۔"

اسی طرح اپنی طویل بیماری کی وجہ سے جب کرشن چندر اپنے ناول "نیلام گھر" کی قسطیں "افکار" کے ایڈیٹر حضرت صہبا لکھنوی کو نہ بھیج سکے تو انھیں لکھا۔

"خیال تھا کہ قسطیں تمھیں بروقت ملتی رہیں گی، لیکن خرابیٔ صحت کو کیا کروں؟ دعا کرو کہ اب جو بیمار پڑوں تو تمھارے لیے دو قسطیں لکھنے کے بعد یعنی بیمار بھی قسطوں میں پڑوں۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ نیلام گھر لکھتے لکھتے اپنی صحت بھی نیلام ہو جائے گی۔

یہ بھی اتفاق کی بات ہے کہ میری اُن سے آخری ملاقات بھی بمبئی میں ہوتی ہے۔ بیماری نے ان پر پورا غلبہ پالیا ہے۔ مہندر ناتھ اور سرلا دیوی کی موت کے صدمہ کو وہ برداشت نہیں کر سکے ہیں۔ پے در پے صدمات نے انھیں کچل کر رکھ دیا ہے لیکن ایسی حالت میں بھی اخلاق و مروت کا وہی عالم ہے۔ ان کی مزاج پرسی کرنے سے پہلے ہی وہ ہماری خیریت دریافت کرتے ہیں۔ لکھنؤ والوں کے حال احوال پوچھتے ہیں۔ گھر والے انھیں آرام پہنچانا چاہتے ہیں۔ لیکن آرام تو انھیں لوگوں کو خوش کر کے ملتا ہے۔

اتنا عظیم فن کار کتنی خاکساری سے ملتا ہے۔ اس کے سینے میں کیسا دردمند دل ہے۔ اعلیٰ ادنیٰ، چھوٹا بڑا، اونچا نیچا، سب اس کی نظروں میں ایک ہے۔ "ڈاکٹر نے کھانا کھا کر جلد سونے کی ہدایت کی ہے۔ لیکن وہ مروت میں باتیں کیے جا رہے ہیں اور آنے والا بے مروت بنا اُن کی کم اور اپنی زیادہ سناتا چلا جا رہا ہے ——

پھر برابر خبریں آتی رہتی ہیں۔ کرشن چندر سخت بیمار ہیں۔ "ڈاکٹروں نے لکھنے پڑھنے کو منع کر دیا ہے — چلنے پھرنے کو منع کر دیا ہے۔ کھانے پینے، اُٹھنے بیٹھنے، ہنسنے بولنے کو منع کر دیا ہے۔ یہ ڈاکٹر بھی کتنے سخت اور عجیب ہوتے ہیں۔ جیتے جی انسان کو مردہ قرار دیتے ہیں۔ کیا تماشا ہے کہ زندگی نہیں دیتے، محض سانس دیتے ہیں —— افسوس صد افسوس کہ آج وہ انسان سے اس کی سانس کا رشتہ بھی قایم نہ رکھ سکے —— آہ! — آج جسم اور سانس کا یہ رشتہ بھی ٹوٹ گیا ——

کرشن چندر کے جسم کا رشتہ ان کی سانس سے ضرور ٹوٹ گیا۔ لیکن ایک عظیم فن کار کا رشتہ اس کے چاہنے والوں، عقیدت مندوں اور مداحوں سے کیسے ٹوٹ سکتا ہے۔ ہمارے دلوں کا رشتہ تو ویسا ہی قایم ہے اور رہے گا ——

ان کی تصنیفات نے جوان کو ایک لازوال زندگی دی ہے، اسے کون مٹا سکتا ہے۔ 'ہوائی قلعے'، 'پورین کلب' —— 'میری یادوں کے چنار'، 'مشینوں کا شہر'، 'شکست'، 'دادر پل کے بچے'، 'گدھے کی سرگذشت'، اور 'آسمان روشن ہے' جیسے ناول کیسے بھلائے جا سکتے ہیں۔ ان کے لافانی افسانوں "تین غنڈے" "مہالکشمی کا پل" "کالو بھنگی" "پشاور ایکسپریس" "جامن کا پیڑ" "ہیں گز سی دوڑ" کو کون بھلا سکتا ہے ——؟

کون کہتا ہے کہ کرشن چندر نہیں رہے۔ اُن کی روح اُن کے لاکھوں پڑھنے والوں، مداحوں اور عقیدت مندوں کے دلوں کی دھڑکن بن کر رہے گی۔ وہ زندہ ہیں اور تا ابد زندہ رہیں گے ——

اردو کے بے حد حساس اور منفرد شاعر

مرتضیٰ برلاس

کا پہلا نمایندہ مجموعۂ کلام

تیشۂ کرب

عنقریب شایع ہو رہا ہے

ڈاکٹر صابر آفاقی

کرشن چندر اور پیرپنچال

ریاست جموں و کشمیر قدیم ایام سے ہی ائمۂ فن اور نابغۂ روزگار پیدا کرتی رہی ہے۔ سنسکرت کی شاعری میں اس خطۂ گل و لالہ نے بلہن، کالیداس، بان اور کلہن ایسے باکمال پیدا کیے۔ فارسی شاعری میں ملا طاہر غنی، کشمیری میں رسل میر، شمس فقیر، وہاب پرے، اور مہجور اسی خاک سے اٹھے۔ حکمت و فلسفہ اور شاعری میں عالمی شہرت پانے والے عبقری اور خالقِ تصورِ پاکستان، اقبال کا تعلق بھی اسی خاک ارجمند سے تھا۔ ڈرامہ کو بام عروج تک پہنچانے والے محمد شاہ حشر کاشمیری کا خمیر بھی کشمیر سے اٹھا۔ برصغیر کے خطیب اعظم سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا آبائی وطن بھی یہی سرزمین ہے۔ اردو کے عظیم افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کے بزرگ بھی کشمیر کے باشندے تھے۔ مولانا محمد انور شاہ وادی لولاب کے رہنے والے تھے جنھوں نے علوم دینی میں مہارت پاکر برصغیر کے علما میں شہرت پائی اور اپنے وطن کا نام زندہ کیا۔

پیرپنجال کے دامن میں واقع خوبصورت شہر پونچھ نے بھی چند ایسے باکمالوں کو جنم دیا جن کا کام ابدی اور نام امر ہو گیا ہے۔ مغل سلطنت کو زوال سے ہم کنار کرنے والا بندہ بیراگی اسی شہر کے نزدیک منڈی میں رہتا تھا۔ مولانا عبید اللہ سندھی کے سکھ آباو اجداد پونچھ ہی کے رہنے والے تھے۔

سرسید احمد خاں کے دست راست شیخ محمد عبد اللہ اسی شہر پونچھ کے باشندے تھے۔ اسی طرح صحافت و ظرافت کے امام مولانا چراغ حسن حسرت کا وطن بھی یہی شہر تھا۔

پونچھ شہر کشمیر کے راجہ للتادت نے سنہ ۱۵۹۶ء میں آباد کیا تھا۔ اس طرح یہ شہر ریاست میں قدیم تہذیب و تمدن کا مرکز بن گیا تھا۔ یہ شہر دریائے پونچھ اور نالہ بے تاڑ کے سنگم پر آباد ہے اور ہندو و مسلم تہذیب کے سنگم کا مظہر بھی۔ اکثر حملہ آور پونچھ اور توسہ میدان کے راستے ہی کشمیر پر حملہ کیا کرتے تھے۔ برصغیر کے فاتح محمود غزنوی نے اسی راستے آگے بڑھنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ لوہر کوٹ پر ایک ماہ کے محاصرے کے بعد ناکام لوٹا۔ پونچھ شہر کی سیاحت مشہور سیاح ہیون سانگ، ابن بطوطہ اور ابوریحان البیرونی نے بھی کی تھی۔

اس شہر کو پھولوں کا شہر کہا گیا ہے۔ یہاں پھلوں کی فراوانی تھی۔ سنہ ۱۹۴۷ء سے قبل یہاں کا منڈی ہال علمی و ادبی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔

اردو افسانہ اور شہر پونچھ کرشن چندر پر ہمیشہ فخر کرتے رہیں گے۔ ریاست کا یہ مایہ ناز سپوت سنہ ۱۹۱۴ء میں ہندو

گھرانے میں پیدا ہوا۔ ان کے والد گوری چند علاج معالجہ کرکے یہاں کے ہندو مسلم عوام کی خدمت کرتے تھے۔

کرشن چندر نے اسی ملی جلی تہذیب میں آنکھ کھولی۔ وہ حسنِ فطرت کے آغوش میں جوان ہوا۔ وطن کی نسیم سحری کی طرح کرشن چندر آوارہ ولامکاں رہا۔ اس کا کام دلوں کی کلیاں کھلانا تھا اور بس۔ ابتدائی تعلیم اس نے پونچھ کے دی بی ہائی اسکول میں حاصل کی۔ ایف۔ اے کے لیے اسے لاہور کا رخ کرنا پڑا۔ وہاں سے آوارہ مزاجی کا شکار ہو گیا۔ کبھی مدیر بنا۔ کبھی فلم کے لیے کہانیاں لکھتا رہا۔ کبھی ریڈیو کی ملازمت اختیار کی۔ اس کی طبیعت پونچھ کی وادیوں کی طرح شاداب اور اُس کے عزائم پیر پنجال کی مانند بلند تھے۔

پونچھ کا جغرافیائی ماحول کہانیاں تخلیق کرنے والا اور کہانیاں محفوظ رکھنے والا ماحول ہے۔ سبزہ زاروں، بلند پہاڑوں، گھنے جنگلوں اور بل کھاتی ندیوں کا یہ علاقہ کوہ قاف کا علاقہ دکھائی دیتا ہے۔ ہند دگھرانے کی دیو مالائی کہانیوں نے کرشن چندر کو اور بھی رومان پسند بنا دیا تھا۔ لیکن شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔

کوہ قاف کی کہانیوں میں وہ حقیقت کہاں جو حقیقت کرشن چندر کے ماحول میں موجود تھی۔

۱۹۱۴ء نے دو معجزے دکھلائے۔ جنگ نے مشرقی اقوام کے عقاید ونظریات کی بنیاد ہلا کر رکھ دی تو کرشن چندر نے پرانی افسانہ نویسی کے کھنڈر پر نئی حسین عمارت کھڑی کر دی۔ اقبال کی عظمت یہ ہے کہ کوئی اس کی شاعری کی نقل نہ اُتار سکا اور کرشن چندر کی عظمت یہ ہے کہ اس نے بے شمار کرشن چندر پیدا کیے۔ کرشن چندر مندر میں رکھا ہوا کرشن کا ایک بڑا اور پُرجلال مجسمہ ہے اور اُس کے مقلدین کرشن کی قطار در قطار مورتیاں جو چھوٹی ہوتے ہوتے آخر میں ایک نقطہ بن گئی ہیں۔ میں تو یہ کہوں گا کہ کرشن مہاراج ہندو دین کے پیغمبر تھے اور کرشن چندر افسانہ نویسی کی شریعت کے بانی۔

افسانہ نگاری میں کرشن چندر کی شہرت کا آفتاب گو ۱۹۳۶ء میں نصف النہار پر تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ آفتاب کبھی غروب ہونے والا نہیں۔ اُسی سال افسانہ نگاری نے ایک تحریک کی شکل اختیار کی۔ اس تحریک کے رہنما چار تھے۔ سعادت حسن منٹو۔ راجندر سنگھ بیدی۔ عصمت چغتائی اور کرشن چندر۔ میری نظر میں وہ ان تینوں سے آگے نکل گیا۔ کرشن چندر ایک چھوٹے سے ریاستی شہر پونچھ سے نکلا۔ لاہور سے ہوتا ہوا۔ بمبئی اور پھر وہاں سے دہلی پہنچا۔ ان شہروں میں ایک دیہاتی اجنبی کا زندہ رہنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ مگر کرشن چندر وہ عبقری نکلا جو چند ہی سالوں میں برصغیر پاک وہند کے تمام افسانہ نویسوں کا امام بن گیا اور اس فن میں وہ اتنا اونچا ہو گیا کہ آج اگر ہم کرشن چندر کے مقام سے دوسروں پر نظر ڈالیں تو وہ اتنے ہی چھوٹے نظر آئیں گے — جتنے چھوٹے وہ تودے جنھیں پیر پنجال کی چوٹی سے پونچھ — تھنہ اور راجوری کے ڈھلوانوں پر دیکھیں ——

کرشن چندر ایک ایسا سچا محب وطن تھا کہ اس نے اکثر افسانوں کے پلاٹ اور کردار اسی وطن سے لیے ہیں —— وہ بمبئی اور دہلی میں بھی بیٹھ کر پونچھ — بہرام گلہ — علی آباد — تیتوال اور ریاست کے دیگر مقامات کو فراموش نہ کرسکا ——

اپنے وطن سے یہی محبت اسے سچا فن کار بناتی ہے، اور فن کی یہی سچائی اس کی حیاتِ ابدی کی ضمانت بھی ہے ——

کرشن چندر

چند غیر مطبوعہ خطوط

رام لعل کے نام

(۱)

کرشن چندر کا پہلا خط مجھے ۱۹۴۵ء[1] میں والٹن ٹریننگ اسکول لاہور چھاونی کے پتہ پر ملا تھا، جو انھوں نے میرے ایک خط کے جواب میں شمالی مارکیٹ پونہ سے بھجوایا تھا۔ اس خط کا جو اقتباس میری کتاب "انقلاب آنے تک" مطبوعہ ۱۹۴۹ء میں چھپا ہوا ہے وہی نقل کر رہا ہوں۔ اصل خط اُسی زمانے میں کاتب کے پاس رہ گیا تھا۔ چند اور یادگار خطوط بھی ذیل میں پیش ہیں

——— رام لعل

"...... ہر شخص زندگی کے موڑ پر سے گزرتا ہوا نظر آتا ہے اس لیے غم کھانے سے کچھ نہ ہوگا۔ اپنی زندگی کو دوسروں کے لیے بہتر بنایئے اور آنسوؤں کے کسی ایک قطرے کو بھی بے کار نہ جانے دیجیے۔ پیٹ کے دھندے سے ڈرنا غیر انسانی ہے۔ غذا زندگی بخشتی ہے اور زندگی بڑی مقدس شے ہے۔ اس لیے جسم و جاں کو ایک رشتے میں جوڑنے کے لیے ہم جو تگ و دو شب و روز کرتے ہیں وہ بھی مقدس ہے اور قابلِ احترام ———"

——— (۲) ———

بمبئی ۲۶-۴-۵۷

محترمی شری رام لال جی!

آداب ———

آج بدری[2] صاحب مدراس سے تشریف لائے تھے۔ آپ کے خط دے گئے ہیں۔ یادآوری کا شکریہ۔ مجھے اچھی طرح

---

[1] اُن دنوں میں ریلوے ورک شاپ مغل پورہ لاہور کی زندگی کو خیرباد کہہ کر کمرشیل کلارک کی ٹریننگ کے لیے والٹن چلا گیا تھا۔ میں نے کرشن چندر کو لکھا تھا کہ میں اپنی موجودہ زندگی سے بیزار ہو چکا ہوں۔ اس سے کہیں اچھا ہوتا کہ میں ایک تربیتی اسکیم کے تحت کینیڈا چلا گیا ہوتا جس میں میں سلیکٹ کر لیا گیا تھا لیکن والدین نے نہیں جانے دیا تھا۔ [2] کاوش بدری۔ مدراس کے ایک اُردو شاعر

یاد ہے کہ اس سے پہلے بھی آپ سے خط و کتابت ہوئی تھی اور بیسویں صدی اور دیگر رسالوں میں آپ کی تحریروں سے میں بخوبی متعارف ہوں۔

مادرِ وطن[3] کا اب تک ایک پرچہ بھی میرے پاس یا مہندر بھائی[4] کے پاس نہیں پہنچا۔ ممکن ہے، ایڈریس غلط لکھا گیا ہو۔ ورنہ ڈاک خانے والوں سے ایسی مسلسل چوری کی امید نہیں ہے۔ آپ ذرا دیکھیے گا اور چند پرچے بھجوایئے گا میں حتی الامکان مادرِ وطن کے افسانہ نمبر[5] میں لکھنے کی کوشش کروں گا۔ اس سلسلے میں آپ مجھے ایک آخری تاریخ سے مطلع کر دیجیے جس کے بعد میرا افسانہ شریکِ محفل نہ ہو سکے گا۔ میں اس تاریخ سے پہلے آپ کو افسانہ لکھ کر بھجوانے کی کوشش کروں گا۔

ان دنوں — کچھ عرصے سے — طبیعت افسانہ نگاری پر مائل نہیں ہے۔ ناول لکھنے کو جی چاہتا ہے، اور اپنا یہ شوق پورا کرتا رہتا ہوں۔ بہر حال کبھی کبھار دوستوں کے زور دینے پر ایک آدھ افسانہ بھی لکھ لیتا ہوں۔ مگر ان میں وہ لطف نہیں پاتا جو پہلے محسوس کرتا تھا۔ جانے وہ موڈ اب واپس کب آئے گا؟

کرشن چندر نمبر[6] کے سلسلے میں آپ سے میں کیا عرض کر سکتا ہوں، یہ آپ جانیں اور نسیم[7] صاحب۔ نکالیں یا نہ نکالیں۔ میری طبیعت ایسی ہے کہ میں نے آج تک کسی کو یہ نہ کہا میرے متعلق ایک مضمون لکھ دیجیے، یا میری کتاب پر ریویو کر دیجیے یا میرے نام کو رسالے میں اچھال دیں۔ میرا کام صرف لکھنا ہے اور تنقید نگاروں اور میرے پڑھنے والوں کا یہ کام ہے کہ وہ میرے کھرے اور کھوٹے کو پرکھیں۔ اس لیے میں یہ عرض کرنے کی گستاخی ضرور کروں گا کہ اگر کہیں آپ اس نمبر کے شائع کرنے پر تل جائیں یعنی بالکل اس کا عہد کر لیں تو اس بات کا ضرور خیال رکھیے گا کہ متانت اور سنجیدگی ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ ہر طرح کے مضامین اس میں ہوں اور تصویر کے دونوں رخ اس میں دکھائے جائیں۔ نہ ایسی مدح اور ستایش ہو کہ مجھے منہ چھپائے نہ بنے۔ نہ ایسی تنقیص ہو جس سے ادیبوں یا دل دادگانِ ادب کو کسی طرح کی تعمیری مدد نہ پہنچ سکے۔ یہ متوازن کیفیت پیدا کرنا بہت مشکل کام ہے اور ظاہر ہے اس کے لیے آپ کو بڑے سنجیدہ اصحاب سے رجوع کرنا ہوگا۔ اور اگر آپ کو اس میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑے تو مت چھاپیے گا یہ چند منتشر سے خیالات میں نے اس سلسلے میں آپ کے سامنے رکھ دیے ہیں امید ہے ناگوارِ خاطر نہ ہوں گے۔

اب تو عرصے سے لکھنؤ آنا نہیں ہوا۔ بھوپال بھی اپنی علالت کی وجہ سے نہیں جا سکا۔ البتہ دسمبر کے دوسرے ہفتہ میں کلکتے جا رہا ہوں۔ دیکھیے آپ سے کب اور کہاں ملاقات ہوتی ہے؟ —

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے —

آپ کا بھائی
کرشن چندر

---

[3] ہفت روزہ "مادر وطن" لکھنؤ جو ۱۹۵۶ء سے ۱۹۶۶ء تک نکلتا رہا۔

[4] مہندر ناتھ۔

[5] یہ نمبر نہیں نکلا۔

[6] یہ نمبر نہیں نکل سکا۔

[7] کشوری لال نسیم گنجاہی۔ ایڈیٹر مادر وطن۔ لکھنؤ۔ ۱۹۶۷ء میں آپ کا انتقال ہو گیا۔

(۳)

۱۳ ؍ ۶۶-۸-۷

محترمی رام لال جی! آداب ——

آپ کا خط مجھے بمبئی سے ری ڈائریکٹ ہو کے مل گیا — میں پندرہ دن سے کلکتے میں مقیم ہوں۔ اپنے کام کے سلسلے میں آیا تھا۔ اب دس اگست کو واپس بمبئی چلا جاؤں گا۔ یہاں اس قدر مصروفیت رہی کہ بہزار کوشش آپ کے خط کا جواب مفصل طور پر نہ بھیج سکا۔ بمبئی جا کے لکھوں گا۔ کیونکہ آپ کے خط اور انگریزی مضمون[۸] میں کئی متنازعہ فیہ باتیں ہیں جو غور و فکر کی محتاج ہیں۔ رواروی میں نہیں لکھا جا سکتا۔

اُمید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ عابد سہیل، متیش بترا اور دوسرے احباب کی خدمت میں آداب۔

آپ کا۔ کرشن چندر

——(۴)——

بمبئی ۵۲ ؍ ۶۷-۷-۱۸

پیارے رام لال —— میری غیر حاضری میں تمہارا خط آیا۔ میں پرسوں جرمنی سے لوٹا ہوں۔ ڈھائی ماہ کے بعد۔ تمہارا انگریزی کتابچہ[۹] بھی مل گیا۔ اس کے لیے اپنی کہانی چند دنوں میں بھیج دوں گا۔ تمہارے افسانوں کے نئے مجموعے کے لیے دیباچہ بھی لکھ دوں گا۔ تم مسودہ مجھے بھیج دو——

بہار ریلیف فنڈ کے دورے پر[۱۰] غالباً نہیں آسکوں گا۔ بہت تھک گیا ہوں۔ یوں دیکھا جائے تو گذشتہ آٹھ ماہ سے سفر میں ہوں۔ دو دفعہ کلکتہ، تین دفعہ دہلی، ایک دفعہ حیدرآباد۔ ایک دفعہ مالیگاؤں۔ پھر دہلی۔ ماسکو۔ برلن وغیرہ وغیرہ۔ آخر گوشت پوست کا جسم ہی تو ہے۔ کب تک اس طرح ساتھ دے گا۔ چند دنوں کے لیے آرام کرنا چاہتا ہوں۔ اگر یادوں نے کرنے دیا تو — ورنہ پھر وہی ریل کے پہیوں کی گڑگڑاہٹ۔ ابھی اپنی آمد کے بارے میں وثوق سے کچھ طے نہیں کیا ہے۔ مگر عباس، بیدی، سردار، کیفی، ساحر ضرور آرہے ہیں اور بنّے بھائی بھی ——

---

۸ — NEW URDU SHORT STORY یہ مضمون میں نے ترقی پسند مصنفین کے پینتیس[۳۵] سالہ جشن منعقدہ پٹیل ہاؤس نئی دہلی میں پڑھا جس میں میں نے ادیبوں پر سیاسی غلبہ کی مخالفت کی تھی۔ اس مضمون کو میں نے سائیکلو اسٹائل کرکے ادیبوں میں تقسیم بھی کیا تھا۔ مجلس صدارت میں سجاد ظہیر، خواجہ احمد عباس، ایشپال اور پنجابی و بنگالی کے دو اور ادیب بھی تھے۔ میرے اس مضمون سے برہم ہو کر خواجہ احمد عباس نے میرے خلاف ایک مضمون لکھا تھا جو اردو بلٹز، بمبئی میں شایع ہوا تھا۔

۹ — NEW GENERATION — یہ سہ ماہی میں نے متیش بترا کے ساتھ مل کر نکالا تھا جس کے صرف پانچ شمارے ہی شایع ہو سکے

۱۰ یہ دورہ انجمن ترقی پسند مصنفین نے یوپی و بہار کے لیے ریلیف فنڈ جمع کرنے کے لیے کیا تھا۔ اس کے سربراہ سجاد ظہیر تھے انھوں نے متعدد شہروں میں ادبی پروگرام پیش کر کے کئی ہزار روپے جمع کیے تھے اور یوپی و بہار کے وزرائے اعلیٰ کو پیش کر دیے تھے۔ لکھنؤ کے پروگرام کا کنوینر مجھے بنایا گیا تھا۔ سجاد ظہیر، خواجہ احمد عباس، کرشن چندر، مخدوم محی الدین — ساحر لدھیانوی وغیرہ کے ساتھ میں بھی گیا اور الہ آباد کی تقریبوں میں شریک ہوا تھا اور اپنی کہانیاں سنائی تھیں۔

عابد سہیل سے اگر ملاقات ہو تو میرا سلام کہنا۔ انھیں بھی کل پرسوں میں خط لکھوں گا۔ ڈاک اتنی اکٹھی ہو چکی ہے کہ دیکھ کے ڈر لگتا ہے۔

آج شام کو کرشن چندر[11] نمبر ملا ہے۔ خاصا ضخیم ہے اور دیدہ زیب بھی۔ ابھی تک صرف تصاویر دیکھ سکا ہوں۔ فرصت کے اوقات میں دھیرے دھیرے پڑھوں گا۔ ابھی تک تو ڈاک کا ہول دل میں بیٹھ گیا ہے۔ پہلے اسے دور کرنے کی کوئی سبیل کر لوں ——— ادھر کب آنے کا ارادہ ہے ———

تمھارا کرشن چندر

———(۵)———

بمبئی ۵۲ ۱۶-۱۱-۶۷

پیارے رام لال ——— خوش رہو!

عرصہ دراز کے بعد تمھیں خط لکھ رہا ہوں ——— اس لیے کہ اب خود سے خط لکھنے اور ہلکے پھلکے مضامین[12] (جن سے دل و دماغ پر بار نہ پڑے) یا ترجمے کرنے کی اجازت فی الحال مل گئی ہے۔ اس لیے اب مصنف سے مترجم ہونا پڑے گا۔ ترقی معکوس اسے کہتے ہیں شاید ———

میری طویل علالت کے دوران تمھارے تین چار خط ملے۔ تمھارے خلوص اور محبت کا شکریہ۔ یہ احباب کی محبت ہی تھی جس نے مجھے موت سے نبرد آزما ہونے کی ترغیب دی ———

اور کہو ——— تم آج کل کیا کر رہے ہو؟ یشپال[13]، امرت لال[14] ناگر، عابد سہیل[15]، بھگوتی چرن ورما[16]، حیات اللہ انصاری[17]، آنند نارائن ملا[18]، شمس الرحمٰن[19] فاروقی اور دیگر احباب لکھنؤ کو میرا سلام پہنچے ———

تمھارا کرشن چندر

———(۶)———

بمبئی ۵۲ ۲۶-۱۱-۶۸

پیارے رام لال ——— خوش رہو!

تمھارا خط مل گیا۔ مجھے امید ہے اب تک تمھیں بھی میرا تفصیلی خط مل چکا ہوگا جس میں میں نے اپنے صحت یاب

---

[11] ماہنامہ "شاعر" بمبئی کا کرشن چندر نمبر۔
[12] کرشن چندر نے اس سلسلے میں ایک لطیفہ سنایا تھا کہ ڈاکٹر نے کہا ہے افسانہ وغیرہ مت لکھنا۔ ہاں شاعری واعری کرنا چاہو تو کر سکتے ہو۔
[13] ہندی کے مشہور ادیب اور مشہور انقلابی لیڈر بھگت سنگھ کے ساتھی۔
[14] ہندی کے مشہور ناول نگار [15] ماہنامہ کتاب۔ لکھنؤ کے مدیر۔ ممتاز افسانہ نگار۔
[16] ہندی کے ناول نگار جنھوں نے چترلیکھا لکھی [17] اردو کے مشہور افسانہ نگار اور صحافی۔
[18] اردو کے مشہور شاعر۔ سابق جج ہائی کورٹ یوپی اور سابق ممبر پارلیمنٹ۔
[19] جدید اردو نقاد، شاعر، مبصر ——— ماہنامہ شب خون۔ الہ آباد کے مالک۔

ہونے کی خبر دی ہے۔ اور کچھ دوسری باتیں بھی تھیں۔

مجھے اس بات کی دلی مسرت ہے کہ تم لکھنؤ میں بھی جشنِ کرشن چندر[20] منانے جا رہے ہو۔ صحت اس امر کی ابھی اجازت نہیں دیتی کہ جہاں جشن کرشن چندر منایا جا رہا ہو وہاں خود سے چلا جاؤں۔ بس دو ایک جگہ جاؤں گا۔ امید ہے تم میری معذوری سمجھ کر مجھے اس غیر حاضری کے لیے معاف کر دوگے۔ جشن کی تاریخ لکھ دوگے تو بر وقت پیغام بھیج دوں گا۔

جشن کے سلسلے میں تم نے بنارس کے جس سرپرست[21] کا پتہ لکھا تھا وہ چونکہ صاف لکھا ہوا نہیں تھا اس لیے اُس پتے پر جشن کا لٹریچر نہیں بھیجا جا سکا۔ دوبارہ خط میں صاف صاف پتہ لکھ دو۔

جشن کی تاریخیں بڑھا دی گئی ہیں۔ اب یہ جشن[22] کسی جگہ بھی آئندہ تین ماہ میں ہو سکتا ہے۔ یعنی ۲۳ر نومبر سے ۲۲ر فروری تک۔ یہ اس لیے کہ ضروری انتظامات کرنے میں آسانی ہو۔ اور ٹھیک طریقے سے کام ہو سکے۔

کلکتے سے جے رتن[23] کا خط آیا تھا جس سے معلوم ہوا کہ تم اپنے انگریزی[24] رسالے کا بھی ایک شمارہ اس کام کے لیے وقف کر رہے ہو۔

میں نے دراصل یہ سوچ کر اس جشن کی منظوری دے دی کہ اس طرح سے ایک صحت مند روایت کی داغ بیل پڑ سکے گی جس کے ذریعے ایک ادیب کی قومی حیثیت کو منوایا جا سکے گا اور اس جشن سے اس تحریک کو بھی تقویت ملے گی کہ ادیب اور ساہتیہ کار کل ہند پیمانے پر ہماری قومی زندگی کا ایک اہم حصہ ہیں ——

تمہارا کرشن چندر

——(۷)——

بمبئی ۵۲
۱۲-۱۲-۶۸

پیارے رام لال —— خوش رہو!

کمزور صحت کی بنا پر میں نے دلی جانے کا ارادہ منسوخ کر دیا ہے۔ ڈاکٹر نے بھی یہی صلاح دی ہے۔
تم اپنے حساب سے جشن مناؤ۔ مگر اس کی تاریخ اور پروگرام سے ضرور مطلع کرو اور جشن کے بعد پروگرام کی تفصیل

---

[20] لکھنؤ کے اس جشن میں جگن ناتھ آزاد، کلام حیدری، ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی، شہریار، بلراج کومل، امرت لال ناگر، —— شمس الرحمٰن فاروقی، محمود ہاشمی، زبیر رضوی اور ایک جرمن خاتون کیرن ڈیٹ میر بھی شریک تھیں جو اردو ہندی کے باہمی خلاف پر ریسرچ کے لیے آئی تھیں۔ اُسی روز اچانک لکھنؤ میں شیعہ سنی فساد پھوٹ پڑا جس کی وجہ سے کئی ادیب شرکت سے محروم ہو گئے پھر بھی تقریباً ستر ادیب و شاعر شریک تھے۔ میں نے اس موقع پر "کرشن چندر اور ہم" کے عنوان سے مقالہ پڑھا تھا جو اوراق لاہور میں شایع ہوا۔

[21] مسرت حسین۔ میرے ادیب دوست۔

[22] یہ جشن بمبئی اور دلی میں منایا گیا۔ دلی میں کرشن چندر کو پچپن سال پورے کر لینے پر مسز اندرا گاندھی نے دوستوں کی طرف سے جمع کیے گئے پچپن ہزار روپوں کی تھیلی پیش کی تھی۔

[23] اردو کی تخلیقات کو انگریزی میں منتقل کرنے والے مشہور مترجم جنھوں نے کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اور میری کئی کہانیاں انگریزی کے اخبارات و جرائد میں شایع کرائیں۔ انھوں نے پریم چند کے مشہور ناول "گئودان" کو بھی انگریزی میں شایع کرایا ہے۔

[24] نیو جنریشن

جو مقالے پڑھے جائیں ان کی نقل اور جو تقاریر ہوں ان کی ایک کاپی یا ٹیپ مجھے ضرور بھجوادو۔ اور ہاں تصاویر بھی اس سلسلے میں بہت ضروری ہیں۔ یہ سب ایک کتاب[25] کا حصہ ہوں گی جو بعد میں اہتمام سے چھاپی جائے گی۔ اس لیے تاکید سے ان سب باتوں کے بارے میں دوبارہ یاد دہانی کرا رہا ہوں۔ تمھارے خط کا انتظار رہے گا ——

تمھارا کرشن چندر

——— (۸) ———

بمبئی ۵۲ ۶-۹-۶۹

پیارے رام لال —— خوش رہو!

تمھارا کارڈ ملا جس میں تمھاری دختر نیک اختر عزیزی شیلا موہنی[26] کی شادی کی تقریب کی خوش خبری دی گئی ہے۔ لگن ۹ر ستمبر کا ہے۔ کاش میں اس موقع پر تمھارے ساتھ ہوتا۔ مجھے بے حد مسرت ہوتی۔ لیکن علالت مانع ہے۔ میری طرف سے خوش نصیب جوڑے کو اس یوم سعید پر بھرپور دعائیں دینا۔

میری صحت پہلے سے بہتر ہے۔ گھر سے باہر سڑک پر چل پھر لیتا ہوں۔ پندرہ بیس روز کے بعد بمبئی ہو آنے کی اجازت بھی مل جائے گی۔ ایسا لگتا ہے کہ کسی حد تک لکھنے پڑھنے کی اجازت بھی مل جائے گی، مگر ڈاکٹروں نے شرط یہ لگادی ہے کہ صرف ہلکے پھلکے مزاحیہ خاکے لکھوں، یا فلسفیانہ مضامین یا ترجمے کروں۔ قدرت کی ستم ظریفی کی داد کیسے نہ دوں۔ مگر شمع ہر رنگ میں جلتی ہے۔ امید ہے خیریت سے ہو گے ——

تمھارا کرشن چندر

——— (۹) ———

بمبئی ۵۲ ۱۴-۱-۷۰

پیارے رام لال —— خوش رہو!

میں نے مکان بدل لیا ہے۔ پتہ اوپر درج ہے۔ آیندہ خط و کتابت کے لیے اسی پتے کو استعمال کرو۔ اردو کنونشن میں تمھارا بہت انتظار رہا۔ تم نہیں آئے۔ عابد سہیل بھی نہیں آئے۔

لکھنؤ میں اردو و ہندی ادیبوں کا جو سمجھوتہ[27] ہوا تھا اس کی نقل یا بہتر ہو اگر اس کا فوٹو اسٹیٹ مع ان تمام ادیبوں کے دستخطوں کے فوٹو اسٹیٹ کے مجھے بھجوادو تو کرم ہوگا۔ یہاں اردو کمیٹی کے دفتر میں اس کی کوئی نقل یا کاپی نہیں ہے۔ یہ سمجھوتہ دوسرے دن لکھنؤ کے اخباروں میں بھی چھپا تھا اور کسی رسالے کے ٹائیٹل پیج پر میں نے اس کا سرورق دیکھا تھا۔ اگر ہو سکے

۲۵؎ یہ کتاب شایع نہ ہو سکی۔

۲۶؎ میری بیٹی شیل موہنی جو اب بیکانیر میں رہتی ہے۔ اس نے مجھ سے گھر پر اردو پڑھی تھی اور پاکستان کے متعدد افسانہ نگاروں کی تخلیقات کا ہندی میں ترجمہ کر چکی ہے۔

۲۷؎ بمبئی کا اردو کنونشن جس میں سابق وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کو اردو کے مطالبات کا ایک میمورنڈم پیش کیا گیا تھا۔ مسز اندرا گاندھی نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا کہ اردو کا مطالبہ عوام کی طرف سے آنا چاہیے۔

تو یہ سب مٹیریل مجھے بھجوا دو۔ نئے پتے پر۔ پتہ اوپر درج ہے۔
امید ہے تم خیریت سے خوش و خرم ہو گے ——

تمھارا کرشن چندر

——(۱۰)——

بمبئی ۵۴

پیارے رام لال —— مہندر جی[۲۸] نہیں رہے۔ ۲ مارچ کی صبح میں انھیں دل کا شدید دورہ پڑا —— انھیں ہسپتال لے جایا گیا۔ اُن کی حالت سدھرنے لگی۔ شام کو چھ بجے تک ان کی حالت بہت سنبھل گئی۔ پھر ایک گھنٹے کے بعد انھیں دل کا دوسرا دورہ پڑا جسے وہ برداشت نہ کر سکے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ میں اس صدمے کو کیسے برداشت کر سکوں گا؟ ——

تمھارا کرشن چندر

——(۱۱)——

بمبئی ۵۴ ۶-۴-۷۴

پیارے رام لال —— مہندر کی یاد میں تمھارا ایک مضمون چاہیے۔ یہاں سے ایک خاص کتاب[۲۹] نمبر جو بھی کچھ شایع ہو رہا ہے۔ اُردو میں۔ شری سابر دت اسے ایڈیٹ کر رہے ہیں۔ اگلے ماہ تک شایع کر دینا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے تمھارا ایک مضمون چاہیے۔ مہندر سے تمھاری دوستی تھی۔ اس کی زندگی پر اس کے ادب پر جو بھی تم مناسب سمجھو۔

یہ کام مہندر کی زندگی میں شروع ہو چکا تھا۔ اُسے اس نمبر سے بڑی دلچسپی تھی۔ اُس کی سال گرہ منانے کے بھی ارادے تھے۔ سبھی تیاریاں ہو چکی تھیں۔ کسے معلوم تھا کہ سال گرہ کے بجائے برسی کا سانحہ سامنے آئے گا۔ میری تو جینے کی آدھی خواہش ختم ہو چکی ہے ——

تمھارے مضمون، تمھارے خط، تمھاری خیریت۔ ان دنوں ہر وقت اپنے دوستوں کی زندگی کے لیے دعا مانگتا رہتا ہوں۔

تمھارا کرشن چندر

——(۱۲)——

بمبئی ۵۵ ۳-۶-۷۴

پیارے رام لال —— آج تمھارا خط ملا اور بہت دلچسپ فوٹو بھی مل گئے۔[۳۰] ساحر[۳۱] آج کل "خاموشی" کے موڈ میں ہیں، اور ہر بات پر "چپ" سادھے ہوئے ہیں۔ اس لیے جب تک وہ اس موڈ سے باہر نہ نکل آئیں اُن سے مزید گفتگو نہیں ہو سکتی کسی معاملے پر۔ ہاں نگم صاحب[۳۲] کو فون کر کے معلوم کروں گا کہ بینک میں کتنی رقم باقی ہے۔ جو ہو گی وہ فوراً بھجوا دیں گے ——

---

۲۸ کرشن چندر کے بھائی، مہندر ناتھ

۲۹ فن و شخصیت۔ بمبئی۔ جس نے "مہندر ناتھ یادگار نمبر" شایع کیا۔

۳۰ آل انڈیا غیر مسلم اردو مصنفین کانفرنس۔ لکھنؤ۔ نومبر ۱۹۷۳ء سے متعلق تصاویر۔

۳۱ ساحر لدھیانوی ۳۲ شیام کرشن نگم۔ اردو کے ایک مخلص سرپرست۔

عمر بن صباح[33] صاحب سے تمھاری تفصیلی گفتگو سے بہت سے امور پر روشنی پڑتی ہے۔ مگر اس امر کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہوا کہ جن ادیبوں کو پانچ ہزار کا انعام دیا جاتا ہے ان کی زندگی بھر کی تخلیق کے سلسلے میں وہ انعام کیا صرف ریاستی ادیبوں کو دیا جاتا ہے۔ یا اُن کا انتخاب سارے ہندوستان سے ہو سکتا ہے۔

اگر سارے ہندوستان سے ہو سکتا ہو تو اس انعام کے لیے کوشش کرو۔ مہندر کے لیے۔ میں بھی عمر بن صباح صاحب کو خط لکھ دوں گا۔

اپنے بھائی کے بارے میں بھوگنا جی[34] سے خود کچھ کہنا اچھا نہیں معلوم ہوتا، دوسروں کے بارے میں کہنے سے میں گریز نہیں کرتا۔ لیکن اپنے بھائی کے لیے میں اپنے چند بے تکلف دوستوں ہی سے کہہ سکتا ہوں۔ تم خود سوچ کر کسی سے کہلوا دو۔

فورم کے سلسلے میں خود تمھاری کچھ مدد کرتا مگر آج کل بڑے تلخ اور صبر آزما حالات سے گزر رہا ہوں۔ مگر میری عادت منور نے کی نہیں ہے۔ جو اور جس قسم کے نامساعد حالات بھی سامنے آئیں انھیں خندہ پیشانی سے قبول کرتا ہوں۔ صرف اتنا ضرور چاہتا تھا کہ غرورِ زندگی سے دو تین سال پہلے اتنی فراغت مل جاتی کہ کشمیر کے کسی کونے میں بیٹھ کر اپنی آپ بیتی اور ایک بڑا ناول مکمل کر لیتا۔

چلیے نہ سہی ——— تمھارا کرشن چندر

———(۱۳)———

بمبئی ۲۴ء ۲۳-۱-۷۷

پیارے رام لال ——— سات ماہ کی شدید علالت کے بعد کچھ دنوں سے اپنے ہاتھ سے خط لکھنے کی اجازت ملی ہے اور ہلکے پھلکے موضوعات پر طبع آزمائی کی اجازت بھی ملی ہے۔ گو ابھی تک گھر ہی میں ہوں۔ باہر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ شاید ہفتے عشرے میں مل جائے ———

کل بیسویں صدی[35] کے تازہ شمارے میں تمھارے شب و روز کی جھلکیاں دیکھیں اور تم بے طرح یاد آئے۔ سوچا جلدی سے خط لکھ دوں جانے پھر کیا ہو جائے۔

سلمیٰ[36] کی کتاب پر اپنی رائے لکھنے کا شکریہ۔ وہ ان دنوں علی گڑھ میں ہیں۔ شاید تم نے سُنا ہو گا کہ اُن کے والد پروفیسر رشید احمد صدیقی[37] کا پندرہ جنوری کو انتقال ہو گیا۔ سلمیٰ کا پتہ یہ ہے:

(MRS. SAL MA SIDDIQUI)

(CARE MRS. RASHID AHMD SIDDIQUI.)

(ZAKIR BAGH – ALIGARH.)

۳۳ء صباح الدین عمر۔ سکریٹری اُتر پردیش اردو اکادمی

۳۴ء ہیم وتی نندن بھوگنا ــــ سابق وزیر اعلیٰ اُتر پردیش

۳۵ء ماہنامہ بیسویں صدی۔ دہلی

۳۶ء سلمیٰ صدیقی کے افسانوں کا مجموعہ "مٹی کا چراغ"۔ ۳۷ء مشہور طنز نگار

صہبا لکھنوی

شخصیت کی چند جھلکیاں

(خطوط کے آئینے میں)

یہ مضمون میں نے دس سال پہلے معاصر عزیز ماہنامہ شاعر بمبئی کے "کرشن چندر نمبر"
کے لیے لکھا تھا اور اُن کے تقریباً دو سَو ذاتی خطوط میں سے چند منتخب خطوط کے حوالوں
سے کرشن چندر ایسے عظیم افسانہ نگار انسان دوست اور انتہائی پیارے اور مخلص
دوست کی شخصیت کے رنگا رنگ پہلوؤں کو اُجاگر کیا تھا۔
جیسا کہ آپ اس مضمون میں ملاحظہ فرمائیں گے، کرشن چندر اپنے خطوط میں بے تکلف
دوستوں کو دل کا حال بھی سناتے تھے اور دوستوں کے دل کی دھڑکنوں کو بھی شمار کرتے تھے۔
یہ مضمون — "کرشن چندر نمبر" میں اشاعت کے بعد بھارت کے کئی رسالوں میں نقل
ہوا لیکن پاکستان میں پہلی بار شاعر بمبئی کے شکریے کے ساتھ شایع ہو رہا ہے۔
اس کی اشاعت کا واحد مقصد کرشن چندر کی یاد کو تازہ کرنا اور اُن کی دائمی جدائی کے
صدمے کو کم کرنا ہے اور بس! ——————— صہبا

صفیہ جاں نثار اختر مرحومہ نے بھوپال کی تاریخ ساز کل ہند ترقی پسند مصنفین کانفرنس منعقدہ ۱۹۴۹ء پر "ایک ہنگامہ" کے عنوان سے نہایت دل کش رپورتاژ لکھا تھا —— اُس رپورتاژ کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"جلسے کی صدارت کا اعلان کیا گیا اور بائیں پہلو کی کرسیوں کی قطار سے کرشن چندر نکل کر اسٹیج کی طرف بڑھے۔ اندازہ بھی ہے کہ اکثر اہالیانِ بھوپال کے دلوں کی ایک دھڑکن ضرور خطا کر گئی ہوگی۔ بس یہی ہیں کرشن چندر؟ — دُبلا پتلا جسم ہی نہیں — ان کی تو آنکھیں تک کمزور ہیں۔ عینک بھی استعمال کرتے ہیں۔ لیکن یہ تو اُن کی علم دوستی کی روشن دلیل ہے۔ پھر ان کی چاند بھی تو گنجی ہے۔ مگر سُنا ہے مَردوں کی گنجی چاند خوش نصیبی کی نشانی ہے۔ لباس میں کوئی اہتمام رکھنا اُن کے بس کی چیز نہیں یا یہ خود کو اِن چیزوں سے بالاتر سمجھتے ہیں۔ ایسی "ڈھیلی ڈھالی جرزی" کل ہند کانفرنس میں مظاہرے کی چیز تو نہ تھی!
یہ تخاطب کرتے وقت دونوں ہاتھ پتلون کی جیبوں میں ڈال کر شانے کبھی کبھی ٹیڑھے بھی تو کر لیتے ہیں۔ بہرحال اب تو حاضرین

کو اُن کی صدارت کھلتی ہی ہوگی۔"

آگے چل کر لکھتی ہیں:۔

"کرشن کی شخصیت میں اثر آفرینی نہیں، لیکن کشش ضرور ہے اور اُن کے لہجہ میں اُن کی روح کی کھنک۔ تقریر تجزی پہلو رکھتے ہوئے بھی کسی موقع پر کسی کی دل آزاری کا باعث نہ تھی۔ اس لیے کہ کرشن کا حسین اسلوبِ بیان مدد کر رہا تھا۔ پرانے اسالیب بیان کو "پھٹے ہوئے جوتوں" سے تشبیہ دیتے ہوئے سن کر یا "باتھو کے ساگ" کو "لبِ لعل" ختن اور گیسوئے تتار" پر ترجیح دیتے ہوئے دیکھ کر بھی کسی کے چہرے پر برہمی کے آثار نہ تھے۔

حقیقت نگاری پر زور دیتے ہوئے کرشن نے اُردو شاعری میں زمین کی سوندھی سوندھی بو، کسان کے پسینے بھرے ہوئے مضبوط ہاتھ اور مزدور کی آنچل سے کسی ہوئی دردیوں کی کمی بتائی۔ ساتھ ہی اس ضرورت کی اہمیت کا احساس دلایا کہ۔

"ہمارے ادب کو زندگی کے ساتھ چلنا ہے اور زندگی بہت دور آسمان کے قریب پرواز نہیں کرتی، وہ دھرتی کے سینے سے لگ کر کھسکتی ہے۔" کرشن کی تنقید اپنی معنویت اور ادبیت کے اعتبار سے جواب نہ رکھتی تھی ——— "کل آزادی کا رنگ سفید تھا اور آج کالا ہو گیا ہے" ———

کرشن نے اپنے اندازِ تقریر سے سب کو موہ لیا تھا۔ اُس کی بات سنی جا رہی تھی اور مانی جا رہی تھی۔ قطع نظر اس کے کہ اُس کا سر گنجا تھا اور اُس کی جرزی "ڈھیلی تھی۔" (ماخوذ از ماہنامہ "افکار" بھوپال خاص نمبر ۱۹۴۹ء)

بس یہی ہیں کرشن چندر! یہی کچھ میرا تاثر تھا اور اس کانفرنس کے بہانے یہ میرا اُن سے پہلا تعارف تھا۔ یوں اُن کی تخلیقات بچپن سے میرے ذہن و شعور پر چھائی ہوئی تھیں۔ طالب علمی کے زمانے سے میں کرشن چندر کی تحریریں ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھتا تھا اور لطف اندوز ہوتا تھا۔ اُن کی کہانیوں کے کردار مجھے چلتے پھرتے ارد گرد نظر آتے تھے اور یہی بات مجھے سب سے زیادہ پسند تھی۔ یہی نہیں بلکہ مجھے جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا تھا وہ اُن کا خوبصورت، دلکش اور دل میں اُتر جانے والا اندازِ نگارش تھا، جس میں نہ پیچیدگی تھی، نہ اُلجھن ——— اُن کی خوبصورت نثر میں شاعری کا حسن بھی تھا، زندگی کا جلال و جمال بھی ——— نغموں کی کسک بھی تھی اور غنچوں کا تبسم بھی ——— اُس میں قہقہے بھی تھے، آہیں بھی تھیں اور کراہیں بھی ——— غرض کہ وہ سب کچھ تھا جو حیات و کائنات کی روح کو شادابی بھی بخشتا ہے اور بالیدگی بھی۔ اُن کی نگارشات کے حسن نے جو ہیولا میرے ذہن میں اُن کے سراپا کا مرتب کیا تھا، وہ بالکل مختلف تھا۔ اور اب میرے سامنے ایک ایسا شخص تھا جس کا سر بقول صفیہ بھابی گنجا تھا ——— جو ڈھیلی ڈھالی جرزی پہنے تھا ——— جس کی آنکھیں کمزور تھیں، جس کے شانے کُبڑے تھے۔ لیکن جس سے ملنے، گفتگو کرنے اور قرب حاصل ہونے کے بعد مجھے یوں لگا جیسے یہ انسان نہیں فرشتہ ہے، جس کے منہ سے بات کرتے ہوئے پھول جھڑتے ہیں۔ جس کے لب و لہجہ میں خلوص و محبت کی مٹھاس ہے۔ جس کی آنکھیں کمزور ضرور ہیں لیکن اُن میں کتنی چمک اور گہرائی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ان میں اَن گنت داستانیں چھپی ہوئی ہیں ——— یہ کبھی تخلیق کار کا روپ دھار لیتی ہیں، کبھی باپ کی شفقت بن جاتی ہیں، کبھی دوستی اور رفاقت کے اٹوٹ رشتے میں بدل جاتی ہیں اور کبھی عام انسان کے دُکھ درد میں خوں فشاں ہو جاتی ہیں۔ یہ آنکھیں کتنی روشن و تابناک ہیں اور یہ چوڑی پیشانی جس پر زمانے کے گرم و سرد حوادث کی لکیریں اُبھر آئی ہیں، کتنی پُرکشش ہے۔ ان کے لباس کی سادگی و بے نیازی میں کتنا وقار ہے اور میرے تخیل کا افسانہ نگار کرشن چندر، اُس کرشن چندر سے کتنا مختلف ہے جس سے مل کر

جسے پاکر، جس کا قرب حاصل کر کے مجھے قطعی مایوسی نہیں ہوئی بلکہ خوشی اور دلی مسرت نصیب ہوئی۔

کانفرنس کے سرپھرے ادیبوں اور کارکنوں میں، میں بھی شامل تھا اور صفیہ بھابی نے ''ایک ہنگامہ'' میں کرشن چندر کا خاکہ ہی نہیں اڑایا تھا، ہم میں سے چند کارکنوں کو بھی نشانہ بنا ڈالا تھا، حالانکہ ہمارے نام اور کام کے اظہار کے بغیر بھی یہ رپورتاژ تاریخی بن سکتا تھا ـــــ بنا تھا ـــــ

ـــــ تاریخیں قریب آرہی تھیں اور منتظمین سوتے جاگتے کانفرنس ہی کے خیال میں مبتلا تھے۔ ایسے آزمائش کے دور میں شخصیتوں کا مطالعہ بھی ایک دلچسپ موضوع ہے۔ اختر (جاں نثار) کی مستعدی و سراسیمگی، اختر سعید کی لطافت پسندی اور خلوص برادری، احسن علی خاں کی مستقل مزاجی اور خود اعتمادی کے بیک وقت امتزاج اور انھیں کی ٹکر سے کانفرنس کی تیاری پختہ ہو رہی تھی۔ ادھر صہبا پوسٹروں کے ذریعہ بڑے بڑے بلند آہنگ اعلانات کر رہے تھے۔ بغیر اس اندیشہ کے کہ اُن کی لاج انجمن رکھ سکے گی یا نہیں۔ صہبا کی یہ خوش اعتقادی ''امید یقین کی اکلوتی بیٹی'' کا خیال تازہ کر دیتی تھی۔ قمر جمالی قلم کی کاوش اور ہاتھ کی محنت سے مساوات رائج کرنے کا بیڑا اٹھائے ہوئے تھے۔ منٹو ہال کی آرائش کے سلسلے میں گیلری کی کارنسوں پر قدم ٹکا ٹکا کر تصویریں آویزاں کرنے کی گواہی وہاں کے چپراسیوں تک سے وہ بآسانی دلوا سکتے ہیں ـــــ

بھوپال کے سیاسی انتشار کی وجہ سے قدم قدم پر روڑے اٹک رہے تھے۔ لیکن ''خضر مل جاتے ہیں، جن کو راستہ ملتا نہیں'' بھوپال کے اکثر نیتاؤں نے مدد کی۔ ظہور ہاشمی نے منٹو ہال میں کانفرنس کرنے کی اجازت دی۔ کامتا پرشاد جی نے سواری اور روشنی کا انتظام سر لیا۔

جلال قریشی صاحب نے اپنے CASTING VOTE کے ذریعہ میونسپل بورڈ کی جانب سے تین سو کا عطیہ پیش کر کے عوام کے پیسے عوام کے کام میں شامل کرائے۔ حامد سعید خاں صاحب نے اپنے وسیع دامنِ عاطفت میں بگڑوں، بھلوں سب کو پناہ دینے کا وعدہ کر کے قیام اور طعام کا انتظام اپنے ذمہ لیا　ساتھ ہی استقبالیہ کمیٹی کی صدارت قبول کی۔ بات آگے بڑھی اور ''یزداں بہ کمند آور اے ہمت مردانہ'' کے جنون میں ترقی پسند ادیب کانفرنس کے افتتاح کرنے کی رضا مندی علامہ سلیمان ندوی صاحب سے لے آئے۔ اب تو انجمن کے سر پر سوتے جاگتے مریم کا مقدس ہاتھ تھا اور وہ ہر بلا اور آفات سے محفوظ ہونے کا یقین کر سکتی تھی ـــــ

جاں نثار اختر، احسن علی خاں، اختر سعید، رشدی، قمر جمالی، ابراہیم یوسف، انجم سلمانی، محمد علی تاج، وحیدی الحسینی، اطہر سعید، اشتیاق عارف اور راقم الحروف، اس کانفرنس کے انتظامات میں عملاً شریک تھے۔ پھر ادیب خواتین کا ایک قافلہ تھا، جس کی سربراہی خود صفیہ بھابی نے اپنے ذمے لے لی تھی۔ اُن کے ساتھ اختر جمال تھیں، زہرہ جمال تھیں، کالج کی کارکن لڑکیاں تھیں، اور یہ ریاست بھوپال تھی، جس کی تاریخ میں ہم چند سرپھروں نے یہ کانفرنس منعقد کر کے نئی ادبی تاریخ کی داغ بیل ڈالی تھی ـــــ کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں علامہ سلیمان ندوی شریک تھے جو ہماری رہنمائی کر رہے تھے۔ بمبئی اور دلی سے ادیبوں کا ایک قافلہ آگیا تھا، جس میں کرشن چندر تھے، عصمت آپا تھیں، شاہد لطیف تھے، مجروح تھے، مہندر ناتھ تھے، غلام ربانی تاباں تھے، عادل رشید تھے۔ دلی سے قبلہ رندانِ عالم حضرت جوش بھی آپہنچے تھے، پنڈت سندر لال بھی ناسازیٔ طبع کے باوجود بھوپال آگئے تھے اور بھوپال کے پہلے کالج کے وسیع منٹو ہال میں، چار روز تک کانفرنس کے اجلاس ہوتے رہے تھے اور بھوپال کے اہلِ ذوق نے بڑھ چڑھ کر ان اجلاسوں میں شریک ہو کر

ہماری کوششوں کی داد دی تھی۔

بھوپال کی تاریخ میں پہلی بار بھوپال کے عوام و خواص نے عصمت آپا اور کرشن چندر کو افسانے اور خطبے پڑھتے ہوئے دیکھا اور یہ تاریخ ساز کانفرنس پورے شکوہ کے ساتھ چار روزہ منعقدہ کر کامیابی سے ختم ہو گئی تھی۔ اور چند ایسی یادیں اور نقوش بھوپال کی محدود ادبی فضا میں چھوڑ گئی تھی، جن کی گواہی منٹو ہال کے در و دیوار ہمیشہ دیتے رہیں گے اور آیندہ جب کبھی بھوپال کی نئی ادبی تاریخ لکھی جائے گی اس یادگار و نمایندہ پہلی ادبی کانفرنس کا ذکر ضرور ہوگا۔

چار روزہ کانفرنس کے دوران ہی کرشن سے میری ملاقاتیں بہت جلد گہری دوستی میں تبدیل ہو گئیں اور پھر اُن کے بمبئی جانے کے بعد افکار، صہبا اور کرشن ایک ہی سلسلے کی کڑیاں بن گئے۔

کرشن سے میری دوسری ملاقات بھیمڑی کانفرنس (بمبئی) میں ہوئی، جہاں کرشن، بیدی، ڈاکٹر ملک، راج آنند، عصمت آپا، شاہد لطیف، کیفی وغیرہ کے علاوہ پورے ہندوستان سے ادیبوں کے وفود آ کر شریک ہوئے تھے۔ بھوپال سے شرکت کرنے والے ایک درجن سے زاید ادیبوں میں جاں نثار اختر، احسن علی خاں، ارشدی، اختر جمال اور راقم الحروف شامل تھے۔ لگ بھگ چار سَو ادیبوں کا مثالی اجتماع تھا۔ چار روزہ کانفرنس کے لگاتار اجلاس منعقد ہوئے اور ترقی پسند مصنفین نے اپنے وجود کی جنگ کے لیے انقلابی فیصلے کیے، جو اب صرف یادوں کے چراغ بن کر جھلملا رہے ہیں۔ اس کانفرنس کو بمبئی کے بے تاج بادشاہ مرارجی ڈیسائی[1] اور اُن کی حکومت نے ممنوع قرار دے دیا تھا۔ لیکن بمبئی کے مخلص اور جفاکش ادیبوں، خصوصیت کے ساتھ عصمت آپا، شاہد لطیف اور کیفی کی بے مثال قربانیوں اور عملی کوششوں پر آفرین ہے کہ انھوں نے ہر قسم کے موانع و مشکلات اور کانفرنس کے سرگرم کارکن سردار جعفری کی گرفتاری کے باوجود چار سَو سے زیادہ ادیبوں کو بھیمڑی میں جمع کر کے نہ صرف چار روزہ کانفرنس منعقد کی بلکہ سب کے لیے خورد و نوش اور ممکنہ آرام و آسائش کی سہولتیں بھی فراہم کیں۔ کانفرنس ختم ہوئی تو ہم کرشن کے مہمان ہو گئے۔

اور پھر کچھ یوں ہوا کہ کانفرنس کے بعد جب بھوپال پہنچے تو مجھے سرکاری احتساب نے اپنی گرفت میں لے لیا۔ جہانگیریہ ہائی اسکول میں مجھے بحیثیت مدرس احکامِ معطلی کا سامنا کرنا پڑا — یہ بات ۱۹۵۰ء کے آغاز کی ہے۔ لیکن جہاں میں نے ادبی عمر کی ابتدائی منزلیں سَر کی تھیں اور جو شہر میرے وطنِ ثانی کی حیثیت رکھتا ہے، وہاں میری معطلی کا یہ سانحہ ایسا نہ تھا کہ بے اثر جاتا۔ اختر سعید خاں ایڈوکیٹ اور مشتاق علی خاں ایڈوکیٹ میری مدافعت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور بھوپال کے تمام ادیبوں نے مل جل کر میرے لیے ہر قسم کے تحفظ کا انتظام کر دیا — روزنامہ "ندیم" میں کالم نویسی مل گئی اور اس طرح میں اور میرے جواں سال مرحوم بھائی کے پانچ معصوم بچے اور اُن کی بیوہ جو میری کفالت میں تھے، فاقوں سے بچ گئے۔ تین ماہ تک پیشیاں ہوتی رہیں اور باقاعدہ معطلی کا مقدمہ لڑا گیا اور جب ادیب دوستوں کو علم ہوا کہ یہ سب کچھ ترقی پسند مصنفین کانفرنس بھوپال کے "ناظمِ نشر و اشاعت" بننے کی سزا دی گئی ہے تو انھوں نے آزاد جمہوری حکومت کا دل کھول کر مذاق اُڑایا کہ جس حکومت کے نیتاؤں کی عملی امداد و اعانت سے ہم نے یہ کانفرنس منعقد کی تھی، وہی اس کے انعقاد پر سزا دے رہی تھی۔ میں نے تین ماہ کی معطلی کا زمانہ بلا کسی تردد و پریشانی کے نہایت

---

[1] موجودہ وزیر اعظم بھارت اُس وقت کانگریس سے وابستہ تھے۔

افکار

صہبا لکھنوی

اطمینان سے گزرا۔ بالآخر ریاستی حکومت کے ایڈمنسٹریٹر صاحب نے میرے وکلا کی نہایت مدلل اور کامیاب پیروی کے نتیجہ میں مجھے ملازمت پر بحال کر دیا۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ یا تو میں ملازمت کروں۔ یا "افکار" کی ادارت۔ (جس کی قانونی اجازت بحیثیت ملازم سرکار میں نے ریاست کے اعلیٰ حکام سے لے رکھی تھی اور ۱۹۴۵ء سے "افکار" کے ادارے میں رُشدی کے ساتھ شامل تھا) دوسرے معنوں میں یہ میری زندگی اور موت کا مسئلہ تھا۔ ایک طرف ۳۰ روپے (اور گرانی الاؤنس سمیت تقریباً ۵۵ روپے) کی مُدرّسی تھی ــــ دوسری طرف "افکار" تھا۔ میری تمام تر زندگی اور جدوجہد کا حاصل اور اُس کی بقا کے لیے جان کی بازی لگانے کا مسئلہ تھا۔ تین ماہ اسی شش و پنج میں گزر گئے۔ بالآخر میں نے ۱۵ اگست ۱۹۵۰ء کو (جس دن بھارت آزاد ہوا تھا) دس سال کی جکڑبندی سے آزادی حاصل کر لی اور دسمبر ۱۹۵۰ء میں پاکستان آگیا اور میرے ساتھ ماہنامہ "افکار" بھی۔

اور اب نئی فضا نئے ماحول اور نئی سرزمین میں مجھے جینے کے اسباب فراہم کرنا تھے۔ اس دوران کرشن سے میرا قلمی رابطہ تقریباً ختم ہو گیا۔ لیکن مہاجرین کی کارپوریشن سے جب مجھے دو ہزار کی رقم بطور قرض مل گئی تو سویا ہوا جذبۂ ادارت پھر سے بیدار ہو گیا اور کراچی کے ادیبوں کی حوصلہ افزائی کے نتیجہ میں، میں نے "افکار" کا ڈیکلریشن حاصل کر کے اپریل ۱۹۵۱ء سے "افکار" کے دوسرے دَور کا آغاز کر دیا اور "افکار" کے اجرا کے ساتھ ہی کرشن سے میرا انچھر رابطہ قائم ہو گیا۔ اور آج جب میں یہ سطور لکھ رہا ہوں ــــ کرشن سے بچھڑے ہوئے اگرچہ صرف سترہ سال ہوئے ہیں۔ لیکن یوں لگتا ہے، جیسے جُگ بیت گیا ہو۔ کرشن سے میری صرف دوبارہ ملاقات ہو سکی ہے۔ اس لیے مجھ سے یہ توقع رکھنا کہ میں اُن کی شخصیت کے تمام پہلوؤں پر اور خصوصیت کے ساتھ کمزور پہلوؤں پر کچھ کہنے کی اہلیت رکھتا ہوں۔ زیادتی ہوگی۔ اس منصب کے اہل تو کرشن کے وہ رفیق و جلیس ہیں جن کے شب و روز کرشن کی معیت میں گزرے ہیں اور جنھوں نے اُن کی زندگی، شخصیت اور کردار کے ہر پہلو کا قریب سے مطالعہ کیا ہے۔ البتہ میں آپ کو اُس کرشن چندر سے ضرور متعارف کرا سکتا ہوں، جس کا وطن لاہور ہے۔ جو آزادی سے بہت پہلے دلی میں تلاشِ معاش کے سلسلے میں مقیم رہا ہے۔ اور پھر جس نے بمبئی میں مستقل سکونت اختیار کر لی ہے اور جس نے آزادی کے بعد بھی اُردو زبان و ادب کے رشتوں کو ناقابلِ تقسیم سمجھ کر ہمیشہ اُردو زبان و ادب کی خدمت کو ہی مقصدِ حیات سمجھا ہے اور جسے مَیں ذاتی طور پر پریم چند کے بعد جدید دَور کا سب سے بڑا، باشعور، دردمند اور مخلص افسانہ نگار، ناول نگار اور طنز نگار سمجھتا ہوں۔ میں اُس کرشن سے بھی آپ کو متعارف کرانے کی اہلیت رکھتا ہوں جس نے ہزاروں میل دُور رہنے کے باوجود مجھے ایک حقیقی بھائی کی محبت اور شفقت سے ہمیشہ نوازا اور جس کی رفاقت، امانت اور دوستی پر مجھے ہمیشہ ناز رہا ہے اور رہے گا۔ سچ پوچھیے تو میرے اور کرشن کے بظاہر کاروباری (یعنی ادیب و ناشر کی حیثیت سے) لیکن انتہائی مخلصانہ اور برادرانہ روابط کا آغاز پاکستان آنے کے بعد ہی ہوا۔

۱۹۵۲ء کے آخر میں، میں نے کرشن کو لکھا کہ "افکار" کو زندہ رکھنا میرے لیے مشکل ہو رہا ہے اور اس کا صرف یہی ایک راستہ ہے کہ میں بینک سے قرض لے کر تمہاری کتابوں سے "مکتبہ افکار" کی ابتدا کروں۔ اس لیے تم اپنے افسانوں اور ناولوں کے مجموعے مجھے اشاعت کے لیے بھیج دو اور مجھ پر بھروسہ کرو ــــ تمہاری رائلٹی، پائی پائی ادا کر دوں گا۔ دیر ہو سکتی ہے اندھیر نہیں ہوگا!ــــ

لہ اور ۲۰ ویں سال میں کرشن ہم سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئے۔

میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، جب کرشن نے بغیر شرائط عاید کیے مجھے افسانوں کا پہلا مجموعہ "کالا سورج" اشاعت کے لیے بھیج دیا جسے میں نے ستمبر ۱۹۵۳ء میں شایع کیا۔

"مکتبۂ افکار" کی یہ پہلی کتاب تھی —— ادبی رسالے کی ادارت ایک علاحدہ فن ہے (جس کی تکمیل کا شاید ہی کوئی دعوٰی کر سکے کہ ہر دور میں ہر مدیر نے صرف اپنی صلاحیتِ کار کے مطابق رسالے نکالے ہیں اور ادبی معیار قایم کیے ہیں) اور کتابوں کی اشاعت ایک علاحدہ فن۔ چنانچہ ناتجربہ کاری کے سبب پہلا مجموعہ بہت خراب چھپا —— کاغذ کی مشکلات تھیں اس لیے ہم نیوز پرنٹ پر اُسے چھاپ سکے۔ لیکن میں نے حوصلہ نہیں ہارا۔ کرشن کو ناول کے لیے لکھا۔ انھوں نے وعدہ کیا اور پھر کوئی سال بھر تک مجھے جواب نہ ملا تو میں نے بہت سخت خط "انھیں لکھ" ڈالا۔ جواب آنے پر دوبارہ لکھا۔ سہ بارہ لکھا اور جب تیسرے خط کا بھی کوئی جواب نہ ملا تو صبر کر کے بیٹھ رہا —— یکایک ایک دن ڈاک میں ایک آسمانی رنگ کا لفافہ ملا جس کی مانوس سی تحریر دیکھ کر میں نے پہچان لیا کہ یہ کرشن چندر کا خط ہے۔ بے اختیار کھولا۔ لکھا تھا۔

BOMBAY.

17.10.56.

پیارے صہبا ——

اُفوہ! —— کس قدر خفا ہو —— یعنی خط لکھنا بھی بند کر دیا۔ بس "افکار" اپسے بھیج دیتے ہو یعنی بالکل ایسے ہی، جیسے اس کمبخت کو اب پرچہ تو بھیجنا ہی پڑتا ہے ورنہ ——!

اچھا، آؤ —— صلح کریں —— تمھیں کیا معلوم؟ —— یورپ سے آکر ہم کیسی کیسی مصیبت میں گرفتار رہے۔ عرصہ تین ماہ سے ایک نرسنگ ہوم میں اپنی بچی کی علالت کے سلسلے میں ٹھوکریں کھا رہے ہیں اور ابھی دسمبر تک اور رہنا پڑے گا۔ اس پر تمھاری خفگی! ستم بالائے ستم نہیں تو اور کیا ہے؟

غصہ تھوک دو، سُنو ہم تمھارے لیے ایک خوش خبری لائے ہیں۔ ہم نے تمھارے لیے ناول ختم کر لیا۔ پرسوں ختم کیا ہے، لو اب تو خوش ہو جاؤ۔ دیکھ لو انتہائی مصیبت کے دنوں میں بھی تمھیں بھولے نہیں ہیں۔ مگر ناول بڑا نہیں ہے۔ "جب کھیت جاگے" جتنا ہوگا۔ ڈیڑھ سو صفحات کا۔ اب تم اسے جلدی سے چھاپ لو۔ مگر کاغذ ذرا اچھا لگانا اور چھپائی کے لیے بھی کوشش کرو کہ پہلے سے بہتر ہو۔ عنوان ہے "آسمان روشن ہے"۔

اب میں دو چار دن تک تو اسے دیکھوں گا ہی نہیں۔ اس کے بعد نظر ثانی کروں گا۔ وہ دو چار دن کا کام ہوگا۔ اس کے بعد اُس کی نقل کرا کے تمھیں بھجوا دوں گا۔ یہ سب کام دس پندرہ دن میں ہو جائے گا۔ اب تم اپنی کہو اور مفصّل لکھو۔ عرصے سے تم نے خط نہیں لکھا۔

تمھارا

کرشن چندر

اور پھر خطوط کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہر مہینے دو چار خط وہ لکھتے اور دو چار میں لکھتا۔ یہ سلسلہ بڑی پابندی سے جاری رہا۔ کرشن کے خطوط کی تعداد جو گزشتہ دس سال میں انھوں نے مجھے لکھے ہیں، ڈیڑھ سو سے زائد ہوگی۔ بیسیوں خطوط کرشن کی کتابوں کے مقدمات کے سلسلے میں، میں نے عدالت میں پیش کیے تھے جو ابھی تک واپس نہیں ملے ہیں، اس لیے یہ اندازہ کم و بیش ہو سکتا ہے۔

ذاتی خطوط، کسی بھی ادیب کی زندگی کا آئینہ ہوتے ہیں۔ ان میں اپنے بے تکلف دوستوں کو وہ سب کچھ لکھ دیتا ہے جو وہ

محسوس کرتا ہے کہ کرشن کے اُن خطوط میں جو ہماری دیرینہ دوستی، رفاقت اور محبت کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ وہ سب کچھ ہے، جن سے ایک ادیب کی زندگی کے نشیب و فراز، اُس کی تلخیاں، کامرانیاں، اس کی آسودگیاں، ناآسودگیاں، اُس کے قلب کی تپش، ذاتی مسائل، دنیا کے مسائل، امن اور جنگ کے مسائل، بیماری اور غم، غرض کہ کوئی ایسا پہلو نہیں، جس کا اظہار ان خطوط میں نہ کیا گیا ہو۔ یہ خطوط کبھی کاروباری نہ بن سکے۔ اس کا سبب میری دانست میں کرشن کا وہ اعلیٰ کردار اور شخصیت کا وہ تابناک پہلو ہے، جس سے ان کی ساری زندگی عبارت ہے۔ فن کی طرح اُن کی شخصیت میں بھی تضاد کا کوئی پہلو نہیں۔ اُن کے خطوط کے اقتباسات پیش کرنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ آپ اس عہد کے عظیم فن کار کو اس کی تحریر کی جھلکیوں میں بھی دیکھ اور پرکھ لیں کہ اُس کی شخصیت کتنی مکمل، کتنی مَن موہنی، کتنی کشش آفریں ہے اور جو کچھ وہ عام زندگی میں ہے وہی کچھ اپنی نجی تحریروں میں نظر آتا ہے۔

چند خطوط کے دلچسپ اقتباسات میرے اس قول کی صداقت کا ثبوت بہم پہنچائیں گے، جنھیں میں کرشن کی اجازت کے بغیر پیش کر رہا ہوں اور مطمئن ہوں کہ وہ میری اس جسارت کو ضرور معاف کر دیں گے۔

اب کچھ ان خطوط کے بارے میں ——

کرشن نے اپنے ہر خط کو "پیارے صہبا" سے شروع کیا ہے اور "تمھارا کرشن چندر" پر ختم کیا ہے۔ اس وضع داری میں آج تک کبھی کوئی فرق نہیں آیا۔ اُن کے خطوط کے سلسلے میں یہ بات بھی کم دلچسپ نہیں کہ انھیں نیلا کاغذ پسند ہے، گہرا اور ہلکا دونوں۔ میرے خطوط کی فائل میں بمشکل ۸، ۱۰ خط ایسے ہوں گے جو سفید، پیلے یا بھورے رنگ کے کاغذ پر تحریر ہیں۔ میں نے کبھی کرشن کا مطبوعہ پیڈ نہیں دیکھا اور نہ آج تک مجھے کوئی ایسا خط ملا جس پر ان کا نام پتہ چھپا ہو۔ سادہ سے گہرے یا ہلکے نیلے کاغذ پر چھوٹے چھوٹے حروف میں خط لکھنے والا یہ فن کار اس معاملہ میں بھی قدامت پسند ہے۔ لیکن ایک کمزوری کا ضرور شکار ہے۔ ہر خط پر مکمل پتہ یا شہر کا نام جہاں سے انھوں نے خط لکھا ہے —— وہ انگریزی میں لکھنے کے عادی ہیں۔ مثلاً بمبئی سے خط لکھا ہے تو اُردو میں لکھنے کے بجائے انھوں نے انگریزی میں BOMBAY. لکھا ہے اور اس کے نیچے تاریخ بھی انگریزی میں ہی درج کی ہے۔ خطوط کے اقتباسات میں، میں اُن کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر جوں کا توں لکھنے کی جرأت کر رہا ہوں تاکہ آیندہ وہ برائے نام انگریزی کے رسمی تکلف سے بھی چھٹکارا حاصل کر لیں۔ لفافہ پر پتہ وہ بیشتر اردو میں لکھنے کے عادی ہیں، لیکن اکثر انگریزی میں بھی لکھتے رہے ہیں۔ اب چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:-

BOMBAY.

11.11.56.

تمھارا خط ملا۔ تفصیلی خط پھر لکھوں گا۔ تمھاری تجاویز سے مجھے اتفاق ہے۔ تم کام شروع کر دو۔ مجھے تم پر پورا بھروسہ ہے۔ ادائیگی کے بارے میں زیادہ فکر نہ کرو۔ مجھے معلوم ہے —— جیسے جیسے تم سے ممکن ہو سکے گا، تم خود ادا کرتے جاؤ گے۔ اب تم کمرکس کے کام شروع کر دو۔

تین ماہ بعد میرا دوسرا ناول تیار ہو جائے گا ——

BOMBAY.

5.1.57.

یعنی کتاب ملنے کے بعد ایسی خاموشی؟ رسید تک سے مطلع نہ کیا　اچھا اب سنو! "افکار" کے لیے ایک قسط وار ناول کا سلسلہ شروع کرنا چاہتا ہوں۔ کیا خیال ہے؟ بارہ یا پندرہ قسطوں میں ختم ہو جائے گا۔ ذرا غور کر کے لکھو۔ پاکستان سے بہت سے رسالے قسط وار ناول کے لیے مانگ کر رہے ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ تم اس سلسلے میں پہل کر جاؤ۔
حنیف کے بارے میں لکھو اور کہیں سے بھی کوشش کر کے رقم بھجواؤ۔ کیونکہ آج کل مطلع بالکل صاف ہے۔ یعنی ——— "آسمان روشن ہے" ———

BOMBAY.

1.3. 57.

——— ادھر دونوں ملکوں کے درمیان نفرت اس قدر بڑھ چلی ہے۔ محبت کی اس قدر کمی محسوس ہوتی ہے کہ جی لوٹنے لگا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ زہر کب دور ہوگا، کتابیں پڑھنے کا ذوق اس قدر کم ہے کہ اپنی بے بضاعتی پر افسوس آتا ہے۔ یعنی ہم کچھ کر ہی نہیں سکتے۔ ہمارے سامنے "لڑائی" ہوتی ہے ——— لوگ مرتے ہیں۔ مار دیے جاتے ہیں ——— غریبی، بے کاری ——— پریشانی، زبوں حالی میں دن رات اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے اور ہم کچھ کر نہیں سکتے۔ کبھی کبھی افسوس ہوتا ہے۔ خدا نے مجھے "کتے" کا ذہن کیوں نہیں دیا ——— بس پڑے پڑے دُم ہلایا کرتے اور آرام سے کھایا کرتے۔ بلکہ اُس وقت تک کہیں نہ کہیں وزیر ہوتے جی! ———
اچھا خوش رہو ——— تم سے چند منٹ باتیں کر کے جی کی بھڑاس نکال لی۔ ورنہ ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔ اپنا کام تو اپنا کام کیے جانا ہے ——— بس! ———

BOMBAY.

13.3. 57.

——— تمہارا خط ملا۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔ یہ ناول اسی طرح لکھا جائے گا کہ تم مجھے خط لکھتے رہو گے۔ یاد دہانی کراتے رہو گے۔ پریشان کرتے رہو گے اور میں قسطیں لکھتا رہوں گا۔
تم یاد دہانی کرنے میں تساہل نہ کرنا اور ضرورت پڑے تو خفگی سے بھی کام لینا۔ پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میرے خیال میں ایک ماہ پہلے قارئینِ افکار کو "خبردار" کر کے یہ سلسلہ شروع کرو۔ خبردار یعنی "مژدۂ جانفزا" یا "جان لیوا" جو بھی تم سمجھو ———
تم فلموں کے لیے گانے لکھ رہے ہو ——— یہ بے حد عمدہ بات ہے۔ یعنی "افکار" تو "فکر" کی جمع ہے، دولت کی نہیں، اس کے لیے تو دوسرے دروازے کھٹکھٹانے پڑتے ہیں۔ کیا کریں ———

BOMBAY.

15.5. 57.

——— بارہ دن کے بعد بسترِ علالت سے آج اٹھا ہوں۔ انفلوئنزا نے آ دبایا تھا۔ چار چھ روز تک تو

کچھ لکھا نہ جا سکے گا۔ اس کے فوراً بعد سب سے پہلے تمہارا کام کروں گا۔ خیال تھا کہ تمہیں اس سلسلے میں کبھی کوئی تکلیف نہ ہونے دوں گا اور قسطیں ہر وقت تمہیں ملتی رہیں گی ۔۔۔ مگر خرابیٔ صحت کو کیا کروں۔ دعا کرو کہ اب جو بیمار پڑوں تو تمہارے لیے دو قسطیں لکھنے کے بعد۔ اس سے پہلے نہیں ۔۔۔ یعنی بیماری بھی قسطوں میں ہو تو مزا ہے، ورنہ اندیشہ ہے۔ "نیلام گھر" لکھتے لکھتے اپنی صحت نیلام ہو جائے گی۔ تم سے زیادہ "افکار" کے چاہنے والوں سے شرمندہ ہوں ۔۔۔

BOMBAY.

7.10.57.

۔۔۔ جواب میں قدرے تاخیر ہو گئی ۔۔۔ یہ امر قدرتی تھا، میرے بس سے باہر! ہوا یہ کہ مجھے کلکتہ جانا پڑا۔ واپسی پر قدرے بخار تھا۔ لہذا BY AIR بمبئی پہنچا۔ کون جانتا تھا کہ یہ مصیبت ناگہانی میرا پیچھا ہی نہ چھوڑے گی۔ لاکھ جتن کیے پھر بھی بخار 106 ڈگری سے زیادہ نہ ہوا ۔۔۔ معاف کرنا میرا مطلب ہے کم نہ ہوا۔ یکم اکتوبر سے آج کے دن تک خوب کشمکش رہی۔ اب قدرے طبیعت ٹھیک ہے، گو کہ کمزوری باقی ہے۔ پھر بھی چند دن میں تفصیل سے خط لکھوں گا۔

رہا "نیلام گھر" تو اس کے متعلق اتنا ہی کہوں گا کہ ماہ نومبر تک مکمل ہو جائے گی۔ پھر تم چھاپ لینا۔ "افکار" میں بھی اور کتابی صورت میں بھی۔

BOMBAY.

8.12.59.

۔۔۔ اس سے پہلے تمہیں ایک خط لکھ چکا ہوں۔ جس میں، میں نے تمہیں یہ مژدہ سنایا تھا کہ ناول میں نے مکمل کر لیا ہے۔ جس کے جواب میں تم نے اب یہ مژدہ سنایا ہے کہ کسی "بک ڈپو" نے لاہور میں میرا نامکمل ناول ہی "چھاپ ڈالا" ہے۔ دراصل اس بات پر سب سے زیادہ مسرت تو تمہیں ہونا چاہیے کہ تمہارا مصنف اس قدر مقبول ہے کہ لوگ اس کی نامکمل تحریر چھاپنے سے بھی گریز نہیں کرتے، یا پھر اس کی تحریریں اتنی عنقا ہیں۔ اس لیے کہیں سے ہی چھاپ لو۔ کہیں پر ناول کو ختم کر دو۔ کیا فرق پڑتا ہے؟ ۔۔۔ ادبی چوریاں تو ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں برابر ہو رہی ہیں۔ مکمل ڈھٹائی اور بے حیائی سے۔ لیکن کسی نامکمل ناول کو جو ابھی لکھا جا رہا ہے، جو ابھی مصنف کے ذہن میں ہے، جو ابھی منصۂ شہود پر نہیں آیا، اُسے اِس نا پُختہ حالت میں چھاپ کر عوام کے سامنے پیش کر دینا واقعی بہت بڑی جسارت ہے! کیا ہی اچھا ہو اگر ادھر ہندوستان میں کوئی ناشر قدرت اللہ شہاب کا آدھا افسانہ، احمد ندیم قاسمی کی نصف نظم اور جوش صاحب کی تین چوتھائی رباعی شایع کر دے۔ اس سے اگر کچھ نہ ہوا تو اتنا ضرور ہو جائے گا کہ اردو ادب میں نئے تجریدی تجربوں کے لیے راہ کھل جائے گی! ۔۔۔

کیا میں دونوں ملکوں کی حکومتوں سے پوچھ سکتا ہوں کہ اگر آپ نہری پانی کے سلسلے میں سمجھوتے پر آمادہ

ہو سکتے ہیں تو اُن نہروں کے بارے میں کیوں کوئی سمجھوتہ نہیں کر سکتے جو دونوں ملکوں میں یکساں ادب کو سیراب کرتی ہیں؟——

BOMBAY.

10. 5. 60.

—— حسبِ ارشاد ایک افسانہ بعنوان "سپیرن" تمھیں بھجوا رہا ہوں۔ افسانے کی رسید اور اپنی خیریت سے مطلع کرو۔ یہ بھی بتاؤ کہ کتاب کب تک مارکیٹ میں آجائے گی اور مجھے کب ملے گی؟ کب تک مزید انتظار کرنا پڑے گا۔
یہ پتہ نہیں چلا کہ رائٹرس گلڈ کے نئے انتخابات میں کون لوگ چنے گئے ہیں۔ ذرا بتاؤ تو سہی جمیل الدین عالی کا پتہ مجھ سے کھو گیا ہے۔ دوبارہ لکھ بھیجو۔ تمھارے مقدمہ کا کیا ہوا؟ میں نے تمھیں تحریر بھجوا دی تھی۔ امید ہے مل گئی ہوگی۔
رائٹرز گلڈ چور پبلشروں کے سلسلے میں کیا کر رہا ہے؟
آج کل یہاں شدید گرمی کا عالم ہے۔ بس یہ آخری افسانہ ہے جو اس سیزن میں لکھا گیا ہے۔ اب تو گرمی گزر جانے کے بعد ہی کچھ لکھا جا سکے گا۔ یا اگر پہاڑ پر کہیں جانا ہوا تو——!

BOMBAY.

2. 9. 60.

—— کل تمھیں بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک ناول کا مسودہ روانہ کر چکا ہوں۔ ناول ملتے ہی رسید سے مطلع کر دینا۔ یہ اشد ضروری ہے۔ میں دس تاریخ کو یہاں سے دہلی جاؤں گا۔ اپنی بچی کے علاج کے سلسلے میں اُس کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ اب وہ گھر میں رکھی نہیں جا سکتی۔ مارتی پیٹتی اور اُول جلول بکتی ہے۔ اس لیے اُسے لے جا رہا ہوں۔ دہلی کے مینٹل ہاسپٹل میں سُنا ہے ایک نیا علاج امریکہ سے آیا ہے۔ اُسے آزماؤں گا——

DELHI.

1.12.60

—— ایک عرصے کے بعد تم سے ہم کلام ہوں۔ تم نے خیریت نہیں پوچھی، یہاں کیا قیامت گزر گئی۔ کیسے کیسے حالات سے دوچار رہا۔ بچی کی حالت یکا یک بگڑ گئی۔ دو ماہ بمبئی میں گھر سے باہر نہیں نکل سکا۔ کسی نہ کسی طرح دو ملازموں کی مدد سے اُسے دہلی علاج کے لیے لایا۔ مگر یہاں ڈیڑھ ماہ علاج کرنے کے بعد بھی جب کوئی افاقہ نہ ہوا اور حالت دن بہ دن بگڑتی گئی تو اُسے ناچار رانچی لے گیا۔ میرا بھائی کو ساتھ لے گیا دو ملازموں کو ساتھ لے گیا۔ کیونکہ بچی بات بات پہ برہم ہو کر بے قابو ہو جاتی تھی، اور تشدد پر تُل جاتی تھی۔ الگ بوگی بُک کی۔ ارے کیا کیا مصیبتیں اٹھائیں۔ کسی نہ کسی طرح سے رانچی پہنچے۔ بچی کو رانچی کے ہسپتال میں داخلہ دلوایا۔ دس بارہ

دن وہاں خود رہا۔ مگر ڈاکٹروں نے فی الحال علاج شروع نہیں کیا ——— کہا ہے کہ ایک ماہ وہ اُسے زیرِ معائنہ رکھیں گے۔ ایک ماہ کے بعد علاج تجویز کریں گے۔ ہو سکتا ہے آپریشن ہو۔ ہو سکتا ہے کوئی دوسرا علاج ہو۔ بہرحال اگلے ہفتے عشرے میں ڈاکٹروں کی رپورٹ مجھے یہاں مل جائے گی۔ اُس کے بعد پھر مجھے رانچی جانا ہوگا۔ اور تمام ضروری کاغذی کارروائیوں کے بعد علاج شروع ہوگا۔ اگر آپریشن ہوا تو مجھے دو تین ماہ تک وہاں رہنا پڑے گا، ورنہ جلد واپسی ہوگی۔ بہرحال جنوری کا مہینہ پھر شمالی ہند میں گزرے گا۔ فلمی کام بند ہے، ادبی کام بند ہے، دماغ بند ہے، صرف زخمِ دل کھُلا ہوا ہے ——— مزے آ رہے ہیں۔

DELHI.

2.1.61.

——— نیا سال تمھیں مبارک ہو، تمھیں اور بھابی کو اور بچّوں کو خدا ہر آفت اور بیماری سے محفوظ رکھے۔ یہ میری دلی دعا ہے۔ ایک عرصہ کے بعد تمھیں خط لکھ رہا ہوں۔ رانچی سے لوٹتے ہی مجھے شبِ افسانہ کے سلسلے میں یوپی کے شہروں کے دورے پر جانا پڑا۔ پانچ جگہوں پر مشاعرے کی طرح شبِ افسانہ کا انتظام کیا گیا تھا۔ ٹکٹ لگا کر۔ پہلی شبِ افسانہ مئوناتھ بھنجن میں منعقد کی گئی۔ دس پیسے کا ٹکٹ تھا، اور تقریباً دس ہزار کی حاضری تھی۔ اس کے بعد بنارس، الہ آباد، لکھنؤ، کانپور ہر جگہ اسی طرح کی مجلس رکھی گئی تھی۔ کم سے کم تیس ہزار اور زیادہ سے زیادہ پچاس ہزار آدمیوں نے اِن محفلوں میں شرکت کی ——— اب تم اس پروگرام کی کامیابی کا اندازہ کر سکتے ہو ——— شبِ افسانہ میں شرکت کرنے والوں کے نام یہ ہیں:

علی عباس حسینی، مسیح الزماں، رضیہ سجاد ظہیر، پرکاش پنڈت، خواجہ احمد عباس، اوپندر ناتھ اشک، امرت رائے، مہندر ناتھ، اور کرشن چندر ———

دس بارہ دنوں میں ہزاروں انسانوں کو افسانے پڑھ کر سُنانا، اور اُن سے داد وصول کرنا اور اُنھیں ادب کی ایک نئی صنف سے رُوشناس کرنا، میں سمجھتا ہوں ادب میں ایک تاریخی موڑ کے مترادف ہے۔ شبِ افسانہ کے سلسلے میں حوصلہ افزا نتائج کو دیکھ کر امید کی جا سکتی ہے کہ ہندوستان کے دوسرے ادب نواز شہروں میں بھی اس جدّت کو فروغ حاصل ہوگا۔ اور ہمارے عوام ایک نئے آرٹ فارم سے دلچسپی لے سکیں گے۔ ہم لوگ اس کے بعد مغربی یوپی اور پھر پنجاب کے شہروں میں بھی اس طرح کی محفلیں "برپا" کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔ اُمید ہے خاطر خواہ کامیابی ہوگی ———

DELHI.

2.5.61.

——— تمھارے خط؟ چار ملے نہ چھے! لکھو تو ملیں۔ ورنہ کہاں سے ملیں؟ ڈاکیہ ایسے تو لانے سے رہا۔ تمھارے خط نہ یہاں ملے نہ بمبئی میں، میں ۲۳ مارچ کو بمبئی سے آیا تھا جب سے یہیں مقیم ہوں۔ چار پانچ کانفرنسیں اوپر تلے اتا بڑ توڑ ہو گئیں۔ اب فراغت ملی ہے تو ایک ناول لکھنے کا سودا اپنے پر طاری کر کے کسی

ریل اسٹیشن پر بھاگ جانے کا سوچ رہا ہوں۔ البتہ اس ماہ کے آخر تک یہیں پر ہوں۔ تم اطمینان سے اوپر کے پتہ پر خط لکھ سکتے ہو۔ چار نہ لکھو ایک ہی لکھو، مل جائے گا، مگر خط کا لکھنا شرط ہے۔
انڈو پاک کلچرل کانفرنس میں سب امید کرتے تھے کہ تم آؤ گے، تم آؤ گے۔ مگر نہ جانے تم کیوں نہیں آئے۔ دوستوں سے ملاقات کا اچھا موقع تھا۔ حفیظ جالندھری۔ ضمیر جعفری۔ زہرہ نگاہ۔ شوکت تھانوی۔ ابن انشا۔ مرزا ادیب۔ اور دیگر دوستوں سے عرصے کے بعد ملاقات ہوئی۔ تمھارے لیے ارمان دھرے کے دھرے رہ گئے۔ مدیر نقوش محمد طفیل بھی آئے تھے۔ مگر کانفرنس سے پہلے، کئی روز تک اُن سے مسلسل ملاقاتیں رہیں۔ زندگی میں پہلی بار اُن سے ملا۔ آدمی مخلص اور عمدہ اور بھلے مانس معلوم ہوئے۔ بالکل صہبا لکھنوی کا پنجابی ایڈیشن، مگر جسیم اور ڈوبل! کس پینک میں پڑے ہو! اٹھو اور خط لکھو ——

DELHI.

22.5.61.

—— عرصہ دراز کے بعد تمھارا تفصیلی خط ملا؛ شکریہ۔ میں اب خیریت سے ہوں۔ گزشتہ دس بارہ دن سے فلو میں مبتلا تھا۔ ۱۰۴ تک درجۂ حرارت گیا۔ اب خیریت سے ہوں۔ امید ہے "ایک خوشبو اُڑی ہوا" اب چھپ چکی ہوگی۔ کم سے کم چھ کاپیاں اس کتاب کی بھیجو۔ اس سے پہلے "سڑک واپس جاتی ہے" کی صرف دو کاپیاں مجھے ملی تھیں۔ ناول کا سرورق عمدہ ہے۔ کاغذ اچھا ہے۔ کتابت بھی عمدہ ہے مگر چھپائی اچھی نہیں۔ میرے پاس جو دو جلدیں پہنچی ہیں اُن میں اکثر صفحات پر حروف بہت مدھم مدھم سے چھپے ہیں۔ بہرحال ان تکنیکی مشکلات کا مجھے زیادہ تجربہ اور علم نہیں ہے۔ تم جانو اور تمھارا کام ——

DELHI.

7.7.61.

—— تمھارا خط مل گیا۔ مگر نینی تال سے واپسی پر مجھے یہاں دہلی میں ملا۔ میں عرصہ دو ماہ کے لیے نینی تال چلا گیا تھا۔ خط کتابت میں گڑبڑ اس وجہ سے واقع ہوئی۔ اس تاخیر کے لیے مجھے شدید افسوس ہے۔
سید نواب علی صاحب کی موت نہ صرف علم و تحقیق کے شیدائیوں کے لیے بلکہ خود تمھارے لیے اور تمھارے خاندان کے لیے ایک ناقابلِ تلافی حادثہ ہے۔ اس طرح کے ان تھک اور خاموش کام کرنے والے، توصیف و ستائش سے بے نیاز لوگ اس شہرت زدہ زمانے میں کہاں پیدا ہوتے ہیں؟ وہ نسل ہی ختم ہو گئی ——

BOMBAY.

(تاریخ درج نہیں۔ یہ خط ۲۸ اپریل ۱۹۶۳ء کو وصول ہوا تھا)
دہلی سے واپس بمبئی آیا۔ کیونکہ دلی نے عجب سرد مہری کا سلوک کیا۔ جیسا کہ اس بے وفا پیشہ شہر کا ہمیشہ سے چلن رہا ہے۔ بمبئی آ کے پھر سے قدم جمانے کی کوشش میں لگ رہا۔ سب کچھ نئے سرے سے کرنا پڑا۔ مکان چھن چکا تھا۔ دو ماہ ایک ہوٹل میں پڑا رہا۔ کوئی کام ہاتھ میں نہ تھا۔ احباب یوں کترا کے نکل جاتے تھے، جیسے انھوں نے

کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔ بہرحال شدید تگ و دو کے بعد مکان مل گیا ہے۔ پتہ اوپر درج ہے۔ ایک فلم میں کام بھی مل گیا ہے۔ یعنی اب مزید جد وجہد کے لیے سہارا ہو گیا ہے اور یہ سب کچھ اپنی ذاتی کاوشوں سے ہوا ہے۔ یار لوگوں نے اڑنگا لگانے میں کوئی کوشش باقی نہیں چھوڑی۔ اب کے انسانی فطرت کے کچھ مطالعے بڑے دلچسپ ثابت ہوئے۔ دلچسپ اس لیے کہ ناامیدی کی منزل سے نکل چکا ہوں۔ اب کسی بات پر حیرت نہیں ہوتی۔ اتنا کچھ کر لینے کے بعد اب تمھیں خط لکھ رہا ہوں۔ گزشتہ چار ماہ جو خاموش رہا تو اس کی وجہ اب تمھاری سمجھ میں آگئی ہوگی۔ میرا نیا پتہ نوٹ کر لو۔ اور آئندہ خط و کتابت اسی پتہ پر ہوگی۔ (یعنی جب تک یہ مکان اپنے پاس رہے گا) علاوہ ازیں "افکار" بھی اسی پتہ پر بھیجا کرو۔ گزشتہ تین چار ماہ سے "افکار" نہیں ملا ہے۔ دو ایک پرچے اگر بچے ہوں تو بھیج دو۔

"جوش نمبر" کی اشاعت سے تم نے ایک نئی روایت کا آغاز کیا ہے۔ اُمید ہے اب یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ "جوش نمبر" میں نے جستہ جستہ مختلف مقامات سے دیکھا ہے۔ بہت خوب ہے۔ اتنے مشاہیر اہلِ قلم کے مضامین، اتنی محنت اور سنجیدگی سے لکھے گئے مضامین کی فراہمی تمھاری جگر کاوی کی دلیل ہے ———

BOMBAY.

25. 6. 62.

——— تمھارے دونوں خط مل گئے۔ مجھے دس بارہ روز سے بگڑے ہوئے فلو نے پریشان کر رکھا تھا۔ اس پر برسات کا مرطوب موسم۔ جسم اور روح دونوں چپچپانے لگے۔ اور صرف ناک ہی نہیں بلکہ اپنا پورا وجود مجھے گونددانی کی طرح معلوم ہو رہا تھا۔ خدا خدا کر کے اب اِس مرض سے خلاصی پائی ہے۔

الگ ڈاک پارسل سے تمھیں نئے ناول کا ایک حصہ بھجوا رہا ہوں۔ اس کا نام ہے "ایک وائلن سمندر کے کنارے"۔ دوسرا حصہ پہلے حصے کی رسید آنے پر بھجواؤں گا۔ بہرحال اب تم اس ناول کو جلدی سے چھاپ دو۔ تمھارے چھاپنے کے بعد ہی ہندوستان میں کسی پبلشر کو دوں گا۔ یہ بالکل نئے ہے۔ مگر اب تم چھاپنے میں دیر نہ کرو۔

"کرشن چندر نمبر" کے بارے میں کیا لکھوں؟ یوں تو میں نے سُنا ہے کہ "خیال" ماہنامہ بند ہو گیا۔ (کیا یہ سچ ہے؟) مجھے ایک روز انجم زسدیقی مدیرِ "شاعر" نے بتایا تھا۔ تو وہ اب "کرشن چندر نمبر" کیا نکالیں گے؟ اس طرح سے خود بخود تمھارے "کرشن چندر نمبر" کے لیے زمین ہموار ہو رہی ہے۔ اگر وہ اپنے فراہم کردہ مضامین تمھارے حوالے کر دیں تو تمھاری بہت سی محنت بچ سکتی ہے۔ خط و کتابت کر کے دیکھو۔ مگر میرے حوالے سے بات چیت مت کرنا۔ کیونکہ مدیرِ "خیال" سے میرے مراسم بہت عمدہ ہیں اور وہ جنوبی ہند میں اُردو زبان کے بہترین ہمدردوں میں سے ہیں۔ بہرحال اب کہ جب رسالہ بند ہو چکا ہے۔ تو نمبر نکالنے کا سوال کیا ہے؟ اور اس میں تُک بھی کیا ہے؟ اس لیے تم خود سلیقے سے بات چیت کر کے دیکھو ———

BOMBAY.

16.7.62.

——— کچھ دوستوں کی رائے ہے کہ "کرشن چندر نمبر" ابھی شائع نہ ہونا چاہیے۔ جب حالات زیادہ ناساز ہوں، جب چھپے تو مضائقہ نہیں۔ گرد و پیش کے حالات کو دیکھتے ہوئے میں سمجھتا ہوں یہ ایک معقول بات ہے۔ ہاں بھئی۔ زیادہ بچے پیدا کرنا آج کل زمانے میں واقعی دانش مندی نہیں ہے۔ میں تمہیں لکھنے والا تھا۔ مگر اچھا ہوا تم نے خود ہی محسوس کر لیا۔ میرے بھی تین بچے ہیں جن میں سے ایک تو پاگل خانے میں ہے جس کے ہر ماہ مجھے تین سو روپے کا انتظام کرنا ہوتا ہے اور باقی دو بچوں کی پرداخت میں، اگر صحیح ڈھنگ سے ہو، تو بہت خرچ اٹھتا ہے۔ میں اس بات کا قائل ہوں کہ بچے کم ہوں، مگر جو ہوں اُن کی پرورش، تعلیم اور تربیت مناسب ڈھنگ سے اس طرح کی جائے کہ بڑے ہو کر بچے اپنی خامیوں کا الزام اپنے والدین کی غریبی کو نہ دے سکیں۔ میرا تو خیر معاملہ ہی دوسرا ہے۔ اس بچی کے پاگل ہو جانے کے بعد میں تو ——— مجھے یوں نظر آتا ہے جیسے اس دنیا میں کوئی بھی میرا نہیں ہے ——— خیر جانے دو! خدا تمہارے بچوں کو صحیح سلامت رکھے اور تمہیں زیادہ سے زیادہ توفیق دے کہ تم اُن کی خدمت کر سکو۔ یہی دعا ہے۔ اپنی صحت کا خیال رکھو اور بھابی کا بھی۔ اور اپنا کام بدستور مکمل ایمان داری اور صداقت سے کرتے رہو جیسا اب تک کرتے آئے ہو۔ کسی سے زیادہ کی توقع مت کرو۔ اور کیا لکھوں؟ ———

BOMBAY.

29.8.62.

——— ایک SELF PORTRAT لکھا ہے، جو ادھر بے حد پسند کیا گیا ہے، سوچا اردو میں چھپنے کے لیے تمہیں بھیج دوں۔ پڑھ کر اپنی رائے لکھو۔

ناول کے سلسلے میں تمہاری رائے سے متفق ہوں۔ عظیم ناول کاوش سے نہیں لکھا جا سکتا، خود ہی لکھا جائے گا۔ اور غالباً سہواً۔ یعنی مصنف کو بھی معلوم نہیں ہوتا کہ اُس نے کیا لکھ دیا ہے ———

BOMBAY.

14.4.63.

——— تمہارا تفصیلی خط مل گیا۔ میں ادھر مکان کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ بارے اب ایک مناسب مکان رہنے کے لیے مل گیا ہے۔ دیکھیے کب تک رہنا ہوتا ہے۔ پتہ اوپر لکھ دیا ہے اب خط و کتابت اسی پتہ پر ہوگی، اور رسالہ بھی اسی پتہ پر بھیجو۔

بھائی۔ بمبئی میں مکانوں کی سخت قلت ہے۔ معلوم نہیں کب چھن جائے۔ بالکل لینڈ لارڈ کے رحم و کرم پر پڑتا ہے۔ اس لیے مستقل پتے کا اعلان اپنے رسالے میں کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ کوئی پتہ مستقل ہو تو دوں! فی الحال یہی پتہ ہوگا۔

افسانہ نمبر مل گیا، زیر مطالعہ ہے۔ افسانوی انتخاب تمہاری دِقّتِ نظر کی دلیل ہے۔ ٹائٹل البتہ بہتر ہو سکتا تھا۔ مجھے پھیکے بے رنگ سے ٹائٹل بالکل اچھے نہیں لگتے۔ ٹائٹل دیدہ زیب ہونا چاہیے، اور پُرکشش اور جہاں تک ہو سکے اُس میں شوخ رنگ استعمال کیے جائیں تاکہ لوگوں کو اپنی طرف کھینچ سکے۔ یہ میری ذاتی رائے ہے ——

BOMBAY.

20.4.65.

—— تمہارا خط مل گیا۔ اس سے پہلے والے خط کا مفصّل جواب دے چکا ہوں۔ اس خط میں تم نے وہی باتیں لکھی ہیں۔ شاید میرا خط تمہیں ابھی تک نہیں ملا۔ مکان بحالتِ مجبوری تبدیل کرنا پڑا کیونکہ مالکِ مکان نے نوٹس دے دیا تھا۔ کل کلاں کو اگر موجودہ مالکِ مکان بھی نوٹس دے دے تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔ بمبئی میں مکان کے مالک کی حیثیت ایک زار سے کم نہیں ہے۔ یہاں میرے حالات کیا ہیں؟ بس اب تم کو کیا بتاؤں؟ خاموشی بہتر ہے۔ تم اس پتہ پر رقوم بھجوا سکتے ہو۔ حساب باقاعدہ رکھو۔ کمی بیشی سے مطلب نہیں ہے۔ مگر حساب اپنے پاس باقاعدہ رکھو، اگر مجھے رقم زیادہ وصول ہو جائے گی، تو اگلی کتاب میں یا دوسرے ایڈیشن میں کٹ جائے گی۔ کم ملے گی تو آیندہ چل کے پوری ہو جائے گی۔ کوئی مضائقہ نہیں۔ مجھے حساب کتاب رکھنا پسند نہیں ہے، یہ کام بڑے جھگڑے کا ہے۔ مگر تمہیں ضرور اپنے کاموں کی خاطر کم سے کم موٹا موٹا حساب تو ضرور رکھنا چاہیے۔ رہا تمہارے رشتہ داروں کا معاملہ تو پچیس پچاس تو یوں بھی نکل آتے ہیں، لیکن اگر کبھی بڑی رقم درکار ہو تو اُس رقم کو ہندوستان میں بھجوانے کے بجائے کسی دوسرے کے ہاں امانت رکھوا دینا۔ مجھ سے خرچ ہو جائے گی اور بعد میں بدمزگی پیدا ہو سکتی ہے۔

—— میرے کہنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ روپے پیسے کی خاطر دوستوں میں بدمزگی پیدا ہو، یہ میں کسی طرح نہیں چاہتا۔ دوسرے یہ کہ حساب کتاب تم رکھو۔ میں نہیں رکھوں گا۔ تیسرے یہ کہ اس سلسلے کی ساری خط و کتابت تم رکھو گے۔ میں اپنے دوستوں ہی کو وقت پر خط نہیں لکھ سکتا۔ تمہارے گاہکوں کو کہاں لکھ سکوں گا۔ تیسرے یہ کہ اس سلسلے میں تم مجھے کسی قانونی یا کاروباری جھنجھٹ میں نہ ڈالو گے، ایسا نہ ہو کہ کوئی صاحب مجھے یہاں رقم بھیج دیں، اور بعد میں مجھ پر دعوٰی کرتے پھریں۔ میں کہاں بھگتوں گا۔ چوتھے یہ کہ میں نہایت فضول خرچ اور بے کار قسم کا آدمی ہوں اور اس لیے نہایت ہی بے کار قسم کا دوست ہوں۔ اس لیے تمہاری تمام توقعات میرے سلسلے میں غلط ہیں۔ لکھنے پڑھنے، افسانے لکھنے اور کتابیں لکھنے کے سوا اور کوئی کام مجھے نہیں آتا۔ آج تک کسی دوست کا مجھ سے بھلا نہیں ہو سکا، میں نہایت ہی مطلبی، خود غرض اور کمینہ آدمی ہوں۔ یہ تم اچھی طرح جان لو، اس کے بعد مجھ سے دوستی رکھو نہ رکھو۔ میرا کیا جاتا ہے۔

—— ایک انشائیہ یعنی مزاحیہ اور طنزیہ بعنوان "کہانی" تمہیں بھجوا رہا ہوں۔ علاوہ ازیں ایک ناول آدھا لکھ لیا ہے اُسے تمہیں قسطوں میں بھجواتا رہوں گا۔ تم خاموشی سے اُس کی کتابت شروع کرا دو۔ نہ "افکار" میں اعلان کرو، نہ اس کی کوئی قسط، اگلے تین ماہ تک چھاپو۔ تاکہ "ایک وائلن سمندر کے کنارے" کی فروخت پر کوئی اثر

نہ بڑے، اور ناولوں کے بیچ میں جو مناسب وقفہ ہونا چاہیے وہ بھی ہو جائے۔ مگر کتابت تیزی سے شروع کرا دو، تاکہ تین، چار، پانچ ماہ بعد ناول بازار میں آ سکے۔ اُمید کہ تم اس مشورے سے اتفاق کرو گے ــــــ

BOMBAY.

26. 6. 63.

ـــــــ ایک عرصے سے تمہارا خط نہیں ملا ہے۔ تشویش ہو رہی ہے۔ اُمید ہے تم خیریت سے ہو گے، جلد اپنی خیریت اور صحت سے مطلع کرو۔

ـــــــ شوکت تھانوی کی موت سے دلی رنج ہوا۔ باغ و بہار آدمی تھا۔ مزاح نگاری میں آخری وقت تک اُسے اُس کا مناسب مقام نہیں دیا گیا۔ بلاشبہ اُس نے بہت لکھا ہے، مگر جو کچھ لکھا ہے اُس میں بڑی آسانی سے قدرِ اوّل کی اتنی چیزیں دستیاب ہو سکتی ہیں کہ چار پانچ اچھے مجموعے مرتب ہو سکیں۔ اتنی دولت دوسرے کسی مزاح نگار کے یہاں آپ کو ملے گی؟ مگر وہ سب بڑے مزاح نگار ہیں، اور شوکت کچھ بھی نہیں! کیونکہ وہ زیادہ لکھتے تھے۔ لکھنے کو تو چیخوف نے بھی گیارہ سو افسانے لکھے تھے۔ مگر وہ سب کے سب تو لازوال نہ ہو سکے۔ بڑی مشکل سے پچاس افسانے زندہ رہے۔ تو اتنے عمدہ مزاحیہ مضامین تو شوکت کے ہاں بھی مل جائیں گے۔ پھر انھیں قدرِ اوّل کا مزاح نگار کیوں نہ سمجھا جائے؟ ــــــ

BOMBAY.

8. 1. 64.

ـــــــ تمہارا خط مل گیا۔ میرا موڈ آج کل بہت بُرا ہے۔

تمہارے ہاں کے دو ایک پرچوں میں ہمارے متعلق اس قدر غلاظت اُچھالی جا رہی ہے اور تم لوگ خاموش ہو؟ کم سے کم ایک شریفانہ تہذیبی احتجاج تو ہونا چاہیے تھا۔ چاہے کسی کا نام نہ لیا جاتا۔ جس طرح کا احتجاج "ہم قلم" نے اپنے اداریے کے ذریعہ پیش کیا۔ اس طرح کا احتجاج سنجیدہ اور موقر تہذیبی اداروں اور رسالوں کے ذریعہ ہونا چاہیے تھا، تاکہ اس قسم کی دشنام طرازی کو ادب سے دور رکھا جا سکے۔ مگر میں دیکھتا ہوں تم سب لوگ خاموش ہو　　ٹھیک ہے، خاموش رہو!

"چاندی کے گھاؤ" کا انتساب یوں ہے:

"فانی موزمدار کے نام"

(PHANI MOZUMADAR)

نام انگریزی میں لکھ دیا۔ تمہاری سہولت کی خاطر۔ انتساب کے صفحہ پر انگریزی میں نہیں صرف اُردو میں لکھا جائے گا۔

نئے سال کی خوشخبری یہ ہے کہ آج کل ماسکو جیسی تھیٹر میں "ایک عورت ہزار دیوانے" کو اسٹیج پر پیش کیا جا رہا ہے۔ تاس (سوویت نیوز ایجنسی) کی خبر ہے کہ ڈرامے کا پریمیر بڑی دھوم دھام سے ہوا۔ اس موقع پر اعلیٰ روسی اور ہندوستانی حکام بھی موجود تھے۔ ڈرامہ بہت کامیاب جا رہا ہے۔ روسی عوام نے اسے بہت پسند کیا ہے اس شان دار خبر کا

دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس وقت گھر میں راشن نہیں ہے! ——

BOMBAY.

23.2.65.

—— تمہارے کئی خط ملے۔ اِدھر کچھ ایسی پریشانیاں لاحق ہو گئی تھیں کہ مجبوراً ایک طویل عرصہ کے لیے خاموش رہ جانا پڑا۔ بارے اب وہ دور ہو چکی ہیں۔ اس لیے پھر سے لکھ رہا ہوں۔

۱۔ فیض نمبر کے لیے دو تین روز میں ضرور کوئی مختصر سا مضمون روانہ کر دوں گا۔ میرا انتظار کر لو۔

۲۔ "کرشن چندر نمبر" کے لیے تم مجھ سے کس قسم کی مدد چاہتے ہو۔ دیکھو اتنے کام نہ لاد دو کہ میں کر ہی نہ سکوں۔ ایسے وہی کام میرے سپرد کرو۔ جو میں بطریقِ احسن کو پورا کر سکوں۔

۳۔ سلمٰی اور کرشن چندر کے مضامین، افسانے وغیرہ عنقریب روانہ کر دوں گا۔ ۱۰ اگلے ہفتے نقل ہو رہے ہیں۔

۴۔ ایک مختصر ناول لکھا ہے۔ "لندن کے سات رنگ"۔ اس کا حجم "آسمان روشن ہے" کے برابر ہو گا۔ ممکن ہے اس سے کچھ کم ہو۔ اگر چاہو تو بھیج دوں، اُس کا مسودہ!

۵۔ ایک طویل طنزیہ لکھا ہے "فلمی قاعدہ" "اردو کا نیا قاعدے" کی طرز پر۔ فل اسکیپ کے ۹۵ صفحے پر مشتمل ہے اس میں چند اور مزاحیہ اور فکاحیہ مضامین ڈال کر ایک اچھی خاصی کتاب ہو سکتی ہے —— اگر چاہو تو وہ مسودہ بھی بھیج دوں ——

مجھے معلوم ہے، تم ان دنوں بہت مصروف ہو۔ لیکن وقت نکال کر جلد جواب لکھ ڈالو تاکہ میں اُس پر عمل کر سکوں۔ دونوں کتابیں تمھیں بہت جلد کتابت کے لیے دیتا ہوں گی۔ تاکہ تمھارا نقصان نہ ہو۔ یہاں کے پبلشر تو دو تین کاتب بٹھا کر ایک ساتھ مسودہ پورا کرا لیتے ہیں۔ تمھیں بھی یہی کرنا چاہیے ——

BOMBAY.

29.3.66.

پیارے صہبا[1]

—— ارے بھئی. کہاں ہو؟ —— نہ خیریت سے مطلع کرتے ہو، نہ "افکار" بھیجتے ہو۔ ایک سطر ہی لکھ دو کہ تم خیریت سے ہو۔ دل کو اطمینان ہو جائے گا۔ یہ مکروہاتِ دنیا تو چلتے ہی رہتے ہیں، چلتے ہی رہیں گے۔ بس دو لفظ لکھ دو۔ احباب کی خاموشی نے مار ڈالا۔ خط فوراً لکھو ——

تمہارا

کرشن چندر

---

[1] معاہدہ تاشقند کے بعد پاکستان اور بھارت کے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہونے کے بعد یہ پہلا خط تھا، جو بھارت سے مجھے وصول ہوا تھا —— (صہبا)

کرشن چندر

اردو کی ترقی پسند تحریک

(خطبۂ صدارت جو ترقی پسند مصنفین کانفرنس بھوپال کے افتتاحی اجلاس میں پڑھا گیا)

اُردو کے ترقی پسند ادیبوں کی یہ کانفرنس بھوپال میں جن غیر معمولی حالات میں ہو رہی ہے۔ اس کا ہم سب کو علم ہے۔ کتنی مشکلات کو عبور کر کے آپ نے اسے ممکن بنایا ہے یہ بھی میں جانتا ہوں اور اس کے لیے میں تہِ دل سے بھوپال کے سب ساتھیوں کا شکر گزار ہوں۔

اُردو زبان اس وقت جن نامساعد حالات سے گزر رہی ہے۔ اور جس ناسازگار فضا میں سانس لے رہی ہے اس کا ہم سب کو بخوبی علم ہے۔ گو یہ بات بہت سے لوگوں کو ایک اچنبھے سے کم نہیں معلوم ہوگی کہ اُدھر ملک آزاد ہوتا ہے اِدھر اُردو زبان قید کی جاتی ہے۔ اسے غدار، مردود اور گردن زدنی قرار دیا جاتا ہے اور اسے بدیسی زبان سمجھ کر عدالتوں، درباروں اور دستوری مجلسوں سے باہر نکال دیا جاتا ہے۔ یہ کتنی بڑی اچنبھے کی بات ہے۔ یہ کیسی آزادی ہے جس میں ہندوستان میں بسنے والے کروڑوں آدمی اُس زبان کو چھوڑنے پر مجبور کیے جا رہے ہیں۔ جس میں انھوں نے اپنی ماؤں کی پیار بھری لوریاں سنی تھیں۔ اپنی بہنوں کی شادیوں کے خوشیوں بھرے گیت سنے تھے جس میں انھوں نے اپنے دوستوں کو مہر و وفا کے خط لکھے تھے۔ اپنے محبوب سے نامۂ و پیام کیا تھا جس میں ان کے شاعروں نے وطن کی محبت کے ترانے گائے تھے "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا"۔ . . . . .
یہ زبان جو ہندوستان کے کروروں آدمیوں کے جذبات کی زبان ہے، نہ صرف اُن کے جذبات کی زبان ہے، بلکہ اُن کے کاروبار کی زبان ہے۔ اُن کے بازار کی زبان ہے۔ اُن کے گلی کوچوں، کھیتوں اور کارخانوں کی زبان ہے۔ یہ کیسی آزادی ہے جو اس خوبصورت میٹھی زبان کا گلا گھونٹ رہی ہے۔ یہ زبان جو نہ عرب میں پیدا ہوئی، نہ ایران میں، نہ عراق میں، نہ ترکی میں۔ جسے نہ چینی بولتے ہیں، نہ روسی۔ نہ امریکی، بلکہ جو اسی برصغیر میں گذشتہ آٹھ سو سالوں میں پیدا ہوئی، اسی ملک میں پلی، بڑھی، پھیلی، پھولی اور پروان چڑھی اور آج جب اس پر رنگا رنگ پھول کھل اٹھے ہیں جن کی مہک سے نہ صرف اردو کی کیاری بلکہ دوسری زبانوں کی کیاریاں بھی مہک اٹھی ہیں تو اسے اجاڑ دینے اور اسے تباہ و برباد کر دینے کے منصوبے بنائے جا رہے ہیں۔ میں آپ سے پھر کہوں گا کہ اگر آپ کو واقعی اپنی زبان، اپنی تہذیب، اپنے کلچر سے محبت ہے تو آپ کو یہ ضرور سوچنا پڑے گا کہ یہ آزادی کیسی ہے۔ اس کے جھنڈے تلے اُردو کی بیخ کنی کے لیے یہ خوفناک اقدام کیے جا رہے ہیں اس کی ماہیت کیا ہے اور ایسا کیونکر ہوا، اور کیونکر ہو رہا ہے؟
میں اس وقت تھوڑے عرصہ کے لیے سیاسی نقطۂ نگاہ سے الگ ہٹ کے آزادی کے بنیادی مفہوم سے بحث

کرنا چاہتا ہوں۔ آزادی کیا ہے۔ اس کی انفرادی حیثیت میں کیا شکل ہوتی ہے، اور سماجی اعتبار سے مجموعی طور پر یہ کیا صورت اختیار کرتی ہے؟ پہلی بات جو ذہن میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ ہر سماجی حقیقت کی طرح آزادی کا بھی ایک حدود اربعہ ہوتا ہے۔ اُس کی ایک شکل ہوتی ہے۔ وہ کسی ایسی نراجی کیفیت کا نام نہیں ہے جس میں ہر فرد جو چاہے سو کر گذرے۔ آپ نے اکثر لوگوں کو یہ کہتے سُنا ہو گا کہ "صاحب میں تو ضرور ایسا کروں گا، میں غلط سہی پھر بھی میں ایسا ضرور کہوں گا اور کروں گا اور میرا باپ بھی مجھے اس سے نہیں روک سکتا۔" قطع نظر اس سے کہ باپ اس جملے پر کیا کہے گا۔ یہ آزادی کی کوئی ایسی صورت نہیں ہے جو افراد اور سماج کے لیے قابل عمل ہو۔ اس قسم کے نراجی آزاد پسندوں کا صحیح مقام پاگل خانہ ہے۔ کیونکہ نراجیت کی آزادی افراد کو دہشت پسندی کی طرف مائل کرتی ہے اور سماجی اعتبار سے وہ ان کی زندگی میں مکمل انتشار پیدا کرتی ہے۔ اس لیے یہ کبھی کسی صورت میں قابل عمل نہیں ہے۔ اس لیے ہمیں آزادی کا مفہوم سمجھنے کے لیے اور اسے انسانی برادری میں جگہ دینے کے لیے اس کی حدود متعین کرنا پڑیں گی اور انسانوں کی برادری نے ایسا کیا ہے اور ہمارے سماج کی تاریخ بتاتی ہے کہ ہم نے ایسا کیا ہے۔

ہم قریب قریب آزادی کی نراجی کیفیت سے چلے تھے، جس میں ایک انسان کو اپنے بیوی بچوں کو مار ڈالنے کا حق حاصل تھا۔ اور وہ اسے بلا خوف و خطر استعمال کرتا تھا اور سماج کا قانون اسے کوئی سزا نہ دے سکتا تھا۔ یہ اُس زمانے کی آزادی تھی جب انسان پتھر کے زمانے میں تھا۔ یہ آج کے زمانے کی آزادی نہیں ہے، آج ایسا کرنا ممکن نہیں ہے۔ آج اس قسم کی آزادی کو آزادی نہیں سمجھا جاتا۔ اسے بربریت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ گو میں سمجھتا ہوں کہ آج بھی ایسے چند ایک سرپھرے لوگ ضرور موجود ہوں گے جو اپنے تئیں اس قسم کی آزادی چاہتے ہیں، چاہے اُن کا باپ بھی کیوں نہ خفا ہو جائے۔ مگر بحیثیت مجموعی اب انسانوں نے اور اُن کے سماج نے اس قسم کی آزادی کو متروک قرار دیا ہے اور ہم لوگ آزادی کے مختلف ادوار طے کرتے ہوئے قبائلی آزادی سے سامنتی آزادی اور سامنتی آزادی سے سرمایہ دارانہ آزادی اور سرمایہ دارانہ آزادی سے اشتراکی آزادی کی منزل تک آن پہنچے ہیں اور ان تمام ارتقائی منزلوں سے گذرتے ہوئے ہم انفرادی اور اجتماعی آزادی کی شکل کو بدلتے ہوئے، اسے وسیع تر بناتے ہوئے، اس کے دائرے کو بڑھاتے ہوئے آئے ہیں مگر ہمیں ابھی آگے چلنا ہے۔ اس کی مثال کے لیے میں پندرہ اگست کی آزادی کا ذکر کروں گا۔

پندرہ اگست کو ہندوستان میں کس قسم کی آزادی آئی؟ کیا یہ اشتراکی آزادی تھی۔ نہیں۔ کیونکہ ہندوستان میں ابھی اشتراکی اقتصادی نظام زندگی کی داغ بیل نہیں پڑی اور نہ ہی صاحب اقتدار طبقے اس قسم کے کوئی خواب دیکھ رہے ہیں۔ پھر یہ آزادی کیا ہے۔ یہ بہار کیا ہے جس کے رجائی ترانے اکثر گائے جاتے ہیں۔ پندرہ اگست سے پہلے ہندوستان برطانوی دولت متحدہ میں شامل تھا، پندرہ اگست کے بعد بھی وہ وہیں ہے۔ پندرہ اگست سے پہلے ہندوستان کی دولت آفرینی کے وسائل سرمایہ داروں کی ملکیت تھے۔ پندرہ اگست کے بعد بھی وہ وہیں ہیں۔ پندرہ اگست سے پہلے اربوں روپیہ بدیسی سامراجیوں کا ہماری صنعتوں میں لگا ہوا تھا جس کا منافع اس ملک سے باہر جاتا تھا۔ وہ منافع آج بھی اسی طرح باہر جا رہا ہے۔ کسانوں کی زمینیں اُسی طرح زمینداروں کے پاس ہیں۔ فرنگی کے دور حکومت کی ساری مشینری اور اُس کے جاری کردہ قوانین جوں کے توں موجود ہیں۔ پھر کیا ہوا ہے، کہاں فرق پڑا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ پہلے آزادی کا رنگ سفید تھا، اب کالا ہو گیا ہے۔ میں اسے مان لیتا ہوں۔ تو بھی یہ کوئی اتنا بڑا انقلاب نہیں جس پر خوشی کے شادیانے بجائے جائیں۔ اس وقت یہ صحیح ہے کہ ملک کی نوکر شاہی کا رنگ سفید نہیں ہے اور وہ اس کے سرمایہ پرستوں کا رنگ بھی سفید نہیں ہے لیکن آزادی تو انسانی جلد سے زیادہ

گہری چیز ہے۔

دراصل اس وقت ہندوستان میں آزادی کی تقریباً وہی صورت ہے جو پندرہ اگست سے پہلے تھی۔ کیونکہ سماجی آزادی اور انفرادی آزادی کا نیا مفہوم اقتصادی نظام کے بدلنے سے پیدا ہوتا ہے۔ جب سماج قبائلی آزادی سے سامنتی آزادی میں آیا تو آزادی کا نیا مفہوم پیدا ہوا۔ جب سماج سامنتی آزادی سے سرمایہ دارانہ آزادی کے دور میں آیا تو یہ مفہوم اور وسیع ہو گیا۔ یہ بنیادی انقلابی تبدیلیاں تھیں جنھوں نے انسانی زندگیوں میں اور اُن کے سماج میں تبدیلیاں پیدا کیں۔ سائنس، عقل، شعور، کلچر، ادب، فلسفے کو فروغ دیا اور انسان کے علم اور دولت میں اضافہ کیا۔ پندرہ اگست کو کوئی ایسا بنیادی انقلاب نہیں ہوا ہے۔ اوپر کے طبقوں کے ہندوؤں اور مسلمانوں نے انگریزوں کے مشورے سے اور اُن کی موجودگی میں ملک کو تقسیم کرنے کا سمجھوتہ کیا، اور سمجھوتے کو انقلاب نہیں کہتے ہیں۔ اُسے سمجھوتہ ہی کہتے ہیں۔ اقتصادی نظام زندگی کہیں نہیں بدلا ہے، صرف اُس کے چند مُہرے ضرور بدل گئے ہیں۔ یہی سیاست میں ہوا ہے۔ اگر شطرنج کے مُہرے کاٹ کے پہلے کر دیئے جائیں تو آپ اُسے پچیسی یا کبڈی کا کھیل نہیں کہیں گے شطرنج ہی کہیں گے۔ جب آزادی کی نوعیت نہیں بدلی تو ترقی پسند طاقتیں اپنی آزادی کی لڑائی کیسے بند کر سکتی ہیں۔ یہ ایک بڑا واضح سوال ہے جس کا جواب ہم سب کو دینا ہے۔ موجودہ آزادی ایک قلیل آبادی کی آزادی ہے جو سرمایہ پرستوں اور جاگیرداروں، زمینداروں پر مشتمل ہے جس میں ذرائع پیداوار اور دولت آفرینی کے سارے وسائل اُن کے بس رہتے ہیں جس میں اقتصادی نظام منافع اندوزی کے ذریعہ مزدوروں اور کسانوں کی محنت لوٹ لوٹ کر تجوریوں میں بند کر جاتا ہے اور غریبوں کو اور غریب اور امیروں کو اور امیر بناتا چلا جاتا ہے، یہ نظام جس میں قیمتیں بڑھتی ہیں بے کاری پھیلتی ہے، بدحالی بڑھتی ہے بد امنی شروع ہوتی ہے اور انسان کی انفرادی اور سماجی آزادی گھٹتی چلی جاتی ہے۔ حتی کہ نتیجہ جنگ اور فسطائیت کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ یہ متواتر سرمایہ دارانہ نظام زندگی کا منطقی نتیجہ ہے اور ہر ملک میں اسی طرح مترتب ہوتا ہے، جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تاریخ اور سائنس اور تجربے اور مشاہدے کا اطلاق ہندوستان پر نہیں ہوتا اور اس وقت ہندوستان کے بڑے بڑے سیاست داں بھی کہہ رہے ہیں۔ اُن کے لیے میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ ایک دفعہ برطانیہ کے بادشاہ چارلس اول نے بھی یہی کہا تھا۔ پھر فرانس میں لوئی شانزدہم نے بھی یہی کہا تھا۔ روس کے زار نکولس نے بھی یہی کہا تھا۔ ہٹلر اور مسولینی نے بھی یہی کہا تھا اور ابھی کل تک چیانگ بھی چین میں یہی کہتا تھا، یہ صحیح ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو کبھی نہیں دہراتی۔ لیکن تاریخ آخر انسانوں کی تاریخ ہے اور جب تک انسان اپنی غلطیاں دہراتے رہیں گے تاریخ بھی اپنے آپ کو دہراتی رہے گی۔

اس پس منظر کی روشنی میں جب آپ اس حملے پر نگاہ رکھیں گے جو آج کل اُردو پر کیا جا رہا ہے تو اس میں آپ کو اپنے ملک کی اُبھرتی ہوئی فسطائیت پسند جماعتوں کا ہاتھ نظر آئے گا جس طرح یہ جماعتیں ہماری زندگی کے دوسرے شعبوں پر حملہ کر رہی ہیں، اسی طرح ہمارا ادب اور کلچر بھی ان سے محفوظ نہیں ہے۔ شہری آزادی کا کم ہونا، پریس کا روز بروز جنتا سے دور ہوتے جانا، قیمتوں کا بڑھنا، اُردو پر حملہ۔ یہ سب ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ ترقی پسند ادیبوں کا مقصد صرف ایک کڑی کو توڑنا نہیں ہے، پورے سلسلے کو ختم کرنا ہے اور ایک ایسے نئے سلسلے کو جنم دینا ہے جہاں انسانوں کی آزادی ایک قلیل طبقے سے محنت کشوں کی پوری مزدوری میں منتقل ہو جاتی ہے۔ جہاں سماج کے ہر فرد کے لیے روٹی کھانے، کپڑا پہننے، گھر میں رہنے، کام کرنے، کتاب پڑھنے اور بڑھاپے میں آرام سے زندگی بسر کرنے کی آزادی حاصل ہوتی ہے۔ یہ ہے اشتراکی آزادی کی ایک نہایت ہی مختصر سی تصویر جس کی تشکیل اور

جس کے فرائض بورژوا سماج کی آزادی سے کہیں زیادہ واضح اور نکھرے نکھرے ہیں۔ بورژوا سماج میں کہنے کو تو یوں آپ سب کچھ کر سکتے ہیں، لیکن فی الواقع کچھ نہیں کر سکتے۔ اس سے مجھے بمبئی کے کشمیر ایمپوریم کا ایک واقعہ یاد آتا ہے۔ چند دن ہوئے میں وہاں گیا تو ایمپوریم کے اندر ایک بڑے خوبصورت اونی کوٹ کو دیکھا جو خالص کراکلی کی کھال کا تھا۔ میں نے اس کی قیمت پوچھی معلوم ہوا اس کی قیمت دو ہزار تین سو روپے ہے بڑا خوبصورت کوٹ تھا۔ نرم، گرم، ملائم، گف۔ میں نے سوچا۔ گو یوں کہنے کو کوئی بھی اسے نہیں لے سکتا ہے، لیکن دراصل اُسے وہی آدمی پہن سکتا ہے جو اسے خرید سکتا ہو۔ اور ہندوستان کے کروڑوں انسانوں میں کتنے آدمی ایسے ہیں جو اسے خرید سکتے ہیں۔ ہندوستان میں بھی آج کل جو آزادی بک رہی ہے وہ اسی کراکلی کے کوٹ کی طرح کی آزادی ہے!

اُردو کی حمایت کے سلسلے میں ہمیں ملک کی دوسری ترقی پسند جماعتوں سے بھی رجوع کرنا چاہیے۔ جو ہماری سماجی زندگی کے دوسرے شعبوں میں عوام کی فلاح و بہبود کے لیے کام کر رہی ہیں۔ خود ہندی کے ترقی پسند ادیب اُردو کی حمایت پر کمر بستہ نظر آتے ہیں۔ بعض لوگوں کو یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوگی، لیکن یہ ایک حقیقت ہے۔ ڈاکٹر رام بلاس شرما، امرت رائے، دیویندر استیہ، پرکاش چندر گپت اور دوسرے ممتاز ہندی ادیب اس مذہبی شاؤنیت کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ جس کا مظاہرہ چند جماعتوں کی طرف سے اُردو کے سلسلے میں ہو رہا ہے، یہ ہماری تحریک کے لیے ایک نیک فال ہے اور دوسری طرف ہمیں بھی یہ چاہیے کہ ہم اُردو کی حمایت ہندی کی مخالفت میں نہ کریں۔ ہندی اُردو کی سگی بہن ہے۔ اور اپنے اندر بڑی دلکشی اور جاذبیت رکھتی ہے۔ اس کے بڑھنے سے ہماری بڑائی ہے۔ اس کی ترقی میں ہماری خوشی ہے۔ اس کے پھولنے پھلنے میں ہماری مسرت ہے۔ ہندوستان میں پندرہ میں اور بدیسی بڑی زبانیں ہیں جنھیں کروڑوں آدمی پڑھتے، لکھتے اور بولتے ہیں۔ اگر ہمیں اُن سے نفرت نہیں ہے تو ہندی سے کیوں ہو۔ ہندی تو ہماری برادری کی ایک حسین زبان ہے۔ اُردو بھی کروڑوں مسلمانوں ہندوؤں اور سکھوں کی زبان ہے۔ وہ شمالی ہند کے بیشتر حصّہ میں مادری زبان ہے جس میں ہر فرقے اور ہر مذہب کے لوگ شامل ہیں۔ پھر ہمیں احساس کمتری کیوں ہو، اور ہم اپنے دل میں ہندی کے لیے مغائرت اور کدورت کیوں رکھیں۔ کبھی زبانیں بھی سرکاری فرمانوں سے بنا یا بگڑا کرتی ہیں۔

برہمن ہزار کوشش کے بعد بھی سنسکرت کو زندہ نہ رکھ سکے۔ کیونکہ سنسکرت جنتا کی زبان نہ تھی، بلکہ وہ تو جنتا سے ہمیشہ دور دور رکھی گئی۔ اور مقدس کتابوں میں دفنا دی گئی۔ اسی طرح مغلوں کی ہزار کوششوں کے باوجود فارسی اس ملک میں نہ پنپ سکی بلکہ ایک اور ہی زبان پیدا ہو گئی، جس میں بیک وقت نرمی بھی ہے اور گرمی بھی۔ سلاست زبان بھی ہے اور شوکت الفاظ بھی جو میر، غالب، اقبال، پریم چند سرشار، چکبست کی زبان ہے، جو جواہر لال نہرو اور مولانا آزاد کی زبان ہے۔ یہ وہ زبان ہے جس میں ہمارے نائب وزیر اعظم سردار پٹیل نے جے پور کانگریس میں تقریر کی ہے اور میں تو یہاں تک۔ کہتا ہوں کہ یہی وہ زبان ہے جس میں بابو راجندر پرشاد، گوند بلبھ پنتھ اور شری پرشوتم داس ٹنڈن نے اپنے بھاشن دیے ہیں۔ میں نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی بمبئی کے اجلاس میں ان کی تقریریں سنی ہیں، انھیں ڈیلیگیٹوں سے بات چیت کرتے سنا ہے۔ میرے پاس اُن کی فلمی ڈوکمنٹریاں موجود ہیں اور میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ ان لوگوں کی زبان وہی ہے جس میں میں آپ سے بات کر رہا ہوں۔ بلکہ وہ لوگ تو مجھ سے کہیں زیادہ شستہ و رفتہ اردو بولتے ہیں اگر وہ اسی زبان کو ہندوستان میں پھیلانا چاہتے ہیں تو ہیں کیا اُردو کے سارے ادیب اُن کے ساتھ ہیں لیکن کہنا کچھ اور کرنا کچھ اور یہ دھاندلی یہاں نہیں چلے گی۔ اُردو کو وہ سرکاری طور پر معتوب قرار دیں تو دیں۔ لیکن اردو کی ایک اپنی سرکار بھی ہے اور وہ اس کی جنتا ہے جو کروڑوں کی تعداد میں۔ ہندوستان کے گوشے گوشے میں اور برما، ملایا، سنگاپور، مغربی افریقہ تک پھیلی

ہوئی ہے۔ یہ لوگ اسے بڑھائیں گے، پھیلائیں گے، زندہ رکھیں گے اور مذہبی شاؤنیت کا کوئی حربہ اسے نہیں روک سکتا ہے۔

گزشتہ دس برس میں ترقی پسند ادب نے اردو میں ایک مستقل تحریک کی صورت اختیار کر لی ہے اور اس کی ادبی تخلیقات نے ہمارے ادب کا ڈھانچہ بدل کے رکھ دیا ہے۔ اسلوب بیان میں نئے نئے تجربے ہو رہے ہیں۔ فکری اظہار سے ہم لوگوں نے ادب کو زندگی کے قریب لانے کی کوشش کی ہے اور اس میں ان تجربات اور واردات کو بیان کرنے کی سعی کی ہے جو ہماری قوم کی روح پر بیتے ہیں اور جنھوں نے ہمارے ضمیر کو جھنجھوڑا ہے۔ جنسی گھٹن، فرنگی کی غلامی، ہندو مسلم فسادات، مزدوروں اور کسانوں کی زبوں حالی، سیاست حاضرہ کی نیرنگیاں، قحط کی لاشیں۔ طوائفیت کی حرص، سرمایہ پرستی کی منافع اندوزی۔ ہم نے ہر رنگ اور ہر پہلو سے زندگی کو دیکھنے کی کوشش کی ہے اور اس کا بے باکی سے تجزیہ کیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اگر ہم اپنے گزشتہ دس برس کی تخلیقات پر ایک گہری نظر ڈالیں، تو ہمیں ان میں بڑی خامی نظر آئے گی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہماری شاعری اور ہماری افسانہ نگاری اور ہماری مضمون نگاری چند ایک کارخوں کو چھوڑ کر ابھی تک آسمان سے نہیں اتری۔ ہماری شاعری میں ابھی تک جاگیرداری دور کی خوشبو اور نفاست پسندی ہے۔ اس کی لے اسی طرح دھیمی دھیمی سوگوار سی ہے۔ اس میں ابھی زمین کی سوندھی سوندھی بو نہیں ہے۔ کسان کے پسینے سے بھرے ہوئے مضبوط ہاتھ نہیں ہیں۔ آئل سے سنی ہوئی مزدوروں کی وردیاں نہیں ہیں۔ اس میں اور اسی طرح ہمارے ادب کی دوسری اصناف میں مجھے اپنے غریب گھروں کا نقشہ نہیں ملتا۔ اپنے کسانوں کے گیت نہیں ملتے۔ اپنے مزدوروں کی دن رات جاں سوز کاوشیں نہیں ملتیں۔ اس میں اس مزدور عورت کی ٹوٹی ہوئی کنگھی کا ذکر نہیں ہے جس کے دندانوں میں بال پھنسے ہوئے ہیں۔ اس ڈبو کتے کا ذکر نہیں ہے جسے منوہر اپنے ساتھ صبح سویرے ہل چلانے کے وقت کھیتوں میں اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ اس میں اس شوخ نڈر، بے باک محبت کے گیتوں کا ذکر نہیں ہے، جو گاؤں کی عورتیں اپنے پیاروں کے لیے دوپہر کے وقت کھیتوں میں کھانا لے جاتے ہوئے، منڈیروں پر چڑھتے اترتے گاتی ہیں۔ اس میں ان لباسوں کا ذکر نہیں ہے جن سے گوبر کی بو آتی ہے۔ ہمارے ادب میں کہیں باتھو کے ساگ کا ذکر نہیں ہے۔ اس وقت ہمارے ادب کو بوئے ختن اور گیسوئے تتار کی ضرورت نہیں۔ اسے باتھو کے ساگ کی ضرورت ہے، اور یہی ہمارے ادب کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ مجھے اس میں اپنے ملک کے مکان نہیں ملتے۔ اپنے جانے پہچانے چہرے نہیں ملتے۔ اپنے گھروں کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں اور غم نہیں ملتے۔ اپنے پیڑ نہیں ملتے۔ پھل، پھول، چرند، پرند کسی ایک شے کی وہ گہری جانی پہچانی تصویر نہیں ملتی جسے آدمی سو برس کے بعد بھی دیکھ کر پہچان جائے۔ ہم لوگ زمین پر نہیں اتر آئیں گے۔ محنت اور کاوش سے کسانوں اور مزدوروں کے گھروں میں جا کر ان کی زندگیوں کا مطالعہ نہیں کریں گے اور سچائی دیانت داری اور دلی خلوص اور اپنے سوچ کی پوری کرب ناکی سے اس کی تصویر نہیں اتاریں گے۔ اس وقت تک ہمارا ادب عظمت کے معیار کو نہیں چھو سکتا جسے پڑھ کر دنیا کے کسی حصے میں رہنے والا انسان یہ کہہ سکے کہ یہ ہندوستان کے لوگ تو میری ہی طرح کے انسان ہیں۔ یہ بہت مشکل کام ہے۔ لیکن ہمیں اسے پورا کرنا ہوگا۔ ابھی تک ہم نے اپنی تحریروں کو ایک سطحی جلا دے کر پالش کر کے چمکا دیا ہے۔ لیکن چونکہ

یہ آب و تاب بہت دیر تک قایم نہیں رہ سکتی۔ ہمیں موجودہ اسلوب بیان کو انقلابی حد تک متبدل کر دینا ہوگا اور اس کے لیے وہ ہزاروں الفاظ اپنی شاعری میں اپنے افسانوں میں اپنے مضامین میں، اپنے ڈراموں میں داخل کرنا ہوں گے، جو ہماری جنتا کی زندگی میں روزمرّہ استعمال ہوتے ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ انگریزی میں ہر سال دس ہزار نئے لفظ داخل ہوتے ہیں۔ یہاں گذشتہ دس برسوں سے شاید دس الفاظ سے زیادہ نہیں داخل ہو سکے۔ اگر ہماری ترقی کی یہی رفتار رہی تو ایک دن انگریزی ہماری زبان کے سارے الفاظ، ساٹھ ستّر ہزار جتنے بھی تھوڑے سے الفاظ یہ ہیں انھیں اپنے میں سمو لے گی اور ہم بس انگریزی زبان کی ایک شاخ کہلائیں گے۔

زندہ قوموں کی زبانیں بھی زندہ ہوتی ہیں۔ جس رفتار سے روسی زبان بڑھ رہی ہے اور جس رفتار سے ہم اردو زبان میں سسک رہے ہیں اور رینگ رینگ کر چل رہے ہیں اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ جذبات میں اور اظہار میں اور اسلوب بیان میں اور وسعت نظری میں ہم اُن لوگوں سے کم سے کم ایک صدی پیچھے ہیں اور پیچھے ہی رہنا چاہتے ہیں اور اسی میں اپنی شان سمجھتے ہیں۔ یہ وہی ہندرستانیوں کی پرانی جات پات والی تنگ نظری ہے۔ یعنی نہ کسی کو اپنے گھر میں گھسنے دیں گے، نہ چوکھے کے قریب پھٹکنے دیں گے، نہ برادری میں داخل ہونے دیں گے، نہ اپنی زبان میں باہر سے ایک لفظ بڑھائیں گے۔ کیونکہ یہ لفظ باہر سے آیا ہے۔ یہ باہر سے کیا بلا ہے؟ کوئی ڈاکو ہے، چور ہے، رہزن ہے، جو آپ کو نگل جائے گا۔ بس پڑے رہو اور اُن پرانے لفظوں کو بار بار گھسو، جھوٹے برتنوں کی طرح۔ اسی طرح پرانے اسالیب بیان گھسی ہوئی جوتیوں کی طرح نکمّے ہو چکے ہیں۔ ان کی ایڑیاں تک بیٹھ گئی ہیں۔ لیکن ادیب ہیں کہ برابر انھیں گھسیٹتے سٹر پٹر چلے جاتے ہیں۔ ان سے کہو بھئی نیا جوتا لے لو مگر نہیں، انھیں تو وہی اپنا پرانا پھٹا ہوا جوتا پسند ہے۔ باہر سے نیا کون لائے۔ وہی اپنے گھر کی آدھی اور باہر کی ساری والا معاملہ ہے۔ ایسا نکمّا، پھسڈی، جاہل ادب بھی کہیں نہ ہوگا۔ اور دعوٰی یہ کہ سارے جہان بھر کے عظیم ادب سے اپنا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔

اب میں ترقی پسندوں کے دوسرے مقاصد کی طرف آپ کو توجّہ دلاتا ہوں، جن کا ابھی تھوڑی دیر پہلے میں اشارتًا ذکر کر چکا ہوں۔ یعنی اشتراکی آزادی کا حصول۔ یہ مقصد اور اس مقصد کے لیے دوسری ترقی پسند جماعتوں سے اشتراک و اتحاد کیت مثبت طور پر ابھی تک کہیں ترقی پسندوں کے پروگرام میں شامل نہیں ہے۔ ترقی پسندوں کے اعلان نامے میں جس پر ڈاکٹر ٹیگور اور منشی پریم چند کے بھی دستخط ہیں۔ سرمایہ داری۔ جاگیرداری کی مخالفت اور بیخ کنی کا ذکر ہے۔ لیکن اس میں منفیت کا رنگ غالب ہے جو بالعموم سامراجی نوآبادیات کے باغی ادیبوں کی تحریروں میں پایا جاتا ہے۔ یعنی توڑ دو۔ پھوڑ دو۔ ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالو۔ لیکن میں سمجھتا ہوں اور میرا یہ ذاتی مشورہ ہے کہ اب ہمارے بنیادی اعلان نامے میں ترمیم ہونی چاہیے اور اس میں ترقی پسندی کے تعمیری پہلو پر زیادہ زور دیا جانا چاہیے۔

ترقی پسندوں نے اب تک اپنی تخلیقات میں سماج اور افراد کی کمزوریاں بیان کی ہیں۔ انھوں نے گناہ سے سماجی امراض کا تجزیہ کیا ہے۔ لیکن مریض کو مریض ہی رہنے دیا ہے۔ یہ کافی نہیں ہے۔ ترقی پسند ادب زندگی کا عکاس ہے۔ ترجمان ہے، تو نہ صرف مریض کا عکاس کیوں بنے۔ اُسے علاج کرنے والوں کا عکاس بھی تو بننا چاہیے۔ زندگی میں جہاں گھناؤنے ناسور ہیں، وہاں ایسی صحت بخش قوتیں بھی ہیں جو اُن ناسوروں کا مقابلہ کر رہی ہیں اور انسانی زندگی کو بہتر بنانے میں کوشاں نظر آتی ہیں۔ ہمارا

ادب لاشوں کا ادب نہیں بن سکتا۔ اُسے زندگی کے ساتھ چلنا ہے اور زندگی بہت، دور آسمانوں کے قریب پرواز نہیں کرتی۔ وہ دھرتی کے سینے سے لگ کے کھسکتی ہے اور وہاں کے سبز خوشوں میں لہلہاتی ہے اور گندم کی سنہری بالیوں میں سرسراتی ہے اور وہ چند خوبصورت فلیٹوں میں نہیں رہتی وہ کروروں چھوٹے چھوٹے گھروں میں رہتی ہے اور مضبوط ہاتھوں سے کام کرتی ہے اور جوان ہونٹوں سے مسکراتی ہے اور کجلائی ہوئی سندر آنکھوں سے محبت کا جادو جگاتی ہے۔

آج دنیا بھر کے کسان اور مزدور اک نئے راستے پر چل رہے ہیں۔ اس میں فرانس اور اٹلی کے مزدور اور کسان اور مشرقی یورپ کے مزدور اور کسان اور سوویت روس کے مزدور اور کسان اور منگولیا اور چین کے مزدور اور کسان۔ یعنی دنیا کی کل آبادی کا نصف حصہ اس رستے پر چل رہا ہے۔ اس رستے کو ان محنت کشوں نے اپنے خون سے سینچا ہے اور اس مقدس خون کی قربانی کے گیت دنیا بھر کے بڑے بڑے شاعروں، افسانہ نگاروں اور مفکروں، سائنس دانوں نے گائے ہیں۔ ہاورڈ فاسٹ جیل میں ہے، اور پریموں علی سردار جعفری بھی جیل میں گیا ہے۔ چاروں طرف سے دیواریں ڈھے رہی ہیں ساتھیو! ــــ اور پرانے قلعے ایک ایک کرکے ٹوٹتے جارہے ہیں اور صدیوں کی خندقیں پاٹ دی گئی ہیں اور دلیر، جواں ہمّت، ادیب، شاعر اور فن کار BASTILLE کی دیواروں کو پھلانگتے ہوئے اپنی جنتا سے گلے مل رہے ہیں۔ یہ رونے کا موقع نہیں ہے۔ یہ ہنسنے کا موقع ہے۔ یہ جدائی نہیں ہے۔ یہ ملاپ ہے۔ یہ شکست نہیں ہے۔ یہ فتح عظیم ہے۔ کس نے دیکھی ہے بہار؟ ــــ میں کہتا ہوں میں نے دیکھی ہے بہار۔ میری آنکھیں اُس بہاریں قافلے کو دیکھ رہی ہیں۔ جس میں یورال کی ہوائیں ہیں۔ فرانس کا تبسم ہے۔ اٹلی کا نغمہ ہے۔ ساؤتھ امریکہ کی خوشبو ہے۔ چین کی بُجھ ہے۔ ہندوستان کی محبت ہے۔

آج ساری دنیا ترقی کے راستے پر گلے مل رہی ہے۔ آگے بڑھ جاؤ ساتھیو! اور بہاروں سے اپنی جھولیاں بھرلو!

(ماخوذ از افکار۔ بھوپال۔ خاص نمبر ۱۹۴۹ء)

پھول

کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کیپٹلزم کے نام پر یا سوشلزم کے نام پر یا کسی ازم کے نام پر کسی مذہبی یا ملکی مفاد کے نام پر ان کے سر پر بندوق لے کر چڑھ دوڑے۔ اصل سوال جو ہے وہ یہ ہے کہ کسی طرح انسان کے ہاتھ سے بندوق چھین لی جائے اور اُس کے ہاتھ میں ایک پھول دے دیا جائے۔ تم جانتے ہو جب ایک انسان پھول لے کر اپنی کسی دشمن سے غصے کی بات کرے گا تو بڑا احمق معلوم ہوگا۔ ہوگا کہ نہیں! ــــ

ــــ کرشن چندر

کرشن چندر

کہانی کی کہانی

نوبل پرائز پانے والے شولوخوف میرے پسندیدہ ادیبوں میں سے ہیں ۔ مگر کبھی کبھی وہ بھی بے حد قدامت پرستی کی بات کرجاتے ہیں ۔ حال ہی میں ان کا ایک بیان چھپا ہے جس میں انھوں نے بتایا کہ ادب کا میدان دراصل مردوں کا ہے اور یہ کہ ادب عورتوں کے بس کی چیز نہیں ---- اب وہ ہوتے اگر ہندوستان میں تو ہم ملاتے انھیں اردو کی عصمت چغتائی سے' رضیہ سجاد ظہیر سے' قرۃ العین حیدر سے' اسمٰی صدیقی سے' جیلانی بانو سے' ہندی کی مہادیوی ورما سے' ادشا دیوی متر' کملا چودھری' منو بھنڈاری سے' پنجابی کی امرتا پریتم اور سپر یہ جوت کور سے ! ---- پھر یہ عورتیں جو اپنی اپنی زبان میں صفِ اول کی ادیب ہیں' خود سمجھ لیتیں شولوخوف صاحب سے ! ---- اگر وہ ہوتے جرمنی میں تو آنا سیگھرز سے مڈبھیڑ ہو جاتی ان کی' جو موجودہ دور کے جرمن ادیبوں میں صفِ اول کی ناول نگار مانی جاتی ہیں ۔ یا وہ ہوتے انگریز بانی کے دور میں جین آسٹن یا ایملی برانٹے کے عہد میں' یا اس سے بہت پہلے مشہور شاعرہ "سیفو" کی زندگی میں تو وہ عبادو بھر کر دیتی اُن کا ۔ دراصل اب تک افزائش نسل کے اہم مسئلے سے عورتوں کو فرصت کب دی گئی کہ وہ کسی دوسرے کام میں اپنی پوری توجہ دے سکیں ۔ پھر انھیں اس قدر پچھڑا رکھا گیا' اس قدر بے پڑھا لکھا رکھا گیا' یا اس قدر پردے میں' یا گھر کی چار دیواری میں مقید رکھا گیا کہ زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح علم و ادب کے میدان میں بھی وہ زیادہ تعداد میں اپنے جوہر نہ دکھا سکیں' تو اس پر کسی کو حیرت نہ ہونی چاہیے اور ان پر طعنہ کسنے کا تو کوئی موقع ہی نہیں ہے ۔

میں نے شولوخوف اور عورتوں کا ذکر اس لیے کیا کہ 'کہانی کی کہانی' بیان کرنے کے سلسلے میں ان کا ذکر ضروری تھا ۔ بہت سے لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ افسانے کا فن بھی سب سے پہلے عورت نے شروع کیا ۔ بعد میں مرد اپنی دھاندلی اور گھپلے بازی سے اس پر سبقت لے گئے ۔ مگر اس پر بیشتر سائنس داں اور محقق متفق ہیں کہ کہانی کہنے کے فن کو سب سے پہلے عورت نے رواج دیا ۔ کھیتی باڑی کی طرح شاید اس امر سے آپ بھی واقف ہوں گے کہ کھیتی باڑی کرنا انسان کو سب سے پہلے عورت نے سکھایا ۔ جب انسان جنگلوں میں رہتا تھا تو مرد زیادہ تر شکار کے لیے چلے جاتے تھے اور شکار کھیلنا آج کے شکار کی طرح آسان بھی نہ تھا ۔ نہ بندوق تھی ان دنوں' نہ رائفل' نہ کارتوس' تیر کمان بھی بعد کی ایجاد ہے ۔ اس سے پہلے انسان کے لیے کسی جنگلی جانور کو مارنا اور ان کا گوشت حاصل کرنا جان جوکھم کا کام تھا ۔ کئی بار اپنے دام میں صیاد آ جاتا تھا اور کسی کا گوشت حاصل کرنے کے بجائے خود اس کے کھانے کا گوشت بن جاتا تھا ادھر تو یہ سانحہ ہوا ۔ ادھر گھر پر یا غار میں بیوی بچے بھوکے ہیں ۔ ایسے عالم میں عورتوں نے وہ پودے دریافت کیے جن کے بیج کھا کر زندہ رہا جا سکتا تھا ۔ عورت نے مرد کو نہ صرف دانۂ گندم کھانے کی ترغیب دی بلکہ اسے دریافت بھی خود ہی کیا ۔ چاول بھی عورتوں کی

دریافت ہے۔ پھر ان پودوں کو پتھر کے ہل یا کسی جنگلی جانور کی ہڈی سے زمین کھود کر ان کے بیج سے نئے پودے اُگانا، یہ بھی سب سے پہلے عورتوں نے دریافت کیا۔ آج کل کا کسان کھیت میں ہل چلاتا ہے اور سمجھتا ہے وہ اپنی عورت کو روٹی کھلا رہا ہے۔ حالانکہ روٹی پکا کے کھلانے کا فن بھی عورتوں کی ایجاد ہے۔

آپ نے اپنی سب سے پہلی کہانی نانی اماں سے سُنی ہوگی یا دادی اماں سے، یا اپنی ماں سے۔ آج سے ہزاروں سال پہلے کی کہانی یعنی سب سے پہلی کہانی بھی اسی طرح کہی گئی تھی رات کے سناٹے میں۔ اندھیرے کے خوف کو مٹانے کے لیے بچے کے اندر زندگی کے خوش آیند تصور کو جگانے کے لیے۔ ماں کی مہربان آغوش میں سُلانے کے لیے اس طرح لوری، گیت، شاعری اور کہانی کے فن کا آغاز ہوا۔ چیخوف، شولوخوف، موپاساں، ام، پریم چند، منٹو، بیدی بعد میں آئے۔ پہلے تو ایک عورت آئی تھی۔ آج بھی کوئی کہانی عورت کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ اور نہ ہی دلچسپ سمجھی جاتی ہے۔

جس طرح کھیتی باڑی کا فن عورت کے ہاتھ سے نکل کر ایک پیچیدہ اور مرکب عمل بن گیا ہے۔ اسی طرح سے کہانی ماں کی لوری اور پرستانی تصورات کی داستان سے آگے بڑھ کر زندگی کی تفسیر بن گئی ہے اور بے حد پیچیدہ اور مرکب ہو گئی ہے۔

بہت عرصے تک کہانی کا فن ایشیا میں بھاٹوں کے سپرد رہا اور یورپ میں TROUGHDOURS کی تحویل میں رہا۔ یہ آوارہ گرد، جہاں گرد نغمہ گو مختلف قصے کہانیوں کو شعری جامہ پہنا کر راگ میں ڈھال کر ساز پر سناتے تھے۔ اُن دنوں کہانیاں گائی جاتی تھیں۔ شعر، نغمہ اور کہانی ایک ہی سانچے میں ڈھل جاتے تھے اور کیا کیا دلچسپ قصے ہوتے تھے۔ سورمیوں کے اور بہادری کے KNIGHTS کے اور بادشاہوں کے اور شہزادیوں کے، عاشقوں کے اور آشفتہ مزاجوں کے، اُن مافوق الفطرت دیوؤں کے جو نازک بدن حسیناؤں کو کاٹھ کے پنجرے میں یا ایک چھوٹی سی ڈبیا میں بند کر کے اپنی جیب میں رکھ لیتے تھے اور "مانس گندھ" "مانس گندھ" کہتے ہوئے انسانوں کے شکار کی تلاش میں چل دیتے تھے۔

آج کہانی اس زمانے سے بہت دور نکل آئی ہے۔ براہِ راست اس کا رشتہ شعر سے، نغمے سے، راگ اور ساز سے کٹ گیا ہے۔ اب کہانی نثر کی زبان میں ڈھل گئی ہے۔ لیکن آج کی کہانی میں شعریت، اندرونی نغمگی اور ایک باطنی راگ اور اُس کی لَے سے عاری نہیں ہو سکتی، جو ادب اور فن کے ہر شعبے میں ایک اچھی تخلیق کو ایک بڑی تخلیق سے ممتاز کرتی ہے۔ آج کی اچھی کہانی بھی اسی پہلے مقصد کو پورا کرتی ہے جس کی ضرورت ماں نے اپنے بچے کے لیے سمجھی تھی۔ یعنی اندھیرے کے خوف کو مٹانے کے لیے، اور زندگی کے خوش آیند تصور کو انسان کے دل میں جگانے کے لیے آج بھی کہانی استعمال کی جاتی ہے۔ اور آگے بھی کی جائے گی اور یہی اس کا صحیح مصرف بھی ہوگا۔ کیونکہ

کہانی کی کہانی

کرشن چندر

گو انسان بہت ترقی کر گیا ہے۔ مگر آج بھی وہ جنگل میں رہتا ہے۔ چاروں کھونٹ جنگل بسے ہیں اور ان میں دیواروں
کے جنگل اُگ گئے ہیں۔ اور دیوزادی طاقتیں زندگی کی حسین، نازک نفیس قدروں کو کاٹھ کے پنجرے میں مقید کیے یا جیب
کی کسی ڈبیہ میں "ڈالے" - "مانس گندھ" "مانس گندھ" کرتی ہوئی انسان کے شکار کی تلاش میں گھوم رہی ہیں۔ قبیلوں،
قوموں اور ملکوں کے سردار بادشاہ اور سلطان گئے تو ٹین کے بادشاہ آگئے۔ لوہے کے ہل شہنشاہ اور جوٹ
کے سلطان، بھاٹ اگر قصیدہ گو نہیں ہے تو اس کا سر قلم ہوگا۔ آوارہ گردوں، آشفتہ مزاجوں، عاشقوں کے لیے
کہانی کہنا آج بھی اتنا مشکل ہے جتنا کہ ان پچھلے زمانوں میں تھا۔

ادھر کہانی کے میدان میں کچھ نئے لوگ آئے ہیں۔ یہ لوگ بظاہر نئی نسل کے ہیں۔ لیکن دراصل
بالکل اپنے جیسے ہیں۔ بالکل ایسے ہی کپڑے پہنتے ہیں۔ اسی طرح شیو کرتے ہیں۔ اسی زبان میں گفتگو کرتے ہیں
جس میں ہم کرتے ہیں۔ اسی طرح روزی، روٹی، ملازمت کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ بالکل عام لوگوں
کی طرح اپنی غرض کو پورا کرنے کے لیے خوشامد بھی کرتے ہیں۔ ان کی زندگی کے ہر شعبے میں ترتیب ہے، تنظیم ہے۔
ابلاغ ہے۔ مقصد ہے۔ کوئی منزل ہے۔ کوئی جادہ ہے، اور اگر کہیں پر کچھ نہیں ہے تو خود ادب کے میدان میں نہیں ہے
وہ زندگی کے ہر شعبے میں کسی نہ کسی مقصد کو روا رکھتے ہیں۔ مگر ادب میں نہیں۔ آپ جب ان سے بات کریں گے تو ان
کی گفتگو بالکل ٹھیک ٹھیک آپ کی سمجھ میں آئے گی۔ مگر جب کہانی لکھیں گے تو آپ کے پلے کچھ نہیں پڑے گا۔
سوائے ایک مجہول چیستان کے۔ وہ کافی ہاؤس کا راستہ پہچانتے ہیں مگر اپنی کہانی کا نہیں۔ انھیں اپنی ملازمت
کا مقصد معلوم ہے، اپنی کہانی کا نہیں۔ جب وہ گھر جاتے ہیں تو دو ٹانگوں کے سہارے قدم اٹھاتے ہوئے
جاتے ہیں۔ مگر اپنی کہانی میں سر کے بل رینگتے ہیں اور اسے آرٹ کہتے ہیں۔ میں انھیں کہانی کار نہیں کہتا،
شعبدہ باز کہتا ہوں۔ یہ لوگ رنگین الفاظ کے فیتے اپنے منہ سے نکالتے ہیں۔ اپنی جھولی سے خرگوش، آپ کی
جیب سے انڈا، اور آپ کو حیران و ششدر چھوڑ دیتے ہیں۔ بعد میں آپ سوچتے ہیں کہ آپ کی جیب کی آخری
چونی بھی شعبدے بازی کی نذر ہوگئی اور ملا کچھ نہیں۔ اور آپ کو کچھ ملے بھی تو کیوں؟ —— کیونکہ یہ لوگ آپ
سے صرف لینے کے قائل ہیں۔ اس کے عوض میں کچھ دینے کے نہیں۔ اور سماج میں آپ جانتے ہیں۔ کچھ لوگ
کام کرتے ہیں۔ اس کام کی کوئی ترتیب ہوتی ہے۔ کوئی تنظیم ہوتی ہے۔ اس کا کوئی مقصد ہوتا ہے۔ اس کام سے
کسی کی کوئی خدمت سرانجام دی جاتی ہے اور اس کا معاوضہ بھی ملتا ہے۔ مگر یہ نئے کہانی کار سماج کے صرف
اس حد تک قائل ہیں کہ سماج ان کو کچھ دے، اور برابر دیتا رہے۔ اس کے عوض میں یہ سماج کو کیا
دیتے ہیں —— اس کی ان کو کوئی پروا نہیں ہے۔ نہ یہ اس قسم کی باتوں کے قائل ہیں۔ کہانی لکھتے وقت
یہ بالکل بے مقصد ہوں گے۔ لیکن کہانی چھپتے ہی فوراً مقصد کے قائل ہو جائیں گے۔ یعنی معاوضے
کے —— شہرت کے، عزت کے اور تعریف کے۔ یعنی ان تمام مقاصد کے جن کے لیے اکثر عام آدمی حیران و
سرگرداں رہتے ہیں ——

میں نے اپنی بوڑھی نانی اماں سے کہانیاں سنی ہیں یا پھر اپنی ماں کی آغوش میں۔ اس لیے میری کہانی کا فن بھی اتنا ہی پرانا ہے۔ یعنی کہانی سننے والے کو کہانی کی لذت ملے۔ رات، موت اور اندھیرے کا ڈر دور ہو۔ زندگی کے خوش آیند اور روشن تصورات جاگیں۔ کیونکہ ہم سورج کے بیٹے ہیں۔ اگر ہم تاریکی اور اندھیرے کے بیٹے ہوتے تو ہماری آنکھیں نہ ہوتیں اور ہماری حسیات کا عالم ہی دوسرا ہوتا۔ مگر ہم سورج کے بیٹے ہیں۔ آگ ہمارا وطن ہے۔ روشنی ہماری غذا ہے۔ چاندنی ہمارے محبوب کا بدن ہے۔ ہم آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہیں اور محبت کرتے ہیں۔ کیونکہ ہم اندھے نہیں۔ اس دنیا میں آنکھوں سے زیادہ مقدس کوئی شے نہیں۔

اسی لیے میری کہانیاں آنکھیں رکھتی ہیں۔ وہ راستہ دیکھتی ہیں اور ارد گرد کے دلچسپ مناظر بھی۔ مگر ہر لحظہ نگاہ اُدھر رہتی ہے جہاں جانا ہے۔ جسے منزل، مقصد، نصب العین، کچھ بھی کہیے۔ میں اسے ہاتھی دانت کا ٹاور کہتا ہوں۔ سو سال سے میرے سپنوں کی حسین شہزادی اس ٹاور میں سو رہی ہے۔ صرف وہی نہیں سو رہی اس کے آس پاس سَو، سَو میل تک کا سارا جنگل سو رہا ہے، اور میری نانی اماں نے مجھے بتایا تھا کہ جو کوئی بھی اس گھنے جنگل کو عبور کر کے اس ٹاور کا دروازہ توڑ کر اس شہزادی کی آنکھوں پر بوسہ دینے میں کامیاب ہو جائے گا، شہزادی اسی لمحے جاگ جائے گی۔ اور اس لمحے سارا سویا جنگل بھی جاگ جائے گا اور چاروں طرف روشنی، خوشی اور خوش حالی پھیل جائے گی۔

کیا یہ کہانی واقعی اتنی پرانی ہے کہ آج کے حالات پر منطبق نہیں ہوتی؟ کیا آج ہاتھی دانت کے ٹاور میں کوئی شہزادی نہیں سوتی؟ کیا آس پاس سو سال کیا، کئی سو سالوں سے کوئی جنگل سویا ہوا نہیں ہے؟ تاریکی میں ڈر میں، خوف اور ہراس میں، ناامیدی کے اندھیرے میں، اور موت کے بھیانک سایوں میں جنھوں نے زندگی پر سحر کر کے اس معصوم شہزادی کی آنکھوں میں نیند بھر دی ہے؟

میں ان احمقوں میں سے ہوں جو تاریک گھنے جنگل کو عبور کر کے ہاتھی دانت کے ٹاور کا دروازہ توڑ کر سوئی ہوئی شہزادی کی آنکھوں پر بوسہ دینے کی خواہش رکھتے ہیں۔

(ماخوذ از "افکار" افسانہ ایڈیشن۔ جنوری۔ فروری سنہ ۱۹۷۱ء)

چائے کے دھبے دھونے کا طریقہ

چائے کا پانی کپڑوں پر گر جائے تو اس سے دھبے پڑ جاتے ہیں۔ اس کے دھبے دور کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ سارے کپڑے چائے کے پانی میں بھگو دیجیے۔ دھبہ جاتا رہے گا ——

———— کرشن چندر

کرشن چندر

مہالکشمی کا پل

مہالکشمی اسٹیشن کے اس پار مہالکشمی جی کا ایک مندر ہے۔ اسے لوگ ریس کورس بھی کہتے ہیں۔ اس مندر میں پوجا کرنے والے ہارتے زیادہ ہیں، جیتتے بہت کم ہیں۔ مہالکشمی اسٹیشن کے اس پار ایک بہت بڑی بدرو ہے جو انسانی جسموں کی غلاظت کو اپنے متعفن پانیوں میں گھولتی ہوئی شہر سے باہر چلی جاتی ہے۔ مندر میں انسان کے دل کی غلاظت دھلتی ہے اور بدرو میں انسان کے جسم کی غلاظت اور ان دونوں کے بیچ میں مہالکشمی کا پل ہے۔ مہالکشمی کے پل کے اوپر بائیں طرف لوہے کے جنگلے پر چھ ساڑھیاں لہرا رہی ہیں۔ پل کے اس طرف ہمیشہ اس مقام پر چند ایک ساڑھیاں لہراتی رہتی ہیں۔ یہ ساڑھیاں کوئی بہت قیمتی نہیں ہیں۔ ان کے پہننے والے بھی کوئی بہت زیادہ قیمتی نہیں ہیں۔ یہ لوگ یہاں ہر روز ان ساڑھیوں کو دھو کر سوکھنے کے لیے ڈال دیتے ہیں اور ریلوے لائن کے آر پار جاتے ہوئے لوگ، مہالکشمی اسٹیشن پر گاڑی کا انتظار کرتے ہوئے لوگ، گاڑی کی کھڑکی اور دروازوں سے جھانک کر باہر دیکھنے والے لوگ، اکثر ان ساڑھیوں کو ہوا میں جھولتا ہوا دیکھتے ہیں۔ وہ ان کے مختلف رنگ دیکھتے ہیں۔ بھورا، گہرا بھورا، مٹ میلا نیلا، قرمزی بھورا، گندا سرخ، کنارا گہرا نیلا اور لال۔ وہ لوگ اکثر انہیں رنگوں کو فضا میں پھیلے ہوئے دیکھتے ہیں ایک لمحے کے لیے، دوسرے لمحے میں گاڑی پل کے نیچے سے گزر جاتی ہے۔

ان ساڑھیوں کے رنگ اب جاذب نظر نہیں رہے۔ کسی زمانے میں ممکن ہے جب یہ نئی نئی خریدی گئی ہوں، ان کے رنگ خوبصورت اور چمکتے ہوئے ہوں۔ مگر اب نہیں ہیں۔ متواتر دھوئے جانے سے ان کے رنگوں کی آب و تاب مر چکی ہے اور اب یہ ساڑھیاں اپنے پھیکے سیٹھے روزمرہ کے انداز میں بڑی بے دلی سے جنگلے پر پڑی نظر آتی ہیں۔ آپ دن میں انہیں سو بار دیکھیے یہ آپ کو کبھی خوبصورت دکھائی نہ دیں گی۔ نہ ان کا رنگ روپ اچھا ہے۔ نہ ان کا کپڑا۔ یہ بڑی سستی، گھٹیا قسم کی ساڑھیاں ہیں۔ ہر روز دھلنے سے ان کا کپڑا بھی تار تار ہو رہا ہے۔ ان میں کہیں کہیں روزن بھی نظر آتے ہیں۔ کہیں ادھڑے ہوئے ٹانکے ہیں۔ کہیں بدنما چتلے داغ جو اس قدر پائیدار ہیں کہ دھوئے جانے سے بھی نہیں دھلتے بلکہ اور گہرے ہوتے جاتے ہیں۔ میں ان ساڑھیوں کی زندگیوں کو جانتا ہوں۔ کیونکہ میں ان لوگوں کو جانتا ہوں جو ان ساڑھیوں کو استعمال کرتے ہیں۔ یہ لوگ مہالکشمی کے پل کے قریب ہی بائیں طرف آٹھ نمبر کی چال میں رہتے ہیں۔ یہ چال متوالی نہیں ہے۔ بڑی غریب سی چال ہے۔ میں بھی اسی چال میں رہتا ہوں۔ اس لیے آپ کو ان ساڑھیوں اور ان کے پہننے والوں کے متعلق سب کچھ بتا سکتا ہوں۔ ابھی وزیر اعظم کی گاڑی آنے میں بہت دیر ہے۔ آپ انتظار کرتے کرتے اکتا

جائیں گے۔ اس لیے اگر آپ ان چھ ساڑھیوں کی زندگی کے بارے میں مجھ سے کچھ سُن لیں تو وقت آسانی سے کٹ جائے گا۔
ادھر یہ جو بھورے رنگ کی ساڑھی لٹک رہی ہے۔ یہ شانتا بائی کی ساڑھی ہے اس کے قریب جو ساڑھی لٹک رہی ہے وہ بھی آپ کو بھورے رنگ کی دکھائی دیتی ہوگی۔ مگر وہ تو گہرے بھورے رنگ کی ہے۔ آپ نہیں، میں اس کا گہرا بھورا رنگ دیکھ سکتا ہوں کیونکہ میں اسے اُس وقت سے جانتا ہوں جب اس کا رنگ چمکتا ہوا گہرا بھورا تھا۔ اب اس دوسری ساڑھی کا رنگ بھی ویسا ہی بھورا ہے، جیسا شانتا بائی کی ساڑھی کا۔ اور شاید آپ ان دونوں ساڑھیوں میں بڑی مشکل سے کوئی فرق محسوس کر سکیں۔ میں بھی جب ان کے پہننے والوں کی زندگیوں کو دیکھتا ہوں، تو بہت کم فرق محسوس کرتا ہوں۔ مگر یہ پہلی ساڑھی جو بھورے رنگ کی ہے۔ وہ شانتا بائی کی ساڑھی ہے اور جو دوسرے بھورے رنگ کی ساڑھی ہے اور جس کا گہرا بھورا رنگ صرف میری آنکھیں دیکھ سکتی ہیں وہ جیونا بائی کی ساڑھی ہے۔

شانتا بائی کی زندگی بھی اُس کی ساڑھی کے رنگ کی طرح بھوری ہے۔ شانتا بائی برتن مانجھنے کا کام کرتی ہے۔ اُس کے تین بچے ہیں۔ ایک بڑی لڑکی ہے۔ دو چھوٹے لڑکے ہیں۔ بڑی لڑکی کی عمر چھ سال کی ہوگی۔ سب سے چھوٹا لڑکا دو سال کا ہے۔ شانتا بائی کا خاوند سیون مل کے کپڑ کھاتے میں کام کرتا ہے۔ اُسے بہت جلد جانا ہوتا ہے۔ اس لیے شانتا بائی اپنے خاوند کے لیے دوسرے دن کی دوپہر کا کھانا رات ہی کو پکا کر رکھتی ہے۔ کیونکہ صبح اُسے خود برتن صاف کرنے کے لیے اور پانی ڈھونے کے لیے دوسرے گھروں میں جانا ہوتا ہے۔ اور اب وہ ساتھ میں اپنے چھ برس کی بچی کو بھی لے جاتی ہے اور دوپہر کے قریب چال میں واپس آتی ہے۔ واپس آ کے وہ نہاتی ہے اور اپنی ساڑھی دھوتی ہے اور سکھانے کے لیے مِل کے جنگلے پر ڈال دیتی ہے اور پھر ایک بے حد غلیظ اور پرانی دھوتی پہن کر کھانا پکانے لگ جاتی ہے۔ شانتا بائی کے گھر چولھا اسی وقت سلگ سکتا ہے۔ جب دوسروں کے ہاں چولھے ٹھنڈے ہو جائیں یعنی دوپہر کو دو بجے اور رات کو نو بجے ان اوقات کے اِدھر اُدھر اُسے دونوں وقت گھر سے باہر برتن مانجھنے اور پانی ڈھونے کا کام کرنا ہوتا ہے۔ اب تو چھوٹی لڑکی بھی اُس کا ہاتھ بٹاتی ہے۔ شانتا بائی برتن صاف کرتی ہے، چھوٹی لڑکی برتن دھوتی جاتی ہے۔ دو تین بار ایسا بھی ہوا کہ چھوٹی لڑکی کے ہاتھ سے چینی کے برتن گر کر ٹوٹ گئے۔ اب میں جب کبھی چھوٹی لڑکی کی آنکھیں سوجی ہوئی اور اُس کے گال سرخ دیکھتا ہوں تو سمجھ جاتا ہوں کہ کسی بڑے گھر میں چینی کے برتن ٹوٹے ہیں۔ اُس دن شانتا بھی میری نمستے کا جواب نہیں دیتی۔ جلتی بھنتی بڑبڑاتی چولھا سلگانے میں مصروف ہو جاتی ہے اور چولھے میں آگ کم اور دھواں زیادہ نکالنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ چھوٹا لڑکا، جو دو سال کا ہے۔ دھوئیں سے اپنا دم گھٹتا دیکھ کر چیختا ہے تو شانتا بائی اُس کے چینی ایسے نازک رخساروں پر زور زور کی چپتیں لگانے سے باز نہیں آتی اس پر بچّہ اور زیادہ چیختا ہے۔ یوں تو یہ دن بھر روتا رہتا ہے۔ کیونکہ اسے دودھ نہیں ملتا ہے اور اسے اکثر بھوک لگی رہتی ہے اور دو سال کی عمر ہی میں اُسے باجرے کی روٹی کھانا پڑتی ہے۔ اسے اپنی ماں کا دودھ اپنے دوسرے بھائی بہن کی طرح صرف پہلے چند ماہ نصیب ہوا وہ بھی بڑی مشکل سے۔ پھر یہ بھی خشک باجری اور ٹھنڈے پانی پر پلنے لگا۔ ہماری چال کے سارے بچّے اسی خوراک پر پلتے ہیں۔ وہ دن بھر ننگے رہتے ہیں اور رات کو گدڑی اوڑھ کر سو جاتے ہیں۔ سوتے میں بھی وہ بھوکے رہتے ہیں اور جاگتے میں بھی بھوکے رہتے ہیں اور جب شانتا بائی کے خاوند کی طرح بڑے ہو جاتے ہیں تو دن بھر خشک باجری اور ٹھنڈا پانی پی پی کر کام کرتے جاتے ہیں اور اُن کی بھوک بڑھتی جاتی ہے اور ہر وقت معدے کے اندر اور دل کے اندر اور دماغ کے اندر ایک بوجھل سی دھمک محسوس کرتے رہتے ہیں اور جب پگار ملتی ہے تو اُن میں کئی ایک سیدھے تاڑی خانہ کا رُخ کرتے ہیں۔ تاڑی پی کر چند گھنٹوں کے لیے یہ دھمک اُٹھ جاتی

ہے۔ لیکن آدمی ہمیشہ تو تاڑی نہیں پی سکتا۔ ایک دن پیے گا، دو دن پیے گا، تیسرے دن کی تاڑی کے پیسے کہاں سے لائے گا آخر کھولی کا کرایہ دینا ہے، راشن کا خرچہ ہے، بھاجی ترکاری ہے، تیل اور نمک ہے، بجلی اور پانی ہے، شانتا بائی کی بھوری ساڑھی ہے جو چھٹے ساتویں تار تار ہو جاتی ہے۔ کبھی سات ماہ سے زیادہ نہیں چلتی۔ یہ مل والے بھی پانچ روپے چار آنے میں کیسی کھدی نکمی ساڑھی دیتے ہیں۔ اس کے کپڑے میں ذرا جان نہیں ہوتی۔ چھٹے ماہ سے جو تار تار ہونا شروع ہوتا ہے تو ساتویں ماہ بڑی مشکل سے سی کے، جوڑ کے، گانٹھ کے، ٹانکے لگا کے کام دیتا ہے اور پھر وہی پانچ روپے چار آنے خرچ کرنا پڑتے ہیں اور وہی بھورے رنگ کی ساڑھی آجاتی ہے۔ شانتا کو یہ رنگ بہت پسند ہے اس لیے کہ یہ میلا بہت دیر میں ہوتا ہے۔ اُسے گھروں میں جھاڑو دینا ہوتی ہے، برتن صاف کرنے ہوتے ہیں، تیسری چوتھی منزل تک پانی ڈھونا ہوتا ہے۔ وہ بھورا رنگ نہیں پسند کرے گی تو کیا کھلتے ہوئے شوخ رنگ گلابی بسنتی، نارنجی پسند کرے گی۔ وہ اتنی بے وقوف نہیں ہے۔ وہ تین بچوں کی ماں ہے، لیکن کبھی اُس نے یہ شوخ رنگ بھی دیکھے تھے، پہنے تھے۔ انھیں اپنے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پیار کیا تھا۔ جب وہ دھارواڑ میں اپنے گاؤں میں تھی جہاں اُس نے بادلوں میں شوخ رنگوں والی دھنک دیکھی تھی۔ جہاں میلوں میں اُس نے شوخ رنگ ناچتے ہوئے دیکھے تھے، جہاں اُس کے باپ کے دھان کے کھیت تھے ایسے شوخ ہرے ہرے رنگ کے کھیت اور آنگن میں پیرو کا پیڑ جس کے ڈال ڈال سے وہ پیرو توڑ توڑ کے کھایا کرتی تھی۔ جانے اب پیروؤں میں وہ مزا ہی نہیں ہے۔ وہ شیرینی اور گھلاوٹ ہی نہیں ہے۔ وہ رنگ وہ چمک دمک کہاں جا کے مر گئی۔ وہ سارے رنگ کیوں یک لخت بھورے ہو گئے۔ شانتا بائی کبھی برتن مانجھتے مانجھتے، کھانا پکاتے، اپنی ساڑھی دھوتے۔ اُسے پُل کے جنگلے پر لا کر ڈالتے ہوئے یہ سوچا کرتی ہے اور اُس کی بھوری ساڑھی سے پانی کے قطرے آنسوؤں کی طرح ریل کی پٹری پر بہتے جاتے ہیں اور دور سے دیکھنے والے لوگ ایک بھورے رنگ کی بدصورت عورت کو پُل کے اوپر جنگلے پر ایک بھوری ساڑھی کو پھیلاتے ہوئے دیکھتے ہیں اور بس دوسرے لمحے میں گاڑی پُل کے نیچے سے گزر جاتی ہے۔

جیونا بائی کی ساڑھی جو شانتا بائی کی ساڑھی کے ساتھ لٹک رہی ہے۔ گہرے بھورے رنگ کی ہے۔ بظاہر اس کا رنگ شانتا بائی کی ساڑھی سے بھی پھیکا نظر آئے گا۔ لیکن اگر آپ اُسے غور سے دیکھیں تو اس پھیکے پن کے باوجود یہ آپ کو گہرے بھورے رنگ کی نظر آئے گی۔ یہ ساڑھی بھی پانچ روپے چار آنے کی ہے اور بڑی ہی بوسیدہ ہے۔ دو ایک جگہ سے پھٹی ہوئی تھی۔ لیکن اب وہاں پر ٹانکے لگ گئے ہیں۔ اور اتنی دور سے معلوم بھی نہیں ہوتے۔ ہاں آپ وہ بڑا ٹکڑا ضرور دیکھ سکتے ہیں جو گہرے نیلے رنگ کا ہے اور اس ساڑھی کے بیچ میں جہاں سے یہ ساڑھی بہت پھٹ چکی تھی لگایا گیا ہے۔ یہ ٹکڑا جیونا بائی کی اس سے پہلی ساڑھی کا ہے اور اس دوسری ساڑھی کو مضبوط بنانے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ جیونا بائی بیوہ ہے اس لیے وہ ہمیشہ پرانی چیزوں سے نئی چیزوں کو مضبوط بنانے کے ڈھنگ سوچا کرتی ہے۔ پرانی یادوں سے نئی یادوں کی تلخیوں کو بھول جانے کی کوشش کیا کرتی ہے۔ جیونا بائی اپنے اُس خاوند کے لیے روتی رہتی ہے جس نے ایک دن اُسے نشے میں مار مار کر اس کی ایک آنکھ کانی کر ڈالی تھی وہ اس لیے نشے میں تھا کہ وہ اسی روز مل سے نکالا گیا تھا۔ بڈھا ڈھونڈو اب مل میں کسی کام کا نہیں رہا تھا۔ گو وہ بہت تجربے کار تھا۔ لیکن اُس کے ہاتھوں میں اتنی طاقت نہ رہی تھی کہ وہ جوان مزدوروں کا مقابلہ کر سکتا۔ بلکہ وہ تو اب دن رات کھانسی میں مبتلا رہنے لگا تھا۔ کپاس کے ننھے ننھے ریشے اُس کے پھیپھڑوں میں جا کے ایسے دھنس گئے تھے جیسے چرخیوں اور اینٹوں میں سوت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے (بَھیں) لگے پھنس جاتے ہیں۔ جب برسات آئی تو یہ ننھے ننھے ریشے اُسے دمے میں مبتلا کر دیتے اور جب برسات نہ ہوتی تو وہ دن بھر اور رات بھر

کھانستا۔ ایک خشک اور مسلسل کھنکھار گھر میں اور کارخانے میں جہاں وہ کام کرتا تھا، سنائی دیتی رہتی۔ مل کے مالک نے اس کھانسی کی خطرناک گھنٹی کو سنا اور ڈھونڈو کو مل سے نکال دیا۔ ڈھونڈو اس کے چھ ماہ بعد مر گیا۔ جیونا بائی کو اس کے مرنے کا بہت غم ہوا۔ کیا ہوا اگر غصہ میں آ کے ایک دن اس نے جیونا کی آنکھ نکال لی۔ تیس سال کی شادی شدہ زندگی ایک لمحے کے غصہ پر قربان نہیں کی جا سکتی اور اس کا غصہ بجا تھا۔ اگر مل مالک ڈھونڈو کو یوں بے قصور نوکری سے الگ نہ کرتا تو کیا جیونا کی آنکھ نکل سکتی تھی۔ ڈھونڈو ایسا نہ تھا۔ اُسے اپنی بے کاری کا غم تھا۔ اپنی ۳۵ سالہ ملازمت سے برطرف ہونے کا رنج تھا اور سب سے بڑا رنج اس بات کا تھا کہ مل مالک نے چلتے وقت اُسے ایک دھیلا بھی تو نہیں دیا۔ ۳۵ سال پہلے جیسے ڈھونڈو خالی ہاتھ مل میں کام کرنے کے لیے آیا تھا اسی طرح خالی ہاتھ واپس لوٹا اور دروازے سے باہر نکلنے پر اور اپنا نمبری کارڈ پیچھے چھوڑ دینے پر اُسے ایک دھچکا سا لگا۔ باہر آ کے اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے ان ۳۵ سالوں میں کسی نے اس کا سارا رنگ، اس کا سارا خون، اس کا سارا رس چوس لیا ہو اور اُسے بے کار سمجھ کے باہر کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر پھینک دیا اور ڈھونڈو بڑی حیرت سے مل کے دروازے کو اور اس بڑی چمنی کو دیکھنے لگا جو بالکل اس کے سر پر ایک خوفناک دیو کی طرح آسمان سے لگی کھڑی تھی۔ یکایک ڈھونڈو نے غم اور غصہ سے اپنے ہاتھ ملے۔ :: مین پرزور سے تھوکا اور پھر تاڑی خانہ میں چلا گیا۔

لیکن جیونا کی ایک آنکھ جب بھی نہ جاتی، اگر اس کے پاس علاج کے لیے پیسے ہوتے۔ وہ آنکھ تو گل گل کر سٹر سٹر کر خیراتی ہسپتالوں میں ڈاکٹروں، کمپونڈروں اور نرسوں کی بد احتیاطیوں اور گالیوں اور لاپروائیوں کا شکار ہو گئی اور جب جیونا اچھی ہوئی تو ڈھونڈو بیمار پڑ گیا، اور ایسا بیمار پڑا کہ پھر بستر سے نہ اٹھ سکا۔ ان دنوں میں جیونا اس کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ شانتا بائی نے مدد کے طور پر اُسے چند گھروں میں برتن مانجھنے کا کام دلوا دیا تھا اور گو وہ اب بوڑھی تھی اور مشاقی اور صفائی سے برتنوں کو صاف نہ رکھ سکتی تھی۔ پھر بھی وہ آہستہ آہستہ رینگ رینگ کر اپنے کمزور ہاتھوں میں جھوٹی طاقت کے بودے سہارے پر جیسے تیسے کام کرتی رہی۔ خوبصورت لباس پہننے والی، خوشبو دار تیل لگانے والی بیویوں کی گالیاں سنتی رہی اور کام کرتی رہی۔ کیونکہ اس کا ڈھونڈو بیمار تھا اور اُسے اپنے آپ کو اور اپنے خاوند کو زندہ رکھنا تھا۔ لیکن ڈھونڈو زندہ نہ رہا اور اب جیونا بائی اکیلی تھی۔ خیریت اس میں تھی کہ بالکل اکیلی تھی اور اب اُسے صرف اپنا دھندا کرنا تھا۔ شادی کے دو سال بعد اس کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی، لیکن جب وہ جوان ہوئی تو کسی بد معاش کے ساتھ بھاگ گئی اور اس کا آج تک کسی کو پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں ہے؟ پھر کسی نے بتایا اور پھر بعد میں بہت سے لوگوں نے بتایا کہ جیونا بائی کی بیٹی فارس روڈ پر چمکیلا، بھڑکیلا ریشمی لباس پہنے بیٹھی ہے۔ لیکن جیونا کو یقین نہ آیا۔ اس نے اپنی ساری زندگی پانچ روپے چار آنے کی دھوتی پہنے بسر کر دی تھی اور اُسے یقین تھا کہ اس کی لڑکی بھی ایسا کرے گی۔ وہ ایسا نہیں کرے گی، اس کا اُسے کبھی خیال بھی نہیں آیا تھا وہ کبھی فارس روڈ نہیں گئی کیونکہ اُسے اس کا یقین تھا کہ ـــــ اس کی بیٹی وہاں نہیں ہے۔ بھلا اس کی بیٹی وہاں کیوں جانے لگی۔ یہاں اپنی کھولی میں کیا نہیں تھا۔ پانچ روپے چار آنے والی دھوتی تھی۔ باجرے کی روٹی تھی۔ ٹھنڈا پانی تھا۔ سوکھی عزت تھی اور یہ سب کچھ چھوڑ کے وہ فارس روڈ کیوں جانے لگی۔ اُسے تو کوئی بد معاش اپنی محبت کا سبز باغ دکھا کے لے گیا تھا۔ کیونکہ عورت محبت کے لیے سب کچھ کر گزرتی ہے۔ خواہ وہ تیس سال پہلے اپنے ڈھونڈو کے لیے اپنے ماں باپ کا گھر چھوڑ کر نہیں چلی آئی تھی جس دن ڈھونڈو مرا اور جب لوگ اس کی لاش کو جلانے کے لیے لے جانے لگے اور جیونا نے اپنی سیندور کی ڈبیا اپنی بیٹی کی انگیا پر انڈیل دی جو اس نے بڑی

مدّت سے ڈھونڈو کی نظروں سے چھپا کے رکھی تھی۔ عین اُسی وقت ایک گدرائے ہوئے جسم کی بھاری عورت بڑا چمکیلا لباس پہنے اُس سے آ کے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی اور اُسے دیکھ کر یکایک جیونا کو یقین آ گیا کہ جیسے اب سب کچھ مر گیا ہے۔ اُس کا پتی۔ اُس کی بیٹی۔ اُس کی عزت۔ جیسے وہ زندگی بھر روٹی نہیں غلاظت کھاتی رہی ہے۔ جیسے اُس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ شروع ہی سے کچھ نہیں تھا۔ پیدا ہونے سے پہلے ہی اُس سے سب کچھ چھین لیا گیا تھا۔ اُسے نہتا۔ ننگا اور بے عزت کر دیا گیا تھا اور جیونا کو اُس ایک لمحے میں احساس ہوا۔ کہ وہ جگہ جہاں اُس کا خاوند زندگی بھر کام کرتا رہا اور وہ جگہ جہاں اُس کی آنکھ اندھی ہو گئی اور وہ جگہ جہاں اُس کی بیٹی اپنی دُکان سجا کے بیٹھ گئی۔ ایک بہت بڑا اندھا کارخانہ ہے جس میں کوئی ظالم جابر ہاتھ انسانی جسموں کو لے کے گنّے کا رس نکالنے والی چرخی میں ٹھونستا جاتا ہے اور دوسرے ہاتھ سے توڑ مروڑ کر دوسری طرف پھینکتا جاتا ہے۔ اور یکایک جیونا اپنی بیٹی کو دھکا دے کے الگ کھڑی ہو گئی اور چیخیں مار مار کر رونے لگی۔

تیسری ساڑی کا رنگ مٹ میلا نیلا ہے۔ یعنی نیلا بھی ہے اور میلا بھی ہے اور مٹیالا بھی ہے۔ کچھ ایسا عجیب سا رنگ ہے جو بار بار دھونے پر بھی نہیں نکھرتا بلکہ اور غلیظ ہوتا جاتا ہے۔ یہ میری بیوی کی ساڑی ہے۔ میں فورٹ میں دھنو بھائی کی فرم میں کلرکی کرتا ہوں۔ مجھے پینسٹھ روپے تنخواہ ملتی ہے۔ سیوَن اور بکسریا مل کے مزدوروں کو بھی یہی تنخواہ ملتی ہے۔ اس لیے میں بھی اُنھیں کے ساتھ آٹھ نمبر کی چال کی ایک کھولی میں رہتا ہوں۔ مگر میں مزدور نہیں ہوں۔ کلرک ہوں۔ میں فورٹ میں نوکر ہوں، میں دسویں پاس ہوں، میں "ٹائپ" کر سکتا ہوں۔ انگریزی میں عرضی لکھ سکتا ہوں۔ میں اپنے وزیر اعظم کی تقریر جلسے میں سن کر سمجھ بھی لیتا ہوں۔ آج تھوڑی دیر میں اُن کی گاڑی مہالکشمی پر آئے گی۔ نہیں وہ ریس کورس نہیں جائیں گے۔ وہ سمندر کے کنارے ایک شاندار تقریر کریں گے۔ اس موقع پر لاکھوں آدمی جمع ہوں گے۔ ان لاکھوں میں میں بھی ایک ہوں گا۔ میری بیوی کو اپنے وزیر اعظم کی باتیں سننے کا بہت شوق ہے۔ مگر میں اُسے اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا۔ کیونکہ ہمارے آٹھ بچے ہیں اور گھر میں ہر وقت پریشانی سی رہتی ہے۔ جب دیکھو کوئی نہ کوئی چیز کم ہو جاتی ہے، راشن تو روز کم پڑ جاتا ہے۔ اب نل میں پانی بھی کم آتا ہے۔ رات کو سونے کے لیے جگہ بھی کم پڑتی ہے، اور تنخواہ تو اس قدر کم پڑتی ہے کہ مہینہ میں صرف پندرہ دن چلتی ہے۔ باقی پندرہ دن سود خور پٹھان چلاتا ہے اور وہ بھی کیسے گالیاں بکتے جھکتے، گھسٹ گھسٹ کر کسی سست رفتار مال گاڑی کی طرح یہ زندگی چلتی ہے۔

میرے آٹھ بچے ہیں۔ مگر یہ اسکول میں نہیں پڑھ سکتے۔ میرے پاس ان کی فیس کے پیسے کبھی نہ ہوں گے۔ پہلے پہل جب میں نے بیاہ کیا تھا اور ساوتری کو اپنے گھر یعنی اس کھولی میں لایا تھا تو میں نے بہت کچھ سوچا تھا۔ ان دنوں ساوتری بھی بڑی اچھی اچھی باتیں سوچا کرتی تھی، گوبھی کے نازک نازک ہرے ہرے پتوں کی طرح پیاری پیاری باتیں۔ جب وہ مسکراتی تھی تو سینما کی تصویر کی طرح خوبصورت دکھا کرتی تھی۔ اب وہ مسکراہٹ نہ جانے کہاں چلی گئی ہے۔ اُس کی جگہ ایک مستقل تیوری نے لے لی ہے۔ وہ ذرا سی بات پر بچوں کو بے تحاشا رونا پیٹنا شروع کر دیتی ہے اور میں تو کچھ بھی کہوں، کیسے بھی کہوں، کتنی ہی لجاجت سے کہوں، وہ تو بس مجھے کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے۔ پتہ نہیں۔ ساوتری کو کیا ہو گیا ہے۔ پتہ نہیں مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میں دفتر میں سیٹھ کی گالیاں سنتا ہوں، گھر پر بیوی کی گالیاں سنتا ہوں، اور ہمیشہ خاموش رہتا ہوں۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں، شاید میری بیوی کو ایک نئی ساڑھی کی ضرورت ہے۔ شاید اُسے صرف ایک نئی ساڑھی ہی نہیں، ایک نئے چہرے، ایک نئے گھر، ایک نئے ماحول، ایک نئی زندگی کی ضرورت ہے۔ مگر اب ان باتوں کو سوچنے سے کیا ہوتا ہے۔ اب تو آزادی آ گئی ہے اور ہمارے وزیر اعظم نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ

اس نسل کو، یعنی ہم لوگوں کو اپنی زندگی میں کوئی آرام نہیں مل سکتا۔ میں نے ساوتری کو اپنے وزیراعظم کی تقریر جو اخبار میں چھپی تھی، سنائی تو وہ اسے سن کر آگ بگولہ ہو گئی اور اُس نے غصہ میں آکے چولہے کے قریب پڑا ہوا چمٹا میرے سر پر دے مارا۔ یہ زخم کا نشان جو آپ میرے ماتھے پر دیکھ رہے ہیں، اُسی کا نشان ہے۔ ساوتری کی مٹ میلی نیلی ساڑھی پر بھی ایسے کئی زخموں کے نشان ہیں۔ مگر آپ انھیں نہیں دیکھ سکیں گے۔ میں دیکھ سکتا ہوں۔ ان میں سے ایک نشان تو اُس مونگیا رنگ کی جارجٹ کی ساڑھی کا ہے جو اُس نے اوپیرا ہاؤس کے نزدیک بھیجی مل بھوندو رام پارچہ فروش کی دکان پر دیکھی تھی۔ ایک نشان اُس کھلونے کا ہے جو پچیس روپے کا تھا اور جسے دیکھ کر میرا پہلا بچہ خوشی سے کلکاریاں مارنے لگا تھا، لیکن جسے ہم خرید نہ سکے اور جسے نہ پا کر میرا بچہ دن بھر روتا رہا۔ ایک نشان اُس تار کا ہے، جو ایک دن جبل پور سے آیا تھا جس میں ساوتری کی ماں کی شدید علالت کی خبر تھی۔ ساوتری جبل پور جانا چاہتی تھی لیکن ہزار کوشش کے بعد بھی مجھے کسی سے روپے اُدھار نہ مل سکے تھے اور ساوتری جبل پور نہ جا سکی۔ ایک نشان اُس تار کا تھا جس میں اُس کی ماں کی موت کا ذکر تھا۔ ایک نشان . . . . . مگر میں کس کس نشان کا ذکر کروں ان چھلکے چھلے، اگرے گدرے غلیظ داغوں سے ساوتری کی پانچ روپے چار آنے والی ساڑھی بھری پڑی ہے روز دھونے پر بھی یہ داغ نہیں چھوٹتے اور شاید جب تک یہ زندگی رہے گی یہ داغ یوں ہی رہیں گے، ایک ساڑھی سے دوسری ساڑھی میں منتقل ہوتے جائیں گے۔

چوتھی ساڑھی قرمزی رنگ کی ہے اور قرمزی رنگ میں بھورا رنگ بھی جھلک رہا ہے۔ یوں تو یہ سب مختلف رنگوں کی ساڑھیاں ہیں، لیکن بھورا رنگ ان سب میں جھلکتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ان سب کی زندگی ایک ہے، جیسے ان سب کی قیمت ایک ہے۔ جیسے یہ سب زمین سے کبھی اوپر نہیں اٹھیں۔ جیسے انھوں نے کبھی شبنم میں ہنستی ہوئی دھنک افق پر جھکی ہوئی شفق بادلوں میں لہراتی ہوئی برق نہیں دیکھی۔ جیسے جو شاید بائی کی جوانی ہے، وہ جیونا کا بڑھاپا ہے۔ وہ ساوتری کا ادھیڑ پن ہے جیسے یہ سب ساڑھیاں، زندگیاں، ایک رنگ۔ ایک سطح۔ ایک تواتر ایک مسلسل یکسانیت لیے ہوئے ہوا میں جھولتی جاتی ہیں۔

یہ قرمزی بھورے رنگ کی ساڑھی جھبو بھیّے کی عورت کی ہے۔ اس عورت سے میری بیوی کبھی بات نہیں کرتی، کیونکہ ایک تو اس کے کوئی بچہ وچہ نہیں ہے اور ایسی عورت جس کے کوئی بچہ نہیں ہو بڑی نحس ہوتی ہے۔ وہ جادو ٹونے کر کے دوسروں کے بچوں کو مار ڈالتی ہے اور بد روحوں کو بلا کے اپنے گھر میں بسا لیتی ہے۔ میری بیوی اسے کبھی منہ نہیں لگاتی۔ یہ عورت جھبو بھیا نے خرید کر حاصل کی ہے۔ جھبو بھیا مراد آباد کا رہنے والا ہے۔ لیکن بچپن ہی سے اپنا دیس چھوڑ کے ادھر چلا آیا۔ وہ مراٹھی اور گجراتی زبان میں بڑے مزے سے گفتگو کر سکتا ہے اسی وجہ سے اُسے بہت جلد یوار مل کے گنّی کھاتے میں جگہ مل گئی جھبو بھیا کو شروع ہی سے بیاہ کا بہت شوق تھا۔ اُسے بیڑی کا، تاڑی کا کسی چیز کا شوق نہیں تھا، شوق تھا تو صرف اس بات کا کہ اس کی شادی جلد سے جلد ہو جائے۔ جب اس کے پاس ستر اسی روپے اکٹھے ہو گئے تو اُس نے اپنے دیس جانے کی ٹھانی تاکہ وہاں اپنی برادری سے کسی کو بیاہ لائے۔ مگر پھر اس نے سوچا ان ستر اسی روپوں میں کیا ہوگا۔ آنے جانے کا کرایہ بھی بڑی مشکل سے پورا ہوگا۔ آنے جانے کا کرایہ بھی بڑی مشکل سے پورا ہوگا۔ چار سال کی محنت کے بعد اُس نے یہ رقم جوڑی تھی لیکن اس رقم سے وہ مراد آباد جا سکتا تھا، جا کے شادی نہیں کر سکتا تھا اس لیے جھبو بھیا نے یہیں ایک بدمعاش سے بات چیت کر کے اس عورت کو سو روپے میں خرید لیا۔ اسی روپے اُس نے نقد دیے۔ بیس روپے اُدھار میں رہے جو اُس نے ایک سال کے عرصہ میں ادا کر دیے۔ بعد میں جھبو کو معلوم ہوا کہ یہ عورت بھی مراد آباد کی رہنے والی تھی، دھیرج

گاؤں کی اور اُس کی برادری ہی کی تھی۔ جھبو بڑا خوش ہوا، چلو یہیں بیٹھے بیٹھے سب کام ہو گیا۔ اپنی جات برادری کی۔ اپنے ضلع کی، اپنے دھرم کی عورت یہیں بیٹھے بٹھائے سَو روپے میں مل گئی۔ اُس نے بڑے چاؤ سے اپنا بیاہ رچایا اور پھر اُسے معلوم ہوا کہ اُس کی بیوی ثریا بہت اچھا گاتی ہے۔ وہ خود بھی اپنی پاٹ دار آواز میں زور سے گانے بلکہ گانے سے زیادہ چلّانے کا شوقین تھا۔ اب تو کھولی میں دن رات ۔۔۔ گویا کسی نے ریڈیو کھول دیا ہو۔ دن میں کھولی میں ثریا کام کرتے ہوئے گاتی تھی۔ رات کو جھبو اور ثریا دونوں گاتے تھے۔ ان کے ہاں کوئی بچہ نہ تھا۔ اس لیے انھوں نے ایک طوطا پال رکھا تھا۔ میاں مٹھو خاوند اور بیوی کو گاتے دیکھ دیکھ کر خود بھی لہک لہک کر گانے لگے۔ ثریا میں ایک اور بات بھی تھی۔ جھبو نہ بیڑی پیتے نہ سگریٹ، نہ تاڑی نہ شراب۔ ثریا بیڑی، سگریٹ، تاڑی سب ہی کچھ پیتی تھی۔ کبھی تھی پہلے وہ یہ سب کچھ نہیں جانتی تھی مگر جب سے وہ بدمعاشوں کے پلّے پڑی تھی تب سے یہ سب بری باتیں سیکھنا پڑیں اور اب وہ اور سب باتیں تو چھوڑ سکتی ہے، مگر بیڑی اور تاڑی نہیں چھوڑ سکتی۔ کئی بار تاڑی پی کر ثریا نے جھبو پر حملہ کیا اور جھبو نے اُسے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔ اس موقع پر طوطا بہت شور مچاتا تھا اور رات کو دونوں کو گالیاں بکتے دیکھ کر خود بھی پنجرے میں ٹنگا ہوا زور زور سے چند کروہی گالیاں بکتا جو دونوں بکتے تھے۔ ایک بار تو اُس کی گالی سُن کے جھبو غصے میں آ کے طوطے کو پنجرے سمیت بدرو میں کھینکنے لگا تھا۔ مگر ثریا نے بیچ میں پڑ کر طوطے کو بچا لیا۔ طوطے کو مارنا بڑا پاپ ہے، ثریا نے کہا، تمھیں پھر برہمنوں کو بلا کے پرائشچت کرنا پڑے گا۔ اور تمھیں پندرہ بیس روپے کھل جائیں گے۔ یہ سوچ کر جھبو نے طوطے کو بدرو میں غرق کر دینے کا خیال ترک کر دیا۔

شروع شروع میں تو جھبو کو ایسی شادی ۔۔۔ پر چاروں طرف سے گالیاں پڑیں، وہ خود بھی ثریا کو بڑی شبہ کی نظروں سے دیکھتا رہا اور کئی بار اُسے بلا وجہ پیٹا اور خود بھی مل سے غیر حاضر رہ کر اُس کی نگرانی کرتا رہا، مگر آہستہ آہستہ ثریا نے اپنا اعتبار ساری چال میں قائم کر لیا۔ ثریا کہتی تھی کہ عورت سچے دل سے بدمعاشوں کے پلّے پڑنا پسند نہیں کرتی۔ وہ تو ایک گھر چاہتی ہے، چاہے وہ چھوٹا ہی سا گھر ہو۔ وہ ایک خاوند چاہتی ہے جو اُس کا اپنا ہو، چاہے وہ جھبو جیسا ایسا ہر وقت شور مچانے والا، زبان دراز، شیخی خورا ہی کیوں نہ ہو۔ وہ ایک ننھا بچہ چاہتی ہے، چاہے وہ کتنا ہی بدصورت کیوں نہ ہو۔ اور اب ثریا کے پاس گھر بھی تھا اور جھبو بھی تھا اور اگر بچہ نہیں تھا تو کیا ہوا۔ ہو جائے گا اور اگر نہیں ہوتا تو بھگوان کی مرضی۔ یہ میاں مٹھو ہی اُس کا بیٹا بنے گا۔

ایک روز ثریا اپنے میاں مٹھو کا پنجرا جھلا رہی تھی اور اُسے چوری کھلا رہی تھی اور اپنے دن کے سپنوں میں اُس ننھے سے بالک کو دیکھ رہی تھی جو فضا میں ہمکتا ہمکتا اُس کی آغوش کی طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا کہ چال میں شور سا بڑھنے لگا اور اُس نے دروازے سے جھانک کر دیکھا کہ چند مزدور جھبو کو اٹھائے چلے آ رہے ہیں اور اُن کے کپڑے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ ثریا کا دل دھک سے رہ گیا، وہ بھاگی بھاگی نیچے گئی اور اُس نے بڑی درشتی سے اپنے خاوند کو مزدوروں سے چھین کے اپنے کندھے پر اٹھا لیا۔ اور اپنی کھولی میں لے آئی۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ جھبو سے کئی کھاتے کے منیجر نے کچھ ڈانٹ ڈپٹ کی، اس پر جھبو نے بھی اسے دو ہاتھ جڑ دیے۔ اس پر بہت دادیلا مچا اور منیجر نے اپنے بدمعاشوں کو بلا کر جھبو کی خوب ٹھکائی کی اور اُسے مل سے باہر نکال دیا۔ خیریت ہوئی کہ جھبو بچ گیا ورنہ اُس کے مرنے میں کوئی کسر نہ تھی۔ ثریا نے بڑی ہمت سے کام لیا۔ اُس نے اُسی روز سے اپنے سر پر ٹوکری اٹھالی اور گلی گلی ترکاری بھاجی بیچنے لگی۔ جیسے وہ زندگی میں یہی دھندا کرتی آئی تھی۔ اس طرح محنت مزدوری کر کے اُس نے اپنے جھبو کو اچھا کر لیا۔ جھبو اب بھلا چنگا ہے۔ مگر اب اُسے کسی مل میں کام نہیں ملتا۔ وہ دن بھر اپنی کھولی میں کھڑا مہالکشمی کی اسٹیشن کے چاروں طرف بلند و بالا کارخانوں کی چمنیوں کو تکتا رہتا ہے۔ سیتون مل، نیو مل، اولڈ مل، پوار مل، دھنراج مل۔ لیکن اُس کے لیے کسی مل میں جگہ نہیں ہے۔ کیونکہ مزدور کو

گالی کھانے کا حق ہے، گالی دینے کا حق نہیں ہے۔ آج کل لڑیا بازاروں اور گلیوں میں آواز یں دے کر بھاجی ترکاری فروخت کرتی ہے اور گھر کا سارا کام کاج بھی کرتی ہے۔ اُس نے بیڑی، تاڑی سب چھوڑ دی ہے۔ ہاں اُس کی ساڑھی، قرمزی بھورے رنگ کی ساڑھی جگہ جگہ سے پھٹتی جا رہی ہے۔ تھوڑے دنوں تک اور اگر جھبو کو کام نہ ملا تو لڑیا کو اپنی ساڑھی میں پرانی ساڑھی کے ٹکڑے جوڑنا پڑیں گے اور اپنے میاں مٹھو کو چوری کھلانا بند کرنا پڑے گا۔

پانچویں ساڑھی کا کنارہ گہرا نیلا ہے، ساڑھی کا رنگ گدلا سرخ ہے۔ لیکن کنارہ گہرا نیلا ہے اور اس نیلے میں اب بھی کہیں کہیں چمک باقی ہے۔ یہ ساڑھی دوسری ساڑھیوں سے بڑھیا ہے۔ کیونکہ یہ ساڑھی پانچ روپے چار آنے کی نہیں ہے اس کا کپڑا، اس کی چمک دمک کہے دیتی ہے کہ یہ اُن سے ذرا مختلف ہے۔ آپ کو دور سے یہ مختلف معلوم نہیں ہوتی ہوگی۔ مگر میں جانتا ہوں کہ یہ اُن سے ذرا مختلف ہے۔ اس کا کپڑا بہتر ہے۔ اس کا کنارہ چمک دار ہے۔ اس کی قیمت پونے نو روپے ہے۔ یہ ساڑھی منجولا کی ہے، یہ ساڑی منجولا کے بیاہ کی ہے۔ منجولا کے بیاہ کو ابھی چھ ماہ بھی نہیں ہوئے ہیں۔ اُس کا خاوند گزشتہ ماہ چرخی کے گھومتے ہوئے پٹے کی لپیٹ میں آکے مارا گیا تھا اور اب سولہ برس کی خوبصورت منجولا بیوہ ہے۔ اُس کا دل جوان ہے۔ اُس کا جسم جوان ہے۔ اُس کی اُمنگیں جوان ہیں۔ لیکن اب وہ کچھ نہیں کر سکتی۔ کیونکہ اُس کا خاوند مل کے ایک حادثے میں مر گیا ہے۔ وہ پٹہ بڑا ڈھیلا تھا اور گھومتے ہوئے بار بار پھسل پھسل جاتا تھا اور کام کرنے والوں کے احتجاج کے باوجود اُسے مل مالکوں نے نہیں بدلا تھا۔ کیونکہ کام چل رہا تھا اور دوسری صورت میں تھوڑی دیر کے لیے کام بند کرنا پڑتا۔ پٹہ کو تبدیل کرنے کے لیے روپیہ بھی خرچ ہوتا تھا۔ مزدور تو کسی وقت بھی تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ اُس کے لیے روپیہ تھوڑی خرچ ہوتا ہے، لیکن پٹہ تو بڑی قیمتی شے ہے۔

جب منجولا کا خاوند مارا گیا، تو منجولا نے ہرجانے کی درخواست دی، جو نا منظور ہوئی۔ کیونکہ منجولا کا خاوند اپنی غفلت سے مرا تھا۔ اس لیے منجولا کو کوئی ہرجانہ نہ ملا اور وہ اپنی وہی نئی دلہن کی ساڑھی پہنے رہی جو اس کے خاوند نے پونے نو روپے میں اس کے لیے خریدی تھی۔ کیونکہ اس کے پاس کوئی دوسری ساڑھی نہ تھی جو وہ اپنے خاوند کی موت کے سوگ میں پہن سکتی۔ وہ اپنے خاوند کے مر جانے کے بعد بھی دلہن کا لباس پہننے پر مجبور تھی۔ کیونکہ اُس کے پاس کوئی دوسری ساڑھی نہ تھی اور جو ساڑھی تھی وہ یہی گدلے سرخ رنگ کی پونے نو روپے کی ساڑھی جس کا کنارہ گہرا نیلا ہے۔

شاید اب منجولا بھی پانچ روپے چار آنے کی ساڑی پہنے گی۔ اُس کا خاوند زندہ رہتا جب بھی وہ دوسری ساڑھی پانچ روپے چار آنے کی لاتی۔ اس لحاظ سے اُس کی زندگی میں کوئی خاص فرق نہیں آیا۔ مگر فرق اتنا ضرور ہوا ہے کہ وہ یہ ساڑھی آج پہننا چاہتی ہے۔ ایک سفید ساڑھی پانچ روپے چار آنے والی جسے پہن کر وہ دلہن نہیں بیوہ معلوم ہو سکے۔ یہ ساڑھی اُسے دن رات کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے۔ اس ساڑھی سے جیسے اُس کے مرحوم خاوند کی مضبوط باہیں لپٹی ہیں۔ جیسے اس کے ہر تار پر اُس کے شفاف بوسے مرتسم ہیں، جیسے اُس کے تانے بانے میں اُس کے خاوند کی گرم گرم سانسوں کی حدت آمیز غنودگی ہے۔ اس کے سیاہ بالوں والی چھاتی کا سارا پیار دفن ہے۔ جیسے اب یہ ساڑھی نہیں ہے۔ اک گہری قبر ہے جس کی ہولناک پہنائیوں کو وہ ہر وقت اپنے جسم کے گرد لپیٹ لینے پر مجبور ہے۔ منجولا زندہ قبر میں گاڑی جا رہی ہے۔

چھٹی ساڑھی کا رنگ لال ہے۔ لیکن اسے یہاں نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ اسے پہننے والی مر چکی ہے۔ پھر بھی یہ ساڑھی یہاں جنگلے پر بدستور موجود ہے۔ روز کی طرح دھلی دھلائی ہوا میں جھول رہی ہے۔ یہ مائی کی ساڑھی ہے جو ہماری چال کے دروازے

کے قریب اندر کھلے آنگن میں رہا کرتی تھی۔ مائی کا ایک بیٹا تھا سیتو، وہ اب جیل میں ہے۔ ہاں سیتو کی بیوی اور اُس کا لڑکا یہیں نیچے آنگن میں دروازے کے قریب دیوار کے نیچے پڑے رہتے ہیں۔ سیتو اور سیتو کی بیوی اور اُس کی لڑکی اور بڑھیا مائی یہ سب لوگ ہماری چال کے بھنگی ہیں۔ ان کے لیے کھولی بھی نہیں ہے اور ان کے لیے اتنا کھانا کپڑا بھی نہیں ملتا، جتنا ہم لوگوں کو ملتا ہے۔ اس لیے یہ لوگ آنگن میں رہتے ہیں، وہیں کھانا پکاتے ہیں، وہیں پڑ کے سو رہتے ہیں۔ یہیں یہ بڑھیا مائی ماری گئی تھی۔ وہ بڑا سوراخ جو آپ اس ساڑھی میں دیکھ رہے ہیں۔ پلّو کے قریب، یہ گولی کا سوراخ ہے۔ یہ کارتوس کی گولی مائی کو بھنگیوں کے ہڑتال کے دنوں میں لگی تھی۔ نہیں، وہ اس ہڑتال میں حصّہ نہیں لے رہی تھی، وہ بے چاری تو بہت بوڑھی تھی۔ چل پھر بھی نہ سکتی تھی۔ اس ہڑتال میں تو اس کا بیٹا سیتو اور دوسرے بھنگی شامل تھے، یہ لوگ مہنگائی الاؤنس مانگتے تھے اور کھولی کا کرایہ مانگتے تھے۔ یعنی اپنی زندگی کے لیے دو وقت کی روٹی، کپڑا اور سر پہ ایک چھت چاہتے تھے۔ اس لیے ان لوگوں نے ہڑتال کی تھی اور جب ہڑتال خلاف قانون قرار دے دی گئی تو ان لوگوں نے جلوس نکالا اور اس جلوس میں مائی کا بیٹا سیتو آگے آگے تھا اور خوب زور شور سے نعرے لگاتا تھا اور پھر جب جلوس بھی خلاف قانون قرار دیا گیا تو گولی چلی اور ہماری چال کے سامنے چلی۔ ہم لوگوں نے تو اپنے دروازے بند کر لیے، لیکن گھبراہٹ میں چال کا دروازہ بند کرنا کسی کو یاد نہ رہا اور پھر ہم کو اپنے بند کمروں میں ایسا معلوم ہوا گویا گولی ادھر سے اُدھر سے چاروں طرف سے چل رہی ہو، تھوڑی دیر کے بعد بالکل سنّاٹا ہو گیا۔۔۔ اور جب ہم لوگوں نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا اور باہر جھانک کے دیکھا تو جلوس تتر بتر ہو چکا تھا اور ہماری چال کے دروازے کے قریب بڑھیا مری پڑی تھی۔ یہ اُسی بڑھیا کی لال ساڑھی ہے، جس کا بیٹا سیتو اب جیل میں ہے۔ اس لال ساڑھی کو اب بڑھیا کی بہو پہنتی ہے۔ اس ساڑھی کو بڑھیا کے ساتھ جلا دینا چاہیے تھا، مگر کیا کیا جائے تن ڈھکنا زیادہ ضروری ہے۔ مُردوں کی عزت و احترام سے بھی کہیں زیادہ ضروری ہے کہ زندوں کا تن ڈھکا جائے۔ یہ ساڑھی جلنے جلانے کے لیے نہیں ہے۔ تن ڈھکنے کے لیے ہے۔ ہاں کبھی کبھی سیتو کی بیوی اس کے پلّو سے اپنے آنسو پونچھ لیتی ہے، کیونکہ اس میں پچھلے اسّی برسوں کے سارے آنسو اور ساری اُمنگیں اور ساری فتحیں اور شکستیں جذب ہیں، آنسو پونچھ کر سیتو کی بیوی پھر اُسی ہمّت سے کام کرنے لگتی ہے، جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ کہیں گولی نہیں چلی، کوئی جیل نہیں گیا۔۔۔ بھنگن کی جھاڑو اسی طرح چل رہی ہے۔

اِیلو، باتوں۔ باتوں میں وزیر اعظم صاحب کی گاڑی نکل گئی۔ وہ یہاں نہیں ٹھہری۔ میں سمجھتا تھا وہ یہاں ضرور ٹھہرے گی۔ وزیر اعظم صاحب درشن دینے کے لیے گاڑی سے نکل کے تھوڑی دیر کے لیے پلیٹ فارم پر ٹہلیں گے اور شاید ہوا میں جھولتی ہوئی ان چھ ساڑھیوں کو بھی دیکھ لیں گے جو مہالکشمی کے پل کے بائیں طرف ٹنگ رہی ہیں۔ یہ چھ ساڑھیاں جو بہت ہی معمولی عورتوں کی ساڑھیاں ہیں۔ ایسی معمولی معمولی عورتیں جن سے ہمارے دیس کے چھوٹے چھوٹے گھر بنتے ہیں، جہاں ایک کونے میں چولھا سلگتا ہے، ایک کونے میں پانی کا گھڑا رکھا ہے۔ ادھر طاقچے میں شیشہ ہے، کنگھی ہے، سیندور کی ڈبیا ہے، کھاٹ پر ننھا بچّہ سو رہا ہے، الگنی پر کپڑے سوکھ رہے ہیں۔ یہ اُن چھوٹے چھوٹے لاکھوں کروڑوں گھروں کو بنانے والی عورتوں کی ساڑھیاں ہیں جنھیں ہم ہندوستان کہتے ہیں۔ یہ عورتیں جو ہمارے پیارے پیارے بچّوں کی مائیں ہیں، ہمارے بھولے بھائیوں کی عزیز بہنیں ہیں۔ ہماری معصوم محبّتوں کا گیت ہیں۔ ہماری پانچ ہزار سالہ تہذیب کا سب سے اونچا نشان ہیں۔ وزیر اعظم صاحب! ہوا میں جھولتی ہوئی ساڑھیاں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہیں۔ تم سے کچھ مانگتی ہیں۔ یہ کوئی بہت بڑی قیمتی چیز تم سے نہیں مانگتی ہیں۔ یہ کوئی بڑا

ملک، کوئی بڑا عہدہ، کوئی بڑی موٹرکار، کوئی پرمٹ، کوئی ٹھیکہ، کوئی پراپرٹی، ایسی کسی چیز کی تم سے طالب نہیں ہیں۔ یہ تو زندگی کی بہت ہی چھوٹی چھوٹی چیزیں مانگتی ہیں۔ دیکھیے! یہ شانتا بائی کی ساڑھی ہے، جو اپنے بچپن کی کھوئی ہوئی دھنک تم سے مانگتی ہے۔ یہ جیونا بائی کی ساڑھی ہے جو اپنی آنکھ کی روشنی اور اپنی بیٹی کی عزت مانگتی ہے۔ یہ ساوتری کی ساڑھی ہے جس کے گیت مر چکے ہیں اور جس کے پاس اپنے بچوں کے لیے اسکول کی فیس نہیں ہے۔ یہ لڑوبائی ہے، جس کا خاوند بیکار ہے اور جس کے کمرے میں ایک طوطا ہے جو دو دن سے بھوکا ہے۔ یہ نئی دلہن کی ساڑھی ہے، جس کے خاوند کی زندگی چمڑے کے چپتے سے بھی کم قیمت ہے۔ یہ بڑی بھنگن کی لال ساڑھی ہے جو بندوق کی گولی کو ہل کی پھال میں تبدیل کر دینا چاہتی ہے تاکہ دھرتی سے انسان کا لہو پھول بن کر کھل اٹھے اور گندم کے سنہرے خوشے ہنس کے لہرانے لگیں......

لیکن وزیر اعظم صاحب کی گاڑی نہیں رکی اور وہ ان چھ ساڑھیوں کو نہیں دیکھ سکے اور تقریر کرنے کے لیے چوپاٹی چلے گئے۔ اس لیے اب میں آپ سے کہتا ہوں کہ اگر کبھی آپ کی گاڑی ادھر سے گزرے تو آپ ان چھ ساڑیوں کو ضرور دیکھیے جو مہالکشمی کے پل کے بائیں طرف لٹک رہی ہیں اور پھر آپ ان رنگا رنگ ریشمی ساڑیوں کو بھی دیکھیے جنھیں دھوبیوں نے اسی پل کے دائیں طرف سوکھنے کے لیے لٹکا رکھا ہے اور جو ان گھروں سے آئی ہیں جہاں اونچی اونچی چمنیوں والے کارخانوں کے مالک یا اونچی اونچی تنخواہیں پانے والے رہتے ہیں۔ آپ اس پل کے دائیں بائیں دونوں طرف ضرور دیکھیے اور پھر اپنے آپ سے پوچھیے کہ آپ کس طرف جانا چاہتے ہیں۔ دیکھیے! میں آپ سے اشتراکی بننے کے لیے نہیں کہہ رہا ہوں، میں آپ کو جماعتی جنگ کی تلقین بھی نہیں کر رہا ہوں، میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ مہالکشمی پل کے دائیں طرف ہیں یا بائیں طرف!

(ترقی پسند مصنفین کانفرنس بھوپال میں پڑھا گیا)

(ماخوذ از "افکار" بھوپال۔ خاص نمبر سنہ ۱۹۴۶ء)

پندرہ روزہ آہنگ

پاکستان کے سماجی، ثقافتی اور ادبی رجحانات سے باخبر رکھنے والا
پندرہ روزہ "آہنگ" کا مطالعہ کیجیے

آہنگ میں ریڈیو پروگراموں کی تفصیلات کے علاوہ نامور اہل قلم کے مضامین اور افسانے، ریڈیو، ٹیلی وژن اور فن کی دنیا کی معروف شخصیتوں کے انٹرویو اور رنگین تصاویر بھی شامل ہوتی ہیں۔ پاکستان میں۔ آہنگ کا سالانہ چندہ ۴۵/= روپے اور ششماہی ۲۳/= روپے ہے۔ آہنگ۔ بیرونی ملکوں کو بھی بھیجا جاتا ہے۔ چندے کی شرح اس پتے سے معلوم کیجیے:۔ ایڈیٹر۔ پی۔ بی۔ سی۔ پبلی کیشنز۔ پاکستان براڈ کاسٹنگ کارپوریشن
فلور نمبر ۴۔ قاسم منزل۔ رینڈل روڈ۔ کراچی

کرشن چندر

جنتا سے اجنتا تک

ہوائی جہاز میں سفر کرتے ہوئے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا بالکل ایسا ہی معلوم ہوتا ہے جیسے آدمی ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں داخل ہو رہا ہو، یا اگر حادثہ ہو جائے جب بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک عالم سے دوسرے عالم میں گذر رہے ہیں۔ لیکن ریل گاڑی میں کمرے اور عالم یوں یکایک نہیں بدلتے، بلکہ ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ اس لیے مجھے ریل گاڑی میں سفر کرنا بہت اچھا معلوم ہوتا ہے اور وہ بھی کالے انجن والی گاڑی میں، جو کوئلے اور پانی سے چلتی ہے۔ بمبئی کی الیکٹرک ٹرین تو بالکل ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے سرکتا ہوا ہے۔ مجھے ذرا اچھی نہیں لگتی۔ یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ اس کا سر کدھر ہے دھڑ کدھر ہے۔ کبھی سر سے چلنے لگتی ہے کبھی دھڑ سے۔ بمبئی میں آپ نووارد ہوں، اور یہ گاڑی آپ کو اسٹیشن پر کھڑی دکھائی دے تو آپ خود یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ یہ گاڑی شمال کو جائے گی یا جنوب کو؟ اکثر اسی دھوکے میں، بہت سے لوگ چرچ گیٹ جاتے جاتے بوری بندر پہنچ جاتے ہیں۔ ایسی چار سو بیس گاڑی ہے پنڈت یو کریٹک سوشلزم کی طرح دائیں بائیں اس کی سمت کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ لیکن آپ کالے انجن والی گاڑی کے متعلق یہ الفاظ کبھی استعمال نہیں کر سکتے۔ جب کوئلے اور پانی سے بھرپور انجن شعلے اڑاتا ہوا، بھاپ پیدا کرتا ہوا اپنی چمنی سے دھواں نکالتا ہوا پچیس ڈبوں کی ایک لمبی قطار کو کھینچتا ہوا مغرور انداز میں اسٹیشن یارڈ کے اندر دوڑتا ہوا آتا ہے، تو معلوم ہوتا ہے کہ کسی فاتح جرنیل کی سواری آ رہی ہے۔ مسافر حرکت میں آ جاتے ہیں۔ خوانچے والے صدائیں دینے لگتے ہیں اور جاہل سے جاہل مسافر بھی سمجھ جاتا ہے کہ گاڑی اُدھر جائے گی جدھر انجن لگا ہوا ہے۔ سمت معلوم ہو تو سفر میں دھوکے کھانے کا کم احتمال ہے۔

اسی لیے جب میں مدراس جنتا ایکسپریس میں بیٹھا تو گاڑی کے آگے کالے انجن کے دیو کو دیکھ کر ڈھارس ہوئی کہ یہ گاڑی مدراس ہی جائے گی۔ کہیں سمندر میں لے کے نہیں "ڈوب جائے گی۔ اس کے علاوہ جنتا ایکسپریس میں ایک اور بھی خوبی ہے۔ یعنی اس میں سارے ڈبے تھرڈ کے ہیں۔ جنتا ایکسپریس جو ٹھیری۔ دراصل ۱۵ اگست کی آزادی کے بعد ہمارے حاکموں نے بہت سے معاملے صاف کر دیے ہیں جنھیں انگریزوں نے بُری طرح الجھا رکھا تھا۔ یعنی صاحب پہلے درجہ اول، پھر دوم، پھر انٹر، پھر درجہ سوم۔ جنتا ایکسپریس نے وہ معاملہ ختم کر دیا ہے۔ اب دو درجے، بلکہ دو ہی قسم کی گاڑیاں باقی رہ گئی ہیں۔ ایک تو جنتا کی گاڑی جس پر جنتا سفر کرتی ہے۔ دوسری اُجنتا گاڑی ہے جس میں اجنتا کی تصویروں سے مشابہت رکھنے والی خواتین اور اُن کے شوہر سفر کرتے ہیں۔ جنتا اور اجنتا میں جو امتیاز آج سے ہزاروں برس پہلے تھا وہ آج بھی اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر محسوس

ہوتا ہے۔

میرے ساتھ کرشن تھا — دُبلا پتلا اور بے حد بوکھلایا ہوا۔ اُس کی نگاہوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ آدمی ٹکٹ گھر بھول آیا ہے۔ غلط گاڑی میں سوار ہے۔ کسی اجنبی کے ساتھ سفر کر رہا ہے۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میرا نام کرشن چندر ہے۔ ٹکٹ میرے بٹوے میں ہے۔ سامان ریک کے اوپر ہے اور گاڑی بدراس جاری ہے۔ تو اُس نے اطمینان کا سانس لیا اور کھڑکی سے سر نکال کر کنگھا خریدنے لگا —

کرشن میری طرف دیکھ کے مسکرا کے کہنے لگا —

"میں پریشان تھا کہ کیا چیز بھول آیا ہوں؟ اب یاد آیا کنگھا —

"تم لائے —"؟

میں نے کہا —

"لایا تو نہیں، لیکن بھولا بھی نہیں!" —

"ارے، یہ کیسے ممکن ہے؟ لائے بھی نہیں، بھولے بھی نہیں!" —

"ہاں! — میں نے کہا — "لایا اس لیے نہیں کہ بھولا نہیں، اور بھولا اس لیے نہیں کہ کنگھے کی حاجت نہیں۔ ذرا کچھ اوپر سے یعنی اُس ریک پر بیٹھ کر میرے سر کی طرف دیکھو تو کیا یہ معلوم نہ ہو گا جیسے یہاں کسی آدمی کا سر نہیں طبلے کا بایاں رکھا ہے —

کرشن پہلے تو خوب ہنسا — پھر تھوڑا سا ہنسا — اور آخر میں بالکل سنجیدہ ہو کر مجھ سے کہنے لگا —

"مذاق چھوڑو — یہ بتاؤ کہ وائیکم پہنچ کر ہمیں کیا کرنا ہو گا؟" —

اتنا کہہ کر اُس نے نوٹ بُک نکالی اور قلم ہاتھ میں لے لیا۔ اور میری طرف اس طرح دیکھنے لگا جیسے مجھ سے کہہ رہا ہو —

"بتا دُ —"

میں نے کہا —

"میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ رقم کیا ہے؟" —

"کیا ہے؟" —

میں نے کھڑکی سے باہر سر نکال کر کہا —

"گاڑی تو چلنے دو!" —

گاڑی چل رہی تھی — زمین چل رہی تھی — آسمان چل رہا تھا — ہم سفر چل رہے تھے — میں خود چل رہا تھا اتنے عظیم الشان ساتھیوں کے ساتھ چلنا بہت اچھا معلوم ہوتا ہے۔ میں نے کہانیاں اس لیے لکھنی شروع کی تھیں کہ شاید کبھی زمین اور آسمان کو اپنے تخیل کے ساتھ چلا سکوں۔ لیکن الفاظ کے ساتھ الفاظ کو رکھتے ہوئے کبھی اضطراری حرکت کا اندازہ نہیں ہوتا جو زمین کے سینے میں اور آسمان کی بلندی میں محفوظ ہے۔ کیوں میرا قلم زمین کا محور نہیں بن جاتا اور ایک بھالے کی طرح اونچے آسمان کا سینہ گھائل نہیں کر سکتا؟ پھر سوچتا ہوں، میں بھی کتنا احمق ہوں۔ لفظ کے ساتھ جوڑنا تو ایسا ہے جیسے اینٹ کے

کے ساتھ اینٹ جوڑنا ___ دیوارِ چین اکیلے کس نے بنائی ہے؟ ___

اسی طرح یہ گاڑی بھی اکیلے کس نے بنائی ہے؟ جانے کتنے ہزاروں ہاتھ لگے۔ دماغ چلے گھنٹے صرف ہوئے۔ اس کے لیے کان کھودنے والوں نے لوہا نکالا ___ کوئلہ اور سیمنٹ تیار کیا۔ جنگل سے درخت کاٹے گئے۔ زمین کے سینے سے پانی ماں کے دودھ کی طرح اُبھرا۔ پھر کہیں آگ پیدا ہوئی۔ کتنے سالوں کی محنت مشقت، پسینے اور لہو کی آمیزش سے یہ گاڑی مجھ تک پہنچی۔ میں نے اپنے چھوٹے سے قلم کی محنت سے یہ گاڑی ذرا آگے ڈھکیلی۔ سچ سچ دیوارِ چین اکیلے کس نے بنائی ہے؟

ہاں، اتنی محنت کے بعد جب ریل کی کھڑکی سے زمین اور آسمان حرکت میں آتے ہیں تو بہت اچھا معلوم ہوتا ہے۔ کبھی تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ایک ہی تصویر سامنے سے گذرتی جا رہی ہے اور کبھی ایک نہیں تین تین تصویریں ایک دوسرے کے آگے پیچھے گھومتی ہوئی، ایک عجیب دل نواز تواتر اور ہم آہنگی سے سامنے سے گذرتی جاتی ہیں۔ کبھی کبھی آنکھ کے افق پر حرکت کی تین سطحیں نمودار ہوتی ہیں۔ لے کے تین زیر و بم آہنگ کے تین تاثرات ایک ہی لمحے میں اُجاگر ہوتے ہیں۔ جیسے جب گاڑی چلتی ہے تو سب سے پہلے تار کے کھمبے حرکت میں آتے ہیں۔ پھر اُن کے ساتھ ساتھ درخت اور جھاڑ وجد میں آتے ہیں۔ ان کے پیچھے کھیت، اور کھیتوں کے اندر فصل، اور فصل کے اندر کھڑے ہوئے کسان گھومتے ہیں۔ کبھی تار کے کھمبوں کے پیچھے کھیت غائب ہو جاتے ہیں، اور ایک اونچی گھاٹی ساتھ ساتھ چلنے لگتی ہے۔ اونچی گھاٹی ساتھ ساتھ دوڑتے ہوئے تھک جاتی ہے تو اچانک آگے ایک ندی اپنے شفاف پانی کے ساتھ گنگناتی ہوئی اُبھر آتی ہے اور دوسرے ہی لمحے ایک اونچے ٹیلے کے پیچھے گم ہو جاتی ہے۔ جیسے کوئی نئی نویلی دلہن ایک جھلک دکھا کر گھونگھٹ کاڑھ لے۔ اب سامنے ایکھ کے کھیت میں کسان صرف اپنے گھٹنوں تک نظر آتا ہے۔ جہاں ایکھ کے کھیت ختم ہوتے ہیں، وہاں نظر بہت نیچے گر جاتی ہے۔ گاڑی اب ایک پُل پر سے گذر رہی ہے۔ پُل کا ایک حصّہ نظر آ رہا ہے۔ اور پُل کے نیچے ندی کا پاٹ بھی، جو اب بالکل سوکھ گیا ہے اور جس کی بھوری ریت میں دُور تک بیل گاڑی کے نشان بنے ہوئے ہیں۔ آنکھ کے افق پر یہ نشان بہت دور تک جاتے ہیں۔ کس کی بیل گاڑی تھی وہ؟ کون لایا تھا اسے یہاں؟ کدھر گئی وہ بیل گاڑی؟ بیل گاڑی آنکھ کے اُفق سے زمین کے افق پر منتقل ہو جاتی ہے اور نئی تصویر اُبھرتی آتی ہے ___

ایک اونچے سے ٹیلے پر ایک چھوٹا سا لڑکا بیٹھا ہے، اور اُس کی بڑی بہن ہے۔ بڑی بہن کے ہاتھ میں درانتی ہے۔ چھوٹا لڑکا گاڑی کی طرف دیکھ کے ہنستا ہے اور زبان نکال کر منہ چڑاتا ہے۔ بڑی لڑکی شرما جاتی ہے۔ گاڑی میں اسے کسی نے محبت بھری نظروں سے دیکھا۔ محبت جو ایک لمحے کے لیے ٹھٹکی، اور اس ٹیلے پر چھلک کر جاوداں ہو گئی۔ کتنے لوگوں نے انسان کی اُس ایک لمحے کی لازوال محبت کی کہانی لکھی ہے۔ دیوارِ چین اکیلے کس نے بنائی ہے؟

کرشن نے کہا "سو گئے ہو کیا؟"

میں نے کھڑکی کے اندر سر کر لیا اور کہا ___ "ڈاکٹر نے منع تو نہیں کیا، پی سکتا ہوں۔"

میں نے سگریٹ منہ میں رکھا اور ابھی ماچس جلائی نہ تھی کہ میری نظر سامنے ایک عورت پر پڑی جو تیسرے بنچ پر بیٹھی اپنی ننھی کا فراک بدلنے میں مصروف تھی۔ جب ہماری نظریں ملیں تو وہ دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی، مجھے ایک لمحے کے لیے دھوکا ہوا۔ پھر خیال آیا۔ نہیں یہ ممکن نہیں۔ میں نے آئینے میں اچھی طرح اپنی صورت دیکھی ہے۔ اس لیے یہ ممکن نہیں۔ لیکن وہ عورت

مجھے ابھی تک ۔ دیکھ رہی تھی ۔ عجیب نگاہوں سے ۔ اور لڑکی کا فراک اُس کی بانہہ میں پھنسا ہوا تھا ۔ آخر میں نے نگاہ پھیری اور لڑکی کے چلّانے پر فراک بانہہ سے نکل کر جسم پر آ گیا ۔ عورت نے پھر عجیب نگاہوں سے میری طرف دیکھا ۔ ان نگاہوں میں کوال نہ تھا ۔ نفرت بھی نہ تھی ۔ ایک عجیب طرح کی سمجھ تھی ۔ جیسے وہ مجھے اچھی طرح جانتی ہو ۔ میرے اس قدر قریب ہو ۔ ایک ایسی ازدواج اور قربت کی سمجھ اور اس سمجھ کا احساس مجھ تک پہنچا دینے کے جذبے کی صورت ہی اس نگاہ میں تھی ۔ میں کچھ سمجھ نہ سکا ۔ سفر کی کئی منزلیں گذر گئیں ۔ آفتاب غروب ہو گیا ۔ کھڑکی جو آئینہ جہاں تھی ایک تاریک روزن کی طرح نظر آئی جہاں حدِ نگاہ پر آسمان کی ملگجی نیلاہٹ باقی رہ گئی تھی ۔

اسی طرح کئی بار میری اور اس کی نگاہیں ملیں ۔ اور جب تاریک ڈبے کے اندر روشنیاں جلیں تو اُس کی نگاہوں کی اُداسی اور ایک عجیب سی محبت نے مجھے پریشان کر دیا ۔ میں دیکھنے لگا مجھ میں کیا ہے جو اُس کے خاوند میں نہیں ۔ وہ تو بہت اچھا تگڑے جسم کا ڈیل ڈول والا گبھرو جوان ہے ۔ فرق یہی ہے کہ اُس نے دھوتی پہن رکھی ہے اور میں نے پتلون ۔ فرق یہی ہے کہ میں نے شیو نہیں بنایا اور اس نے شیو بنا رکھا ہے ۔ اس کے ساتھ اس کے دو تین رشتے دار بیٹھے ہیں ، جو سب آپس میں بے تکلف ہیں ، اور ایک دوسرے سے ہنستے ہوئے باتیں کر رہے ہیں ۔ نیا فراک پہنے ہوئے ننھی بچی میری طرف دیکھ کے مسکراتی ہے ۔ پھر وہ میرے قریب آ جاتی ہے ۔ میں اُسے ایک سنترہ دیتا ہوں ۔ باپ میری طرف دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکراتا ہے ۔ لیکن وہ عورت اب میری طرف نہیں دیکھ رہی ہے ۔ لیکن میں نے دیکھ لیا ہے اُس کی آنکھوں میں آنسو ہیں ۔

یہ آنسو کس لیے ہیں ؟ میرے لیے تو نہیں ۔ اتنی جلدی کون اپنے دل کے موتی میرے لیے رول سکتا ہے ۔ پھر یہ اُداسی کیوں ؟ اجنبی عورت ! بتا دے ، تیرے دل کا غم کیا ہے ؟ کیا تیرا خاوند تجھ سے پیار نہیں کرتا ؟ کیا تیری ساس ظالم ہے ؟ کیا تو اپنے میکے میں کسی سے محبت کرتی تھی ؟ اور آج وہ وادیاں تجھ سے دور کھو گئی ہیں ؟ —— لیکن یہ آنسو کچھ نہیں بتاتے ، وہ ہی تو آنسو تھے جو گرے اور پھر پلّو کے ایک جھٹکے سے پونچھ ڈالے گئے ۔ میں نے سوال کو سمجھا ہی نہیں اجنبی عورت ! جواب کیا دوں ؟

اب رات زیادہ جا چکی ہے ۔ کیونکہ روشنیاں تیز معلوم ہوتی ہیں ۔ جب اندھیرا بڑھ جاتا ہے تو معمولی روشنی بھی بھڑکتا ہوا شعلہ بن جاتی ہے ۔ یہی حالت میری تھی ۔ اس کے احساس کی معمولی سی چنگاری بھی مجھے محبت کا شعلہ معلوم ہوتی تھی ۔ نہیں ہوتی تھی ، مگر پھر بھی معلوم ہوتی تھی ۔

وہ کھانا پروسنے لگی ۔ اُس کے خاوند نے اور اُس کے دوسرے ساتھیوں نے فرش پر بہت سے ٹرنک ایک دوسرے کے ساتھ جما کر ان پر اخبار بچھا دیے ۔ اور وہ عورت ایک اونچے ٹفن کیریر میں سے کھانا نکال نکال کر پروسنے لگی ۔ سب سے پہلے اُس نے اپنے خاوند کے دوستوں کو کھانا دیا ، پھر اپنے خاوند کو —— اپنے خاوند کو کھانا دیتے ہوئے یکا یک اُس کی انگلیاں اپنے خاوند کی انگلیوں سے جا لگیں ، اور یکا یک میں نے محسوس کیا ۔ نہیں یہ بات نہیں ہے کہ اس عورت کو اپنے خاوند سے محبت نہیں ۔ میں ان انگلیوں کے لمس کو اچھی طرح جانتا ہوں ۔ جب انگلیاں انگلیوں سے چھو جاتی ہیں ، ایک لمحے کے لیے رُک جاتی ہیں ۔ رُک کر ایک دوسرے سے کھیلنے لگتی ہیں ۔ اور اس سے پہلے کہ لوگوں کی توجہ اس طرف جائے جلدی سے گھبرا کر ایک دوسرے سے الگ ہو جاتی ہیں ۔ یہ وفادار اور عظیم محبت کی انگلیاں ہیں ۔ میں انھیں پہچانتا ہوں ۔ ان کی عزت و احترام کرتا ہوں ۔ میں بھی ان انگلیوں سے کھیلا ہوں ۔ بچپن میں اور لڑکپن میں اور جوانی میں ۔ یہ انگلیاں ممتا اور مروہ کے بارے کانپتی ہوئی انگلیاں ،

جو بچوں کو پالنے میں سُلاتی ہیں، جو شوہروں کے سینے پر محبت کی شرمائی ہوئی آرزوؤں کی طرح دھیرے دھیرے سرکتی ہیں۔ انگلیاں جو چاول چُنتی ہیں، خط لکھتی ہیں اور آتش دان پر اپنے شوہر کی تصویر رکھتی ہیں۔ انگلیاں جو چولھا سُلگاتی ہیں۔ گھر بناتی ہیں، گھر میں رہتی ہیں۔ اس وقت بھی جب گھر میں کوئی اور نہیں رہتا۔ اس وقت بھی جب مرد میدانِ جنگ کو چلے جاتے ہیں اور یہ انگلیاں دعا کے لیے آسمان کی سمت اُٹھ جاتی ہیں۔

یہ اُنگلیاں اپنے خاوند سے رخصت ہو کر جُھک گئیں۔ جس طرح محبت کی شاخ ثمر بار ہو کر جُھک جاتی ہے۔ اب کھانا ننھی سی لڑکی اور اس عورت کے لیے بچا تھا۔ کھانا کھانے سے پہلے اُس نے پھر میری طرف دیکھا، اور اُس کے ہاتھ میں ایک اضطراری جنبش ہوئی جیسے میری طرف لپکنا چاہتی تھی جیسے کہنا چاہتی تھی ——

"تم بھی کھا لو یہ کھانا۔ آؤ شریک ہو جاؤ"——

اور پھر ایک بے تابی اور بے چینی سے وہ جنبش وہیں ختم کر دی گئی۔ اور اُس نے سر جُھکا کے اپنی ننھی لڑکی کے ساتھ کھانا شروع کر دیا——

کرشن نے کہا۔ "کھانا کھاؤ گے ؟"——

میں نے کہا —— "ڈاکٹر نے منع تو نہیں کیا۔ لیکن پھر بھی نہیں کھاؤں گا"——

"کیوں ؟"——

"بس صرف پھل کھاؤں گا"——

میں نے تھیلے میں سے دو تین سیب اور چند نارنگیاں نکالیں۔ سیب کاٹنے کے لیے چاقو ڈھونڈنے لگا۔ چاقو کرشن کے پاس نہیں تھا۔ سامنے کی بنچ پر کسی مسافر کے پاس نہیں تھا۔ ناچار تیسری بنچ والوں سے کہنا پڑا۔ وہ لوگ کھانا کھا رہے تھے——

اُس کے شوہر نے اُس سے پوچھا ——

"چاقو تمھارے پاس تو ہوگا ؟"——

اُس عورت نے جلدی سے اپنا کھانا چھوڑا اپنا چابیوں کا گُچھا نکالا۔ چابیوں کے گُچھے کے ساتھ ایک چاقو بھی بندھا تھا۔ وہ میرے بالکل قریب آ گئی، اور اُس کی انگلیوں نے بہت گہرے لمس کے ساتھ میری ہتھیلی پر وہ چابیوں کے گُچھے والا چاقو رکھ دیا۔ میں نے اُس کا تیز اُڑتا ہوا سانس اپنے رخسار پر محسوس کیا۔ اُس کی اُنگلیوں کے گہرے لمس کو جو مجھ سے اِتنا قریب تھا جیسے وہ مجھ سے بغل گیر ہو رہی تھی——

یہ سب کچھ ایک لمحے میں ہوا۔ دوسرے لمحے میں وہ پھر اپنی سیٹ پر بیٹھ کر کھانا کھانے لگی اور اس کے خاوند نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور میں نے چاقو کے پھل کو سیب کے سینے میں اُتار دیا۔ کاش چاقو خواہشوں کو اتنی آسانی سے کاٹ سکتا۔ یہ دل کے اندر کون گہرے گہرے پھندے بُن رہا ہے ؟——

کھانا کھانے کے بعد وہ لوگ جلدی جلدی سامان باندھنے لگے، شاید ان کا اسٹیشن قریب آ رہا تھا۔ عورت نے لڑکی کا فراک پھر بدل دیا، اُس کے بالوں میں کنگھی کی اور اُس کی آنکھوں میں کاجل لگایا۔ خاوند نے ایک ٹرنک کے اوپر دوسرا ٹرنک رکھ کے سارے ٹرنک سمیٹ لیے دوستوں نے بستر باندھے —— پھر گاڑی دھیمی ہو گئی اور وہ لوگ چلنے لگے۔ دوست آگے چلے۔ پھر

ایک دوست نے نخھی کو اٹھا لیا۔ آخر میں وہ اور اس کا خاوند رہ گیا۔

وہ اپنے خاوند کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ پھر اُس نے اپنے خاوند سے کچھ آہستہ سے کہا، اور پھر وہ کچھ کہہ کر آہستہ سے میری طرف مڑی، اور رُک کر حسرت بھری نگاہ سے میری طرف دیکھ کے اُس نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

اُس کا خاوند بھی میری طرف مُڑا — میں حیرت اور سکتے میں تھا — لیکن اُس کے خاوند نے جلد ہی میری حیرت دور کر دی — اُس نے مسکرا کے کہا:—

"صاحب آپ تو حیران ہوں گے کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ لیکن بات بھی اچنبھے کی ہے — یہ میری بیوی ہے۔ اس کا بھائی ابھی دو ماہ ہوئے فوت ہوا ہے۔ اس سے آپ کی شکل اتنی ملتی ہے کہ میں کیا کہوں۔ یہ جو مڑ مڑ کر آپ کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے جذبات کا اب آپ اندازہ کر سکتے ہیں۔"

عورت کی آنکھوں سے پھر آنسو ٹپک پڑے۔ خاوند نے اسے دھیرے سے میری جانب سے موڑ لیا، اور ہاتھ جوڑ کے کہنے لگا —

"آپ بُرا مت مانیے گا۔"

وہ دونوں چلے گئے —

جاتے ہوئے عورت کی اُنگلیاں کانپ رہی تھیں، وہ انگلیاں جو میرے سر پر پیار اور شفقت کا بوسہ دینا چاہتی تھیں اپنی تمام غریبی اور بے بسی اور انتہائی غم کے باوجود انسان کی دنیا کتنی انوکھی اور پیاری ہے۔ یہ انسان کی ہری بھری دنیا کتنی چھوٹی چھوٹی محبتوں سے تعمیر ہوئی ہے —

بہن کی محبت — خاوند کی محبت — بچے کی محبت — اجنبی کی محبت — کتنی ان گنت چھوٹی چھوٹی محبتوں کو ساتھ جوڑ جوڑ کے انسان نے اپنی محبت کی معراج بنائی ہے —

دیوارِ چین اکیلے کس نے بنائی ہے؟ —

کرشن نے کہا —

"ساتھی! تمہیں وائکم امن کانفرنس کے لیے اپنی تقریر تیار کرنا ہے، اب کر ڈالو۔"

میں نے ایک عجیب محویت کے عالم میں کہا —

"یہ انسانوں سے پیار کرنے والی انگلیاں ان انگلیوں سے کتنی مختلف ہیں، جو انسانوں پر ایٹم بم گراتی ہیں!" —

(ماخوذ۔ از "ایک خوشبو اڑی سی")

سیاہی کا دھبہ دھونے کا طریقہ

دوات انڈیل کر سیاہی باہر پھینک دیجیے۔ اس کے بعد دوات کو صابن اور گرم پانی سے اچھی طرح دھو ڈالیے۔ پھر کبھی دھبہ نہ پڑے گا بشرطیکہ اس دوات میں سیاہی نہ استعمال کی جائے —

——— کرشن چندر

کرشن چندر

لیڈر کی کرسی

اسمٰعیل بھائی لونڈے والا کا نیلام گھر محمد علی روڈ اور بھنڈی بازار کے قریب پوسٹ آفس کے سامنے واقع تھا۔ کل اتوار ہونے کی وجہ سے نیلام گھر میں ہر طرح اور ہر عمر کا فرنیچر جمع تھا۔ اسمٰعیل بھائی لونڈے والا آدھی رات کے قریب نیلام گھر کو تالا لگاکر گھر چلا گیا۔ لیکن جلدی میں اندر کی بتی بجھانا بھول گیا۔ سو کینڈل پاور کے بلب کی تیز روشنی میں بھلا فرنیچر کو کیسے نیند آتی۔ چنانچہ گھڑیال کے مشورے پر رات بتانے کے لیے سب نے اپنی اپنی آپ بیتیاں سنانا منظور کرلیا۔ کتابوں کا ریک جب اپنی کہانی سنا چکا تو کرسی نے کہا۔ اب میری کہانی سنیے ....

لیڈر کی کرسی بہت پرانی تھی۔ اس کی تین ٹانگیں تو ٹھیک تھیں، لیکن چوتھی ٹانگ بڑی بھدی اور بدشکل تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اصلی ٹانگ ٹوٹنے کے بعد کسی اناڑی بڑھئی نے جلدی سے لگادی ہے۔ پشت پر چمڑا لگا تھا جو متواتر استعمال سے گھس گیا تھا اور اس کی سطح پر متواتر رگڑ سے لیڈر کی پیٹھ کا نشان پڑ گیا تھا۔ یہ نشان اتنا بڑا تھا کہ اس پر ہماری قومی آزادی کی جدوجہد کی پوری تاریخ لکھی جاسکتی تھی۔ کرسی کی سیٹ پر نیلی مخمل کی روئی دار گدی جگہ جگہ سے پھٹ چلی تھی، اور اس میں سے پھوہڑے نکل کر باہر جھانک رہے تھے۔ کرسی کا پالش بہت پرانا تھا، اور کئی رنگ کا تھا۔ کہیں سے سیاہ، کہیں سے بھورا، اور جو چوتھی ٹانگ تھی وہ ہلکے بادامی رنگ کی تھی۔ اس کرسی کو دیکھ کر بہت سے فرنیچر جو ایک ہی ساخت، ایک ہی رنگ اور ایک ہی لکڑی کے تھے، زور زور سے ہنس پڑے۔

کرسی نے خفا ہوکے کہا "میری بری شکل پر مت ہنسو۔ کبھی میں بھی تمہاری طرح جوان تھی اور خوبصورت تھی۔ استبداد زمانہ نے میرا یہ حال کردیا ہے۔ مگر زمانے نے کب کسی کا سدا ساتھ دیا ہے۔ ہر فرنیچر جو پیدا ہوتا ہے۔ ایک روز بوڑھا ہوتا ہے اور سڑ جاتا ہے۔ یہی اس زمانے کا دستور ہے۔"

"سچ ہے —— سچ ہے۔" ایک بوڑھا پلنگ کھانس کر بولا۔

"خیر اب تم میرا قصہ سنو۔" کرسی ایک آہ بھر کر بولی۔ "میں بھی زندگی کے بہت سے تجربے اپنے ساتھ لائی ہوں۔

میں شہر ہیم پور کی کرسی ہوں۔ ہمارے شہر کی آبادی سات لاکھ سے اوپر ہے۔ آدھی آبادی مراٹھوں کی ہے آدھی یوپی والوں کی۔ یہ مدھیہ اتر پردیش کی راج دھانی ہے۔ لیکن یہاں پر ایک بھی کارخانہ نہیں ——— ہاں پاگل خانے گیارہ ہیں۔

"ایسا کیوں ہے؟" ایک لیمپ شیڈ نے پوچھا ——— جب بھی سرکار یہاں کوئی کارخانہ لگانے کا سوچتی ہے۔ مراٹھے کہتے ہیں کارخانہ ہماری آبادی والے حصے میں کھلنا چاہیے۔ یوپی والے کہتے ہیں۔ نہیں اُسے ہماری آبادی والے حصے میں کھلنا چاہیے۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے سرکار نے ہیم پور میں شکر کی فیکٹری کھولنے کی منظوری دے دی۔ یہ منظوری بڑی مشکلوں سے حاصل کی گئی تھی۔ اور مرکزی سرکار سے بہت لڑ جھگڑ کے حاصل کی گئی تھی۔ لیکن جب اسے عملی جامہ پہنانے کا وقت آیا تو شہر میں جھگڑا شروع ہو گیا۔ یوپی والے کہتے تھے۔ چونکہ گنا یوپی کے دیہاتوں سے آتا ہے۔ اس لیے فیکٹری ان کے علاقے میں کھلنی چاہیے۔ مراٹھے کہتے تھے چونکہ کارخانے میں کام کرنے والے مزدور مراٹھے ہوں گے اس لیے یہ فیکٹری ان کے شہری علاقے میں کھلنی چاہیے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ شہر میں دو پارٹیاں ہو گئیں۔ دونوں پارٹیاں الگ الگ، جلسے کرنے لگیں۔ جلوس نکالنے لگیں۔ شہر میں زبردست ہڑتال ہوئی۔ سب دوکانیں بند، اسکول، کالج، دفتر سب بند ہو گئے۔ بجلی گھر کے ملازمین نے بھی ہڑتال کر دی، اور جب شہر میں بجلی نہ رہی تو جلسوں میں بجلی کہاں سے آتی؟ اور مائیکروفون، لاؤڈ اسپیکر کہاں سے کام کرتے؟ چنانچہ اچھے اچھے تقریر کرنے والوں کے دم اکھڑنے لگے۔ مگر چونکہ شہر میں ہڑتال تھی اور لوگوں کے پاس کوئی کام نہ تھا۔ اس لیے اُن کی دلچسپی کو برقرار رکھنے کے لیے جلسوں کا ہونا بہت ضروری تھا۔ اس لیے ایسے لوگوں کی ڈھونڈیا پڑی جو مائیکروفون کے بغیر ہی تقریر کر سکیں۔ ایسی ایک ضرورت نے زمانۂ حال کا وہ لیڈر پیدا کیا، جس کی میں کرسی ہوں۔

کرسی یہاں تک کہہ کر ایک لمحے کے لیے رُکی۔ پھر اس نے داستان جاری رکھتے ہوئے کہا ———

"انہی دنوں کی بات ہے ہمارے شہر ہیم پور کے تیلیوں کے محلے میں بھیکو نام کا ایک شیر فروش رہتا تھا، جس کا کام پہلے تو بہت نہ چلتا تھا۔ لیکن جب سے سرکار نے دودھ کے بجائے پانی میں چونا، میدہ، کھریا مٹی، سفید لکڑی کا بُرادہ، غرض کہ پانی میں کوئی بھی سفید چیز ڈال کر اسے دودھ کے نام سے بیچنے کی اجازت دی تھی۔ بھیکو کا کام خوب چل نکلا تھا۔ یوں بھیکو بہت شریف آدمی تھا۔ اُسے صرف اپنے کام سے غرض تھی اور دوسروں کی بے ایمانی سے اسے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس لیے بھیکو کو بہت تکلیف پہنچی، جب اس کا بڑا لڑکا گوبندا آٹھویں میں فیل ہو کر گھر بیٹھ گیا۔ اور اس نے دودھ بیچنے سے انکار کر دیا۔ میں آٹھویں فیل ہو کر دودھ بیچوں، یہ قطعی ناممکن ہے۔ گوبندے نے صاف انکار کر دیا۔ اور جب بھیکو نے غصے میں آکر اپنے بیٹے کو پیٹنا چاہا تو گوبندا لاٹھی لے کر کھڑا ہو گیا۔ گوبندا چھ فٹ سے اونچے قد کا تھا۔ اس کے بڑے نتھنے پھولے ہوئے تھے اور رخسار اندر کو دھنسے ہوئے تھے۔ جس سے اُس کے جبڑے اور بھی مضبوط دکھائی دیتے تھے۔ اس کی آنکھیں سیاہ چمکیلی اور چھوٹی چھوٹی تھیں۔ لیکن ان آنکھوں کے اوپر اس کی بھنویں بڑی بڑی، سیاہ اور گھنے بالوں والی تھیں۔ جنھوں نے اس کی آنکھوں کی چمک میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا۔ اس کا ماتھا تنگ اور گھٹا ہوا تھا۔ اور ہونٹ لمبے لمبے اور بڑے بڑے تھے۔ اس کے منہ کا دہانہ بہت بڑا تھا۔ لیکن ان سب سے بڑی اس کی آواز تھی۔ وہ جب بولتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا کسی نے اس کے حلق کے اندر ایک لاؤڈ اسپیکر لگا دیا ہے۔ پڑھنے لکھنے میں اس کا جی مطلق نہ تھا۔ وہ سات بار آٹھویں میں فیل ہو چکا تھا اور آٹھویں بار فیل ہونے کی تیاری کر رہا تھا کہ بھیکو نے اسے اسکول سے اٹھا لیا، اور اس کے دودھ بیچنے سے انکار پر اسے اپنے دوست جمن بیڑی فروش کی بیڑیاں بیچنے پر لگا دیا۔ جمن بیڑی فروش کی

"اصلی بنارسی تمباکو والی نمبرون بیڑی" جس کا تمباکو پرانی سڑی گھاس، ڈھاک کے پتوں اور گولر کی شاخوں کو کوٹ کوٹ کر انھیں تمباکو کی مہک دے کر تیار کیا گیا تھا۔ اُن دنوں شہر میں بہت بکتی تھی۔ جمن بیڑی فروش نے گوبندے کو اپنے ہاں دو روپے روز پر ملازم رکھ لیا۔ اس کا کام یہ تھا کہ دو چار لونڈے اپنے ساتھ لے کر اور ایک ٹھیلا لے کر وہ شہر کے گلی کوچوں میں چلا جاتا، اور کھڑا ہو کر اپنی گرج دار بلند آواز میں میاں جمن کی "اصلی بنارسی تمباکو والی نمبرون بیڑی" کی تعریفیں کرتا اور لوگوں کو اسے استعمال کرنے پر آمادہ کرتا۔ گوبندے کو بھی یہ کام بہت پسند آیا۔ ایک تو اسے اپنی آواز استعمال کرنے کا اچھا موقع مل گیا، پھر اس کے سر پہ جو پھندنے دار ٹوپی ہوتی اور ہاتھ میں جو گھڑیال ہوتا، اور پیچھے جو آٹھ دس لڑکوں کا لاؤ لشکر ہوتا۔ وہ سب اُسے بے حد پسند تھا، اور گویا وہ اس کی مرضی کے عین مطابق تھا۔ ادھر بھیکو دودھ فروش بھی بہت خوش ہوا کہ چلو اس کا لڑکا ٹھکانے سے کام پر لگ گیا۔

ایک دن جب وہ اتفاق سے چیلا پتی لین کے ناکے پر کھڑا ہوا اپنی گرجتی گونجتی آواز میں بیڑیاں بیچ رہا تھا۔ اُدھر سے یو پی والوں کا ایک جلوس نکلا جو "شوگر فیکٹری ہماری ہے" کے نعرے لگاتا ہوا بڑا گھوڑا میدان میں جلسہ کرنے کے لیے جا رہا تھا۔ جلوس کے لوگ نعرے لگا رہے تھے۔

"شوگر فیکٹری ہماری ہے!"

اور گوبندا چلا رہا تھا "بیڑی نمبرون ہماری ہے"

مگر سارے جلوس پر گوبندے کی آواز بھاری تھی۔ لوگ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگے اور آگے بڑھنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد جب جلوس آگے بڑھ گیا تو گوبندے نے کیا دیکھا کہ دو آدمی جواہر جیکٹ اور دھوتی پہنے ہوئے آپس میں اس کی طرف دیکھ کر کھسر پھسر کر رہے ہیں۔

پھر تھوڑی دیر کے بعد وہ دونوں آدمی اس کے قریب آئے اور کہنے لگے "یہ کیا بیڑی بیچنے کا کام کرتے ہو؟ کوئی اچھا سا۔ دیش سیوا کا کام کرو۔"

"بیڑی بیچنے میں مجھے دو روپے روز ملتے ہیں۔ دیش سیوا کے کام میں مجھے کیا ملے گا؟" گوبندے نے فوراً پوچھا۔

"وہاں تمھیں پانچ روپے روز ملیں گے۔"

"تو مجھے دیش سیوا منظور ہے!"

اُن دونوں آدمیوں نے گوبندے سے ہاتھ ملایا۔ اُس کی پیٹھ تھپکی۔

پھر گوبندے نے پوچھا۔ "مگر یہ تو آپ نے بتایا ہی نہیں کہ کام کیا ہوگا؟"

ایک آدمی نے جس کی جواہر جیکٹ دوسرے سے زیادہ خوش نما تھی۔ اپنی جیب کو تھپتھپاتے ہوئے کہا:

"آج رات کو تمھیں بڑا گھوڑا میدان میں ایک تقریر کرنا ہوگی؟"

"بیڑی نمبرون کی حمایت میں؟" گوبندے نے پوچھا:

"نہیں۔ شوگر فیکٹری یو پی والوں کی ہے" اس بات کی حمایت میں۔

"مگر مجھے تقریر کرنی نہیں آتی"

"وہ تم رہنے دو۔ وہاں تمھیں کیا بولنا ہے۔ وہ سب ہم بتا دیں گے۔ ہمیں فقط تمھاری آواز چاہیے"

اور یہ بات تھی بھی سچ۔ بجلی نہ ہونے سے مائیکروفون نہ ملتے تھے اور مجمع آہستہ بولنے والے مقرروں کی تقریروں سے بور ہو جاتا تھا۔ اس لحاظ سے گوبندے کی گرجتی گونجتی پاٹ دار آواز بہت کامیاب رہی اور پھر گوبندے کو خود اپنی آواز بہت پسند تھی۔ وہ اُسے سنتے ہی چلا جانا چاہتا تھا۔ اس لیے جو کچھ ان دونوں آدمیوں نے اُسے پڑھایا تھا، وہ اس سے کچھ زیادہ ہی بول گیا۔ دو ایک لطیفے اس نے اپنے پاس سے جڑ دیے جو بہت کامیاب رہے۔ غرض کہ اس دن کا جلسہ بہت کامیاب ہوا۔ خوش نما جواہر جیکٹ والے آدمی نے جس کا نام اسے بعد میں معلوم ہوا کہ کالی چرن ورما ہے اور وہ شہر کا میونسپل کمشنر ہے، اس کی خوب پیٹھ ٹھونکی اور اُس سے کہا ——

"آج سے تو لیڈر ہو گیا ہے گوبندے"

گوبندا خوش ہو کر بولا ——

"سرکار سنتا ہوں ہر لیڈر کے پاس ایک کرسی ہوتی ہے۔ میرے گھر میں تو ایک کرسی بھی نہیں ہے"

تب کالی چرن ورما نے اُسی دن مجھے گپتا فرنیچر مارٹ سے خریدا۔ اور میں اسی روز گوبندے کے گھر پہنچا دی گئی۔ گوبندا مجھ پر پہلی بار بیٹھ کر بہت خوش ہوا، اور اپنے باپ اور ماں اور بھائی بہنوں کے سامنے بیٹھ کر لات پر لات رکھ کر شیخی بگھارنے لگا۔

"پانچ ہزار آدمی کا مجمع تھا۔ انھوں نے مجھے پھولوں کے ہار پہنائے —— جے کارے لگائے —— اب میں لیڈر ہو گیا ہوں باپو —— لیڈر!"

اس کا باپ بھیکو جو ابھی ابھی بھینس کا دودھ دوہ کر آیا تھا، پریشانی سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر اُس نے دودھ کا مٹکا پانی کے نل کے نیچے رکھ دیا، اور بولا ——

"بیٹا لیڈری میں کیا رکھا ہے —— دو دن کی چاندنی ہے، پھر لیڈری دھری کی دھری رہ جائے گی۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا —— لیکن ہمارا خاندانی دھندا سب سے اچھا ہے۔ جس میں دودھ اور پانی اگر ایک دفعہ مل جائیں تو پھر کبھی الگ نہیں ہوتے" ——

بھیکو دیر تک دودھ کے مٹکے میں گرتی ہوئی پانی کی دھار کو دیکھتا رہا، اور جب مٹکا لبالب بھر گیا تو اس نے پہلا مٹکا اٹھا کے اس کی جگہ دوسرا دودھ کا مٹکا رکھ دیا ——

گوبندے نے انکار میں سر ہلا کے کہا ——

"باپو، جو کام تم کرتے ہو اس میں عزت نہیں ہے۔ میں ایسا کام نہ کروں گا۔ میں تو بس عزت والا کام کروں گا۔ اور لیڈری سے بڑھ کر عزت کس بات میں ہے؟" ——

بھیکو چپ ہو گیا بیٹے نے بات ٹھیک کہی تھی ——

گوبندے کی پاٹ دار آواز نے یوپی والوں کے مخالفوں کے چھکے چھڑا دیے۔ ان کے جلسوں میں لوگوں کی تعداد ہر روز بڑھتی گئی ——

آخر ایک روز "شوگر فیکٹری مراٹھوں کی ہے" کی تحریک کا صدر —— بابو ہمت راؤ پنڈھارکر رات کے دس بجے گوبندے کے گھر پہنچا —— جب گوبندا مجھ پر آلتی پالتی مارے بیٹھا گھر والوں پر رعب جما رہا تھا۔

ہمت راؤ پنڈھارکر نے پوچھا۔ "یہ یوپی والے تمھیں کیا دیتے ہیں؟"

"پانچ روپے ایک بھاشن کے دیتے ہیں۔"

"ہم دس روپے دیں گے۔ بولو ہمارے لیے کام کرو گے؟"

"کروں گا کیوں نہیں؟" گوبندا خوش ہو کے بولا۔ "یوپی والے پانچ روپے دیتے تھے۔ اس سے پہلے اصلی بنارسی تمباکو والی بیڑی نمبر دن والے صرف دو روپے دیتے تھے۔ آپ دس روپے دیتے ہیں تو میرا سر پھرا ہے جو آپ کا کام نہ کروں گا۔"

اس دن سے گوبندے نے "شوگر فیکٹری مراٹھوں کی ہے" والوں کے لیے کام کرنا شروع کیا، وہی بھاشن، وہی آواز، وہی گوبندا ــــ فرق صرف یہ تھا کہ پہلے جہاں جہاں یوپی والوں کا ذکر آتا تھا وہاں اب مراٹھوں کی حمایت میں بات ہونے لگی۔ بابو ہمت راؤ پنڈھارکر نے گوبندے کی بڑی ہمت بندھوائی۔ بھرے جلسے میں اس کا تعارف شری گوبندرام کہہ کر کرایا اور اسے ــــ "ایک انصاف پسند یوپی والے" کے خطاب سے نوازا۔ گوبندے نہیں، گوبندرام کے کہنے پر پنڈھارکر نے اس کے لیے ایک میز بھی خرید کر دی۔ جو میرے سامنے رکھ دی گئی۔ میری پشت پر اعلیٰ نرم چمڑے کا ایک غلاف چڑھایا گیا، جو آج تک آپ مجھ پر دیکھ سکتے ہیں۔ اب گوبندا اکثر مجھ پر بیٹھ کر اور اپنی ٹانگیں میز پر پسار کر گھر والوں سے اپنی کامیابی کی باتیں کیا کرتا تھا، اور محلے والوں پر رعب گانٹھا کرتا تھا۔ محلے والے بھی اب اس سے ڈرے ڈرے سے رہنے لگے تھے اور اس کی عزت کرنے لگے تھے۔

گوبندرام کی لیڈری چمکنے لگی۔ پہلے یوپی والوں، پھر مراٹھوں کے لیے کام کرنے سے اس کا سارے شہر میں شہرہ ہو گیا۔ دو ایک بار تو اس نے یہاں تک کر لیا کہ شام کو یوپی والوں کے لیے تقریر کی اور رات کو مراٹھوں کے جلسے میں جا کے بول آیا۔ اور دونوں طرف سے پیسے وصول کر لیے۔

اور جب لوگوں نے پوچھا "یہ تم نے کیا کیا؟"

تو اس نے جواب دیا ــــ "بھائی، شوگر فیکٹری مراٹھوں کے علاقے میں جائے یا یوپی والوں کی آبادی کے حصے میں کھلے، رہے گی تو ہیم پور میں!" ــــ

پنڈھارکر نے اُسے زیادہ نہیں ڈانٹا۔ کیونکہ گو اب بجلی کی ہڑتال کھل گئی تھی، اور شہر میں بجلی آ گئی تھی، پھر بھی جلسے کے لیے مائیکروفون اور لاؤڈ اسپیکر کرائے پر لینے میں پچاس ساٹھ روپے نکل جاتے تھے اور یہاں صرف دس روپے خرچ کرنے پر ایک عمدہ انسانی لاؤڈ اسپیکر ہاتھ آ جاتا تھا ــــ

مگر پندرہ بیس دنوں کے بعد ہی گوبندے کی لیڈری جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ ہوا یہ کہ سرکار نے یوپی والوں اور مراٹھوں کی روز روز کی چپقلش سے تنگ آ کر یہ فیصلہ کیا کہ ہیم پور میں ایک سرے سے شوگر فیکٹری لگائی ہی نہ جائے۔ انھوں نے اس کام کے لیے مدراس شہر کو چن لیا۔ اور اس طرح ایک اور کارخانہ ہیم پور میں کھلنے سے رہ گیا۔ ہاں اس واقعہ کے بعد دو دو پاگل خانے اور شہر میں کھل گئے، کھلنا ہی تھا ان کو ــــ

اس واقعہ کے بعد کئی ماہ گوبندا بے کار رہا۔ بیڑی نمبر دن اب وہ بیچ نہ سکتا تھا۔ حالانکہ جمن بیڑی فروش نے اب اس کی بڑھتی ہوئی شہرت کے پیش نظر اُسے تین روپے روز پر ملازم ہو جانے کی دعوت دے دی تھی، جسے گوبندرام نے بصد تحقیر ٹھکرا دیا تھا۔ اُس کے باپ نے اُسے بہت سمجھایا مگر وہ نہ مانا ــــ

بولا — "اب میں بیڑی بیچوں گا؟ کیا بات کرتے ہو تم بابو۔ میں اب کوئی بڑی شے ہی بیچوں گا۔ مجھ سے تم کوئی شوگر فیکٹری کھلوا لو۔ کوئی قوم بکوا لو۔ کوئی ملک نیلام کروا لو۔ مگر اب مجھ سے یہ بیڑی نہ بیچی جائے گی۔"

اس کا باپ چپ ہوگیا، اور دل ہی دل میں کڑھتا رہا کہ اس کا لڑکا پھر بے کار ہے۔ آخر سوچ سوچ کر اس نے گوبندے کا بیاہ اپنی جات برادری میں کر دیا۔ روپا اس کی بہو گو بہت سندر تو نہ تھی اور پڑھی لکھی تو بالکل نہ تھی، مگر بھینس کا دودھ دوہنے میں لاثانی تھی۔ اس لیے بھیکو نے روپا کا ناتا منظور کر لیا۔ پھر اس نے یہ بھی سوچا لڑکا بے کار ہے کام نہیں کرتا ہے مگر جب گھر میں بہو آ جائے گی اور گرہستی بڑھے گی تو خود ہی کوئی کام کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔

دن گزر گئے، مہینے گزر گئے، لیکن گوبندے کو کوئی کام نہ ملا، ہیم پور میں نہ کوئی کارخانہ کھلا، نہ کوئی جھگڑا ہوا۔ اس اثنا میں میرا جمپر گھس گیا تھا، میری پشت پھٹ چکی تھی۔ گوبندا بھی پہلے سے موٹا، پہلے سے بدمعاش، پہلے سے چالاک ہو گیا تھا۔ روپا کی گود میں تین بچے کھیلتے تھے۔ وہ تو کہو کہ بھیکو کے گھر میں دودھ کی برکت تھی، بلکہ پانی کی برکت تھی کہ گھر چلتا رہا، اور گوبندا کھا کھا کر موٹا ہوتا رہا اور گلی محلے میں اپنی لیڈری کا خالی خولی رعب گانٹھنے کی کوشش کرتا رہا۔ ورنہ اب تک بے کاری سے مر گیا ہوتا۔

تین سال بعد گوبندے کے دن پھرے۔ ہوا یہ کہ سر پر میونسپل الیکشن آ گیا۔ شہر میں دھڑے بازیاں اور پارٹیاں جلسے اور جلوس اور تماشے، باجے گاجے اور تقریریں پھر سے شروع ہونے لگیں۔ اب کے گوبندے نے بڑی ہوشیاری سے کام لیا۔ اس نے سب دھڑے بازیوں اور پارٹیوں کا غور سے مطالعہ کیا، اور مطالعہ کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ شہر میں "سجک" پارٹی کے جیتنے کا سب سے زیادہ امکان ہے۔

"سجک پارٹی" کا نام پارٹی کے عقیدے سے لیا گیا تھا۔ جو یہ تھا "سب سے جنگ کرو!" اس فقرے کے ہر لفظ کا پہلا حرف لے کر پارٹی کا نام "سجک" رکھ دیا گیا تھا۔ گوبندے کو یہ پارٹی بہت پسند آئی تھی۔ یہ اُس کے مزاج کے عین مطابق تھی۔ پارٹی میں شامل ہونے سے پہلے گوبندا اس کے جلسے میں ایک تقریر سننے گیا۔ ایک نوجوان غصے سے منہ لال کیے چلا رہا تھا —

"لنکا والے ہم ہندوستانیوں کو شہریت نہیں دیتے۔ کیا کرنا چاہیے؟"

"جنگ کر دو"۔ مجمع زور سے چلا پڑا —

"جنوبی افریقہ والے ہم کو کالا سمجھ کر ہم کو بے عزت کرتے ہیں — بولو کیا کرنا چاہیے؟"

"جنگ کر دو!" مجمع اور بھی تیزی سے چلایا —

انہی دنوں میں پاکستان کے وزیر اعظم نے ایک تقریر میں ہندوستانیوں کو مُکا دکھایا تھا۔ بس پھر کیا تھا۔ گوبندے کے ہاتھ میں معاملہ آ گیا۔ اُس نے دوسرے دن سجک پارٹی کے بھرے جلسے میں ایک پستول داغ دیا۔ اور ایک بے حد جوشیلی تقریر کے دوران میں کہا —

"جو ہمیں مُکا دکھائے گا ہم اس پستول سے اس کا سینہ چھلنی کر دیں گے"۔ —

مجمع جوش میں آ گیا۔ ساری فضا گوبندرام زندہ باد کے نعروں سے گونجنے لگی۔ لوگ بے حد اشتعال میں آ کر طرح طرح کے نعرے لگانے لگے۔ گوبندرام کی مقبولیت بے حد بڑھ گئی۔ جس کے پیش نظر سجک پارٹی کے لیڈروں کو گوبندرام کا نام میونسپل

کمشنری کے امیدواروں کی لسٹ میں شامل کرنا پڑا۔
گوبندرام اپنے حلقے سے میونسپل کمشنری کا امیدوار تو ہوگیا۔ لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ ہوا یہ کہ اس کی تقریر کے چند روز بعد پولیس نے اُسے گرفتار کر لیا۔ اس پر الزام یہ تھا کہ ——

(۱) اُس نے بھرے جلسے میں پستول چلایا۔
(۲) اور پستول کا لائسنس اس کے پاس نہ تھا۔
(۳) اس نے ایسی اشتعال انگیز تقریر کی جس سے ملکوں اور قوموں کے درمیان منافرت پھیلنے کا اندیشہ تھا۔

گوبندرام کو ڈھائی سال قید بامشقت ہوئی۔ اِدھر اس کی سمجک پارٹی بھی میونسپل الیکشن ہار گئی جس کا مقولہ تھا، "سب سے جنگ کرو"۔ جیت دوسری پارٹی کی ہوئی جس کا مقولہ تھا "سب سے صلح کرو"۔ یعنی سمک پارٹی کی۔

ان ڈھائی سالوں میں میرا تو حلیہ ہی بگڑ گیا۔ مجھ پر وقت بے وقت دودھ کے مٹکے اور پانی کے گھڑے رکھے جانے لگے۔ کبھی کوئی چھوٹا بچہ مجھ پر بیٹھ کر پیشاب کر دیتا۔ کبھی بڈھا بھیکو اپنی میلی دھوتی سے رانیں کھجا کھجا کر میرے ڈنڈوں سے طبلے کا کام لے کر آلھا اودل گانے لگتا۔

ایک بار بچوں نے مجھے الٹا کر دیا، اور اِدھر اُدھر گھسیٹ کرلے جانے لگے۔ اسی طرح میں گھر کی سیڑھیوں سے نیچے گر گئی۔ اور میری ٹانگ ٹوٹ گئی۔ وہاں کون میری خبر گیری کرنے والا تھا۔ گوبندا تو جیل میں تھا، خود ہی بھیکو نے محلے کے کسی تھرڈ کلاس بڑھئی کو بلا کر مجھے ٹھوک ٹھاک کر بیٹھنے کے قابل کر دیا۔ یہ چوتھی ٹانگ اس بڑھئی کی عطا کردہ ہے اور یہ غضب کا بادامی پالش بھی اسی کا ہے۔

خیر صاحب —— ڈھائی سال بھی کسی نہ کسی طرح روتے دھوتے گزر گئے۔ اور گوبندا جیل سے چھوٹا۔ جیل میں اُس کی ہیم پور کے مشہور غنڈوں سے شناسائی ہوگئی تھی۔ اور اب وہ گوبندا، گوبندا نہ رہا تھا۔ اب کے جو وہ جیل سے آیا تو شہر کے رازِ درونِ پردہ سے بخوبی واقف ہو کے لوٹا اور اپنا اثر و رسوخ ان غنڈوں سے پیدا کر کے لوٹا۔

جیل سے باہر نکلنے کے بعد سمجک پارٹی یعنی سب سے جنگ کرو پارٹی کے ممبروں نے اس کے گلے میں ہار پہنائے، اس کی قومی خدمات کو سراہا۔ اس کی قومی قربانیوں کی تعریف کی۔ گوبندرام نے مختصر سا اس کا شکریہ ادا کیا، اور ناسازیٔ طبیعت کا بہانہ کر کے گھر بیٹھ گیا۔

میونسپل الیکشن اب پھر سر پر آرہا تھا، اور بہت سے لوگوں کو جو ٹوہ رکھتے تھے انھیں معلوم ہو چکا تھا کہ گوبندرام شہر کے کن لوگوں سے متعلق ہو چکا ہے، اور کتنے ہی سیکڑوں ووٹ وہ ان کو دلوا سکتا ہے۔ گوبندرام نے ان لوگوں کا اثر و رسوخ استعمال کر کے اپنے گھر کے آگے ایک بیٹھک بنانے کی اجازت حاصل کرلی۔ ایک ٹیلی فون لگوا لیا۔ بیٹھک کو نئے سازوسامان سے نئے فرنیچر سے سجایا۔ مگر مجھے نہ بدلا۔ کمرے کی ہر چیز بدل گئی، مگر میں اس کی کرسی وہی کی وہی رہی۔

گوبندرام اکثر میرے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا کرتا تھا ——

"یہ میری لیڈری کی پہلی نشانی ہے۔ میرے بُرے دنوں کی ساتھی ہے میں اسے کبھی نہ بدلوں گا۔"

لوگوں میں، سرکاری حلقوں میں، کاروباری حلقوں میں اس کا رسوخ خود بخود بڑھتا گیا۔ وہ لوگوں کے طرح طرح کے کام کرنے لگا، اور طرح طرح کے کام ان سے لینے لگا۔ آہستہ آہستہ اس کی وہ جوشیلے ڈھب کی شہرت ختم ہوتی گئی اور اب وہ شہر کا ایک

معزز، شریف، سنجیدہ، متین شہری سمجھا جانے لگا۔

اب کے میونسپل الیکشن میں اس نے "سمک پارٹی" کا ساتھ دیا اور ان کے ٹکٹ پر امیدوار کھڑا ہوا۔ "سمک پارٹی" کا مقولہ تھا، "سب سے صلح کرو۔" چنانچہ اس بار گوبندرام سب کے ساتھ چین، جاپان، لنکا، پاکستان، افریقہ، ایران، توران، افغانستان اور بالنجان سب کے ساتھ صلح کرو کا حمایتی بن گیا۔ ان دنوں اس کا چہرہ ایسا بھیگا بھیگا سا، چکنا چپڑا سا، ایک ایسی صلح کن مسکراہٹ میں لتھڑا ہوا معلوم ہوتا تھا، جیسے وہ کوئی چہرہ نہ ہو، کسی بناسپتی گھی کے ڈبے کا اشتہار ہو۔

تھوڑے دنوں میں میونسپل الیکشن کا نتیجہ نکل آیا۔ اب کے نہ "سجک پارٹی" کامیاب ہوئی جس کا مقولہ تھا۔ "سب سے جنگ کرو"، نہ "سمک پارٹی" جس کا مقولہ تھا "سب سے صلح کرو۔" "کھسک کھیک پارٹی" کامیاب ہوئی جس کا مقولہ تھا۔ "کبھی صلح کرو کبھی جنگ کرو۔"

گوبندرام پھر ممبر ہوتے ہوتے رہ گیا۔

مگر اب کے اسے اس کا زیادہ افسوس نہ ہوا۔ وہ ٹھیک راستے پہ جا رہا تھا۔ لیڈری کی بنیادیں مضبوط ہونی چاہئیں۔ ورنہ لیڈری زیادہ دیر تک نہیں چل سکتی۔ مختلف لوگوں سے مختلف رابطے قایم کرنا چاہئیں، اور جو کوئی جو چیز مانگے اُسے وہی دینے کی کوشش کرنی چاہیے۔ صرف وہی پارٹی کامیاب ہو سکتی ہے جو زیادہ سے زیادہ لوگوں کو ووٹ دیتے وقت خوش کر سکے۔ اصول بہت عمدہ اور خوش نما ہونے چاہئیں۔ لیکن ان کے اندر کوئی نہ کوئی پیچ ایسا ہونا چاہیے جسے ضرورت کے مطابق گھما کر فوراً بدل دیا جا سکے۔

بہت سوچ سوچ کے گوبندرام نے ایک نئی پارٹی کی بنیاد رکھی جس کا مقولہ تھا "تمھارا کس میں فائدہ ہے؟" شہر کے بہت سے ذی ثروت اصحاب کو اپنی اسکیم سنا کے اپنے ساتھ ملا لیا، اور میونسپل الیکشن سے بہت پہلے اس پارٹی کی بنیادوں کو مضبوط کر لیا۔ گوبندرام نے اس کا منشور پیش کرتے وقت لوگوں کے سامنے جو تقریر پیش کی، وہ اس پارٹی کی مکمل طور پہ رہنمائی کرتی تھی۔

گوبندرام نے کہا ———

"ہماری پارٹی صرف اس بات کو مدنظر رکھے گی کہ تمھارا کس میں فائدہ ہے؟ انکم ٹیکس بڑھانے میں یا گھٹانے میں؟ شہر کی سڑکیں چوڑی کرنے میں یا تنگ کرنے میں؟ بجلی کا ریٹ کم کرنے میں یا زیادہ کرنے میں؟ ملازموں کی تنخواہیں بڑھانے میں یا کم کرنے میں؟ ہماری پارٹی صرف وہی کام کرے گی جس میں تمھارا فائدہ ہوگا۔"

بات معقول تھی۔ لوگوں کو جچ گئی۔ میونسپل الیکشن کے دوران میں صاف نظر آنے لگا کہ جیت اسی پارٹی کی ہوگی جس کا مقولہ تھا۔ "تمھارا کس میں فائدہ ہے؟"

اس پروگرام کے تحت گوبندرام نے دھوبیوں کے ریٹ بڑھانے اور صابن کے ریٹ کم کرانے کے لیے ہاں کر دی۔ نلکوں میں پانی کی مقدار بڑھانے اور پانی کا چارج کم کرنے کی سفارش کر دی۔ انھوں نے برہمنوں سے کہہ دیا کہ وہ بوچڑ خانہ بند کر دیں گے اور چماروں سے کہہ دیا کہ انھیں چمڑا سستا اور زیادہ مقدار میں مہیا کیا جائے گا۔ کرایہ داروں سے کہہ دیا کہ ان

کے کرائے کم کردیے جائیں گے، اور مکان کے مالکوں سے کہہ دیا کہ مرمت کے بہانے وہ اپنے کرائے بڑھا سکیں گے۔

تھوڑے دنوں میں جب میونسپل الیکشن کا نتیجہ نکلا تو سب سے زیادہ ووٹ، "تمھارا کس میں فائدہ ہے" والی پارٹی کو پڑے اور اس کے ممبر بھی سب سے زیادہ تعداد میں چنے گئے۔ اتفاق رائے سے گوبند رام کو میونسپل کمیٹی کا صدر چن لیا گیا ——

میونسپل کمیٹی کی پہلی میٹنگ میں جب یہ سوال اٹھا: "کہ تمھارا کس میں فائدہ ہے؟" والے پروگرام پر کس طرح عمل کیا جائے؟ — تو بہت دیر تک بحث ہوتی رہی۔ کوئی کچھ کہتا تھا، کوئی کچھ — کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ کیسے اس پروگرام پر عمل کیا جائے جس کی ہر شق دوسری شق کے خلاف جاتی ہے۔

آخر گوبند رام نے کہا ——

"میرے خیال میں یہ منشور ہی غلط ہے۔ "تمھارا کس میں فائدہ ہے؟" اسے بدل دینا چاہیے اور اس کے بجائے اس پر عمل کرنا چاہیے کہ ——

"اپنا کس میں فائدہ ہے؟"

چاروں طرف سے واہ واہ کا ڈونگرا برس گیا ——

"صدر نے کیا نکتہ پیدا کیا ہے، واہ واہ گوبند رام جی۔ کیا بات پیدا کی ہے۔"

جب سے گوبند رام جی کی پارٹی شہر ہیم پور کی میونسپل کمیٹی پر قبضہ جمائے بیٹھی ہے۔ گوبند رام اب اچاریہ گوبند رام کہلاتے ہیں۔ انھوں نے اپنا محلہ چھوڑ کر سول لائن میں رہائش اختیار کی ہے۔ انھوں نے دوسری شادی کرلی ہے جو نئے فرنیچر کی طرح اَپ ٹو ڈیٹ اور خوبصورت ہے۔

مجھے پرانے گھر میں چھوڑتے وقت اچاریہ گوبند رام کو بہت دکھ ہوا، مگر ان کی نئی فیشن ایبل بیوی اس پر تیار نہ ہوئیں کہ ایسی بدہیئت، بدشکل، ٹوٹی پھوٹی کرسی کو اپنے گھر میں جگہ دیں۔

میں اس کے بعد بھی کئی سال تک پرانے گھر میں رہی۔ آخر جب میرا حلیہ بالکل بگڑ گیا اور میں کسی کام کی نہ رہی تو بھیکو نے ایک دن نیلام والے کو بلایا اور اس کے ہاتھ مجھے بیچ دیا۔ بیچتے وقت اس کے دل سے آہ نکلی، اور اس نے آہستہ سے کہا ——

"یہ میرے بیٹے کی کرسی تھی۔"

"تمھارا بیٹا کیا کرتا ہے؟"

"وہ میونسپل کمیٹی کا صدر ہے۔"

"صدر تو ہے مگر کرتا کیا ہے؟" — نیلام والے نے پھر پوچھا۔

"جانے کیا کرتا ہے" — بھیکو نے جواب دیا۔

"مگر میں سوچتا ہوں وہ ابھی تک دودھ میں پانی ملا کر بیچتا ہے اور نقلی تمباکو والی بیڑی نمبر دَن بیچتا ہے۔"

"اس کے بعد والی داستان بڑی تلخ ہے" — کرسی ایک وقفہ کے بعد بولی — "پہلے مجھے ایک ایسے آدمی

(باقی صفحہ ۱۶۱ پر)

سبطِ حسن • احمد ندیم قاسمی • ڈاکٹر جمیل جالبی

حمید اختر • ابنِ انشا • انتظار حسین

یادیں اور آنسو

سبطِ حسن

کرشن چندر دکھی انسانیت کے فسانہ خواں تھے۔ وہ تمام عمر غمِ زمانہ کا زہر گھول گھول کر پیتے رہے مگر غم زدوں کو سوم رس پلاتے رہے۔ انھوں نے اپنے جذبہ دفن کا رشتہ ہمیشہ ان جفاکشوں سے جوڑا جو سب کے [illegible] دا تا ہیں۔ جن کے خون کی توانائی سے کھیت لہلہاتے ہیں اور سرسوں اور کپاس کے پھول کھلتے ہیں اور زندگی کی خوشبوئیں [illegible]ص کرتی ہیں اور مُردہ مشینوں میں جان پڑتی ہے اور کوچہ و بازار جگمگاتے ہیں ــــ

کرشن چندر صحیح معنوں میں مردِ آفاقی تھے۔ اُن کا فن اُفق تا اُفق پھیلا ہوا ہے۔ وہ انسان کو ایک اکائی سمجھتے تھے اور اس اکائی کو رنگ و نسل، مذہب اور وطن کے خانوں میں بانٹنے کے قائل نہ تھے، بلکہ اُن کی دلی آرزو [illegible] کہ انسان جہاں بھی رہے وہاں امن ہو، آزادی ہو، آسودگی اور انصاف ہو اور اُن قوتوں کا خاتمہ ہو جائے جو زندگی کے در[illegible] ہیں ــــ

احمد ندیم قاسمی

اردو کا بے حد محبوب اور بے حد ہر دل عزیز افسانہ نگار کرشن چندر اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ گزشتہ سال جولائی میں اس پر دل کا شدید حملہ ہوا۔ اکتوبر میں اس سے بھی شدید حملہ ہوا، مگر اب مارچ میں جو حملہ ہوا اس میں وہ جانبر نہ ہو سکا اور اردو ادب کی ایک بہت پیاری بے انتہا دل نواز شخصیت ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئی۔ وہ جتنے اونچے درجے کا افسانہ نگار اور ناول نویس تھا اُس سے بھی اونچے درجے کا انسان تھا کہ فراخ دل اور غیر متعصب تھا۔ جب پاکستان کے جنگی قیدیوں کی اسیری کے خلاف خود ہندوستان میں تحریک چلی، تو کرشن چندر اس تحریک کے بانیوں میں تھا ــــ

ڈاکٹر جمیل جالبی

کرشن چندر سے میں کبھی نہیں ملا، لیکن ان کی تحریروں سے میری باقاعدہ ملاقات ۱۹۴۴ء میں ہوئی۔ میں ایف اے میں پڑھتا تھا اور ساقی، ادبی دنیا، ادبِ لطیف، ہمایوں میرے پسندیدہ رسالے تھے۔ ان رسالوں میں جن ادیبوں کی تحریریں مجھے پسند تھیں، اُن میں کرشن چندر سر فہرست تھے۔ ان کی کہانیوں کا نیا پن، چونکانے والا انداز، حقیقت پسندی، رومانی و جذباتی فضا، رواں دواں اسلوب، موثر عبارت، نئے نئے موضوعات، ایسے اچھے معلوم ہوتے کہ

ڈاکٹر جمیل جالبی

کرشن چندر میرے ہی نہیں، بلکہ ہزاروں نوجوانوں کے محبوب افسانہ نگار تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کی یہ مقبولیت مرتے دم تک قایم رہی۔ ۱۹۴۴ء میں اگر یہ بات دوسرے لکھنے والے ان کے آگے خشک و بے کیف لگتے۔ اس زمانے میں بہت کم لکھنے والوں کو میسر آئی ہے۔ ۱۹۴۵ء میں جب ساقی بک ڈپو، دہلی سے اُن کا ناول "شکست" شایع ہوا تو اُسے جلد سے جلد حاصل کرنے کے شوق میں، میں سائیکل پر میرٹھ سے دہلی آیا۔ اردو بازار سے ناول خریدا۔ ایک عزیز کے ہاں ٹھہرا اور رات بھر "شکست" پڑھتا رہا۔ کسی کتاب کو فوراً حاصل کر کے فوراً پڑھنے کا یہ شوق مجھ میں اس طور پر ایک ہی بار پیدا ہوا ——

ابھی پچھلے دنوں کرشن چندر کا خط کسی رسالے میں چھپا تھا جس میں لکھا تھا کہ سات ماہ سے بستر پر ہوں۔ لیکن ایک سال بعد میدانِ عمل میں آجاؤں گا۔ ابھی اس خط کے الفاظ بھی ذہن کی تختی سے صاف نہیں ہوئے تھے کہ اطلاع آئی — کرشن چندر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وہاں چلے گئے ہیں جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا۔ یہ خبر پڑھ کر کچھ دیر تو سکتے کا عالم طاری رہا۔ لیکن اسی اثنا میں اُن کی کہانیوں کے بہت سے کردار ذہن کے دریچے سے جھانکنے لگے اور پکار پکار کر کہنے لگے کہ یہ ہوائی کسی دشمن نے اڑائی ہے۔ کرشن چندر تو زندہ ہیں۔ یہ کس نے کہا کہ وہ مرگئے۔ یہ جھوٹ ہے۔ غلط ہے۔ کرشن چندر تو امر ہیں — وہ کیسے مرسکتے ہیں۔ وہ اور ان کے کارنامے تو ہمیشہ زندہ رہیں گے ——

حمید اختر

۸ / مارچ (۱۹۷۷ء) کو برصغیر میں اردو افسانے کی سب سے مدھر آواز ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی۔ کرشن چندر کا تعلق ترقی پسند مصنفین کے اس نمایندہ گروہ سے تھا جس نے برصغیر کے جہدِ آزادی میں نمایاں حصہ لیا ——

۱۹۳۶ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک کا زمانہ ہندوستان کی تحریکِ آزادی کا انتہائی پُرشور دور تھا جس میں متعدد خلاف سامراج تحریکیں اُبھریں۔ ادیب چونکہ اجتماعی قومی شعور کا مظہر ہوتے ہیں۔ اس لیے ہندوستان کے ترقی پسند ادیبوں نے اس تحریک کو آگے بڑھانے میں نمایاں حصہ لیا۔ اس زمانے میں اور پھر حصولِ آزادی کے بعد ایک پُرمسرت معاشرے کی تشکیل کے سلسلے میں کرشن چندر کا حصہ غالباً سب سے زیادہ ہے۔ انھوں نے اپنے تمام ہم عصروں کے مقابلے میں سب سے زیادہ لکھا اور اُن کی آواز اس پورے گروہ میں سب سے زیادہ توانا تھی۔ ان لکھنے والوں میں راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، خواجہ احمد عباس اور بہت سے دوسرے لوگ شامل ہیں۔ لیکن کرشن چندر نے جس لگن، محبت اور شدت سے اس مشن کو آگے بڑھایا اس کی کوئی دوسری مثال موجود نہیں ——

ابن انشا

کرشن جی کے فن اور ادب پر مجھے کہنے کی ضرورت نہیں۔ کرشن جی کو سب جانتے ہیں۔ ان کی حیثیت ایک حق گو اور انسانیت دوست انسان کی تھی۔ جہاں وقت کی پکار ہوئی، انھوں نے لبیک کہا۔ آج چھوٹے چھوٹے ادیبوں کو نوبل پرائز اور بین الاقوامی اعزاز ملتے ہیں۔ اے کاش ہماری زبان انٹرنیشنل زبان ہوتی اور دنیا اُن کا مرتبہ جانتی — وہ اپنی اقلیم کے تاج دار تھے ——

ایک عہد کے اور اسلوب کے بانی تھے ——

انتظار حسین

وہ افسانہ نگار جو ایک پورے عہد کو اپنے ساتھ لے اڑا تھا دنیا سے سفر کر گیا۔ ہندوستان سے خبر آئی ہے کہ کرشن چندر انتقال کر گئے ــــــ

وہ عہد جس نے کرشن چندر کو جنم دیا تھا اور پھر کرشن چندر جس کے نمایندے ٹھہرے ــــ اردو افسانے کی تاریخ میں ایک انقلاب آفریں عہد سمجھا جاتا ہے۔ یہ ۱۹۳۶ء کے آس پاس کا زمانہ تھا جب اردو افسانے نے ایک زندگانی اور ایک صنف سے بڑھ کر ایک تحریک بن گیا۔ سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی اور کرشن چندر ــــــ یہ چار نام اس تحریک کے بڑے چار ٹھہرے ــــ ان چاروں میں کس کے افسانے کی کیا قدر و قیمت ہے اور کس کا کیا درجہ ہے یہ ایک الگ بحث ہے مگر ایک بات طے شدہ ہے کہ ان میں سے جس افسانہ نگار نے اپنے عہد کو سب سے زیادہ متاثر کیا وہ کرشن چندر تھے ــــ

یہ کہنا محض ایک رسمی بیان نہیں ہوگا، بلکہ ایک واقعہ ہوگا کہ کرشن چندر کے ساتھ ایک پورا عہد گزر گیا ہے کرشن چندر اپنی ذات میں ایک عہد تھے ــ ایک طرز احساس ــــ

لیڈر کی کرسی

صفحہ ۱۵۸ سے آگے

نے خریدا جو بڑا شریف، ایمان دار اور غریب آدمی تھا ــ لیکن مجھ پر بیٹھتے ہی وہ لاکھوں کی دولت کمانے اور بے ایمانی کرنے کے خواب دیکھنے لگا ــ

جب وہ اپنی حرکتوں کے بعد جیل چلا گیا، تو مجھے ایک ایسے آدمی نے خرید لیا جو بے حد زن مرید تھا۔ لیکن اس گرمی نے میرے چوکھٹے پر بیٹھتے ہی اپنی بیوی کو گالیاں سنانا شروع کر دیں اور اسے پیٹنا شروع کر دیا۔ جب اُس کی بیوی نے دیکھا کہ جب وہ اس کرسی پر بیٹھتا ہے، تبھی ایسی حرکت کرتا ہے۔ تو اُس نے اٹھا کے مجھے گھر سے باہر پھینک دیا۔

وہاں سے ایک گونگے فقیر نے مجھے اُٹھا لیا۔ بدقسمتی سے جونہی وہ مجھ پر بیٹھا، اُس کی زبان کھُل گئی اور وہ بولنے لگا اور بولتا ہی چلا گیا۔ اور لگاتار سات دن اور سات راتیں بولتا ہی چلا گیا۔ اور وہ سب کچھ بولتا گیا۔ جو کبھی گوبند رام بولا کرتا تھا ــــ ڈاکٹروں نے اس کا بہت علاج کیا، مگر اس کا بولنا بند نہ ہوا۔ اور وہ بولتے بولتے مر گیا۔

پھر وہاں سے یہ اسماعیل بھائی لونڈے والا مجھے خرید لایا ــــ اب جانے میں کس کے پاس جاؤں گی۔ مگر میں کہیں بھی جاؤں، میری سرشت میں گوبند رام کی خصوصیات اس طرح رچ چکی ہیں کہ میں جہاں بھی جاؤں گی اُس مشہور لیڈر کی کرسی ہی رہوں گی ــ"

لیڈر کی کرسی اپنی داستان سنا کے چپ ہو گئی ــ

محفل میں تھوڑی دیر تک سناٹا رہا۔

(ماخوذ از "افکار" ــ مئی ۱۹۵۶ء)

قدوس صہبائی

خودنوشت

(دوسری قسط)

"ہند" کا یادگار زمانہ

"ہند" میں شامل ہوتے ہی میرا نام سرورق پر چیف اڈیٹر کی حیثیت سے شائع ہونے لگا۔ روزانہ "ہند" میں مجھے لکھنے اور پالیسی کو کنٹرول کرنے کی جتنی آزادی ملی وہ چند سال بعد "نظام" بمبئی کے سوا کسی دوسرے اخبار میں نہ مل سکی۔ میں نے "ہند" کی دو چار کاپیاں بمبئی بھی بھیجنی شروع کر دیں۔ سجاد ظہیر مرحوم اور ڈاکٹر اشرف مرحوم دور دراز کلکتہ میں "ہند" جیسے مشہور روزنامے کی پالیسی میں نئی اٹھان اور تبدیلی دیکھ کر بے حد متاثر ہوئے۔ انھوں نے مجھے وقفے وقفے سے بہت سے خطوط لکھے۔ ان طویل خطوط میں دونوں بزرگ بالواسطہ میری ذہنی تربیت بھی کر رہے تھے۔ افسوس ہے کہ قیامِ پاکستان اور میرے پاکستان آجانے کے بعد میری کتابوں اور لاتعداد دستاویزات کو کسی نے محفوظ نہیں رکھا۔ انھیں میں یہ بہت سے خطوط بھی تھے۔ جو پھر مجھے نہ مل سکے اور ضائع ہو گئے۔ اس سے چند برس پہلے ۱۹۴۲ء میں، جب کئی بار میرے مکان کی تلاشی لی گئی تو حکومت کے کارندے بھی بے شمار تحریریں اور کتابیں اپنے ساتھ ہی لے گئے۔ چونکہ اسی زمانے میں مجھے گرفتار بھی کر لیا گیا تھا اور لمبی سزا دیدی گئی تھی۔ اس لیے بھی مجھے اس لٹریچر اور تحریروں کا کوئی پتہ نہ چلا جو پولس لے گئی تھی۔ بہر حال دستاویزوں کی ضبطی سے انسانی ذہن کو تو ضبط نہیں کیا جا سکتا تھا ——!

روزانہ "ہند" میں کبھی کبھی میں شعر و ادب کی نئی اور ترقی پسند فکری نشوونما پر لکھتا رہتا تھا۔ دوسرے صوبوں کے ترقی پسند اور خود کلکتہ کے اہلِ قلم بھی کافی تعداد میں اس تحریک پر برابر لکھتے رہتے تھے۔ اس دور میں ہندوستان بھر سے جو ترقی

پسند ادیب و شاعر کلکتہ آتے تھے وہ "ہند" کے دفتر میں آکر مجھ سے اور مولانا ملیح آبادی سے ضرور ملتے تھے اور سیاسی مباحث کے علاوہ ترقی پسند ادبی تحریک پر بھی خوب باتیں ہوتی تھیں۔ دو مرتبہ سجاد ظہیر خود بھی کلکتہ آئے۔ ڈاکٹر اشرف بھی آئے، میں دو دو چار چار دن اُن کے ساتھ رہا اور اُن کے خیالات اور ادبی تجربوں سے مستفید ہوتا رہا۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری بھی ایک بار تشریف لائے تھے۔ "ادب اور انقلاب" کے مصنف کی حیثیت سے میں ڈاکٹر رائے پوری کا بے حد معتقد اور مداح تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے بڑی شفقت فرمائی اور وعدہ کیا کہ وہ اپنی دوسری کتابیں بھی بھیجیں گے۔

ہفت روزہ "ہند" میں میں کبھی کبھی اپنا افسانہ بھی شائع کردیتا تھا۔ ویسے اُس میں شایع ہونے والا ہر افسانہ اور مضمون ترقی پسند ادب کا ہی ترجمان ہوتا تھا۔ میں پابندی سے "ہند" ہفت روزہ میں بین الاقوامی سیاست پر ایک مضمون لکھتا تھا۔ اور اس مضمون کی تیاری کے سلسلے میں مجھے کافی مطالعہ کرنا پڑتا تھا۔ اسی زمانے میں پروفیسر احتشام حسین مرحوم، فراق گورکھپوری، وامق جون پوری، ابراہیم خلیل، ڈاکٹر برلاس اور بہت سے دوسرے مشہور و معروف ادیبوں، نقادوں اور شاعروں سے بھی میری خط و کتابت رہی۔ جوش ملیح آبادی دو تین بار کلکتہ آئے اور وہیں اُن سے مجھے نیاز حاصل ہوا۔ جوش ملیح آبادی، مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے قریبی رشتہ دار تھے اور ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے بھی میری بے حد ہمت افزائی کی۔ جوش صاحب سے میں نے اُن کی چند نظمیں لے لی تھیں۔ مگر مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے بڑی منت سماجت کرکے مجھے اِن نظموں کی اشاعت سے روک دیا۔ مولانا ملیح آبادی کی دلیل یہ تھی کہ عقیدتاً وہ جوش صاحب کے عقیدے کے خلاف نہیں ہیں، لیکن ان کے اخبار عوام کے لیے بھی ہیں۔ اس کے علاوہ "ہند" اخبار اور پریس میں ڈیڑھ سو کارکن بھی کام کرتے ہیں۔ اس لیے جوش صاحب کی یہ نظمیں اگر "ہند" میں شایع ہوگئیں تو دونوں اخبار یا تو بند ہوجائیں گے یا حکومت انھیں بند کردے گی بھاری ضمانتیں طلب کرے گی یا طویل اور اُلجھے ہوئے مقدمات میں پھنسا دے گی۔ ہر بات کے نتیجے میں اخبارات اور پریس کا بند ہوجانا لازمی ہے۔ ترقی پسند سیاست اور ادب کو ان کے بند ہوجانے سے جو نقصان پہنچے گا وہ اپنی جگہ ناقابلِ تلافی ہوگا لیکن جو کارکن بیکار ہوجائیں گے انھیں کہیں روزگار نہ مل سکے گا ——— مولانا کی یہ بات میری سمجھ میں آگئی۔ چنانچہ میں نے جوش صاحب کی نظموں کو شایع نہیں کیا۔

میرے جو مضمون پابندی سے بین الاقوامی مسائل پر شایع ہوتے تھے۔ مولانا ملیح آبادی نے اُن میں سے بعض کا عربی میں ترجمہ کرکے انھیں مصر اور شام کے بعض سوشلسٹ اخباروں میں بھی شایع کرایا تھا۔ مولانا جامع ازہر (قاہرہ) کے فارغ التحصیل تھے اور مصر و شام کے صحافتی حلقوں سے ان کا رابطہ قایم رہتا تھا۔ وہ دو چار سال میں مصر اور شام کا دورہ بھی کرتے تھے۔ لیکن میرے یہ مضمون اردو داں سوشلسٹ طبقے میں بہت مقبول تھے۔ یہ زمانہ مسلم لیگ کے اُبھار کا بھی زمانہ تھا اور بڑی تیزی سے مسلم لیگ مسلم عوام میں مقبول ہوتی جا رہی تھی۔ عام مسلمانوں نے "ہند" کو ناپسند کرنا شروع کردیا تھا۔ اس کے مقابلے میں مولانا شائق احمد عثمانی روزنامہ "عصرِ جدید" نکالتے تھے۔

"عصرِ جدید" خالصتاً مسلم لیگی اخبار تھا اور تیز رفتاری سے ہر دل عزیزی حاصل کرتا جا رہا تھا۔ مسلمانوں میں "ہند" کی ناپسندیدگی کی وجہ سے اُس کی اشاعت گر رہی تھی اور اُس کی مالی حالت پر بھی بہت خراب اثر پڑ رہا تھا۔ مولانا بہت پریشان تھے۔ البتہ بنگال کے انقلابی نوجوانوں میں "ہند" بہت مقبول تھا۔ لیکن ان کی پسند اور حمایت اُسے مالی سہارا نہ دے سکتی

تھی کیونکہ ان کی تعداد بہت ہی کم تھی اور انگریزوں کے عہدِ حکومت میں یہ سب گردن زدنی تھے۔ مولانا کی پریشانی اپنی جگہ بالکل درست تھی۔ مجھے سارے حالات کا علم تھا۔ لیکن میرے پاس بھی تو کوئی تعمیری تجویز ایسی نہ تھی جو کارگر ہو سکتی۔ یہ ضرور ہے کہ مولانا کی سارے ہی مشہور کمیونسٹ بنگالی لیڈروں سے دوستی تھی۔ اور بہت معروف کمیونسٹ لیڈر جیسے دت مجمدار، دادا ابراہیم، بنکم مکرجی اور سومناتھ لہری، وغیرہ اکثر "ہند" کے دفتر میں مولانا سے ملنے کے لیے آتے رہتے تھے۔ ان سے کمیونسٹ پارٹی کے پروگرام، پالیسی اور پارٹی پروپیگنڈے کی تکنیک پر تبادلۂ خیال ہوتا رہتا تھا۔ کبھی کبھی مولانا مجھے بھی ایسی گفتگو میں شریک کر لیتے تھے۔ اس کا مقصد واضح تھا۔ یعنی میں "ہند" میں کمیونزم اور سوشلزم کے اصولوں اور پارٹی کے پروگراموں کی اشاعت کے طریقوں سے آگاہ رہوں۔ دراصل یہ کمیونسٹ لیڈر مجھ سے جب بھی گفتگو کرتے تو اُن کا رویّہ ایک ایسے استاد کا ہوتا جو کسی نو آموز کو سبق پڑھا رہا ہو۔ ہر بار اُن سے گفتگو کے بعد مجھے کمیونزم کے سلسلے میں اپنی کم مائگی کا شدید احساس ہوتا تھا۔ احساسِ کمتری کے باعث مجھے یہ ملاقاتیں بالکل نہ بھاتی تھیں۔ اور میں ذہنی طور پر کچھ مضطرب رہتا تھا۔ لیکن مجھے یہ قطعی تجربہ ہوا کہ کمیونسٹ ایسے مرحلوں پر اپنے حامیوں بلکہ حامی اخباروں کی مالی امداد نہیں کرتے۔ سرمایہ دار اپنے حامیوں کو خفیہ اور بعض اوقات علانیہ طور پر ضرورت کے مطابق امداد دیتے ہیں شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ کمیونسٹوں کے پاس دولت کا فقدان رہتا ہے اور ان کی تنظیمیں اگر حکومت کی شکل میں نہ ہوں تو وہ سرمایہ داروں کے مقابلے میں دولت سے ذرائع ابلاغ کو اپنا حامی نہیں بنا سکتیں۔ کیونکہ کمیونسٹ پارٹیاں اور اُن کی تنظیمیں خالصتاً مزدوروں کے چندوں سے ہی زندہ رہتی اور اپنا کام کرتی ہیں۔ مولانا ملیح آبادی اور کمیونسٹ لیڈروں میں "ہند" کی سقیم مالی حالت پر کافی دن گفتگو ہوتی رہی "ہند" موجودہ انتظامیہ کے تحت جاری نہ رہ سکتا تھا۔ مگر کمیونسٹ پارٹی یہ نہیں چاہتی تھی کہ اُن کا ایک عظیم اور طاقتور حامی روزنامہ اخبار بند ہو جائے۔ اس وقت سارے ہندوستان میں تنہا "ہند" ہی ایک ایسا مشہور روزنامہ تھا جو کمیونسٹوں کی بھرپور حمایت کرتا تھا۔

اب ایسا مرحلہ آ چکا تھا کہ اگر "ہند" کے مالی حالات پر فوری طور پر قابو نہ پایا جاتا تو یہ اخبار بند ہو جاتا۔ پریس کا بند ہو جانا بھی یقینی تھا۔ بالآخر کمیونسٹ پارٹی نے مولانا ملیح آبادی سے ایک سودا کیا اور دونوں اخباروں اور پریس کا کام سنبھال لیا۔ اب مولانا کی "ہند" میں کوئی خاص اہمیت نہ تھی۔ اُن کو ہر ماہ ایک مقررہ رقم مل جاتی تھی۔ "ہند" کا زیادہ تر عملہ تبدیل کر دیا گیا تھا اور اس میں کمیونسٹوں کے پسندیدہ ملازم رکھ لیے گئے تھے۔ لیکن مجھے ملازمت سے جواب نہیں دیا گیا تھا۔

شامتِ اعمال

کلکتہ اُس دور میں بنگال کے انقلابی دہشت پسندوں کا مرکز تھا۔ بلکہ پنجاب اور دوسرے صوبوں کے دہشت پسند بھی کلکتہ آ کر روپوش ہو جاتے تھے۔ انگریزوں کی پولس دہشت پسندوں کے گروہ کی روزانہ چھان بین کرتی رہتی تھی۔ پکڑ دھکڑ بھی جاری تھی اور بموں کے دھماکے بھی ہوتے رہتے تھے۔ "ہند" اپنے انداز میں دہشت پسندی کی دبی مخالفت لیکن اُن کے جذبے کی حمایت کرتا تھا۔ اُس کے اداریوں میں کمیونسٹ پارٹی کی لائن کا خیال رکھا جاتا تھا۔ ابھی یہ اخبار پوری طرح کمیونسٹوں کے ہاتھ میں نہ گیا تھا کہ ایک صبح جھاؤتلہ اسٹریٹ میں میرے فلیٹ پر سی آئی ڈی کے دو افسر اور چند افراد آ گئے۔ انھوں نے چار گھنٹے مجھ سے بہت بُرا برتاؤ کیا۔ اُن کا بڑا افسر ایک پنجابی ہندو انسپکٹر تھا۔ یہ افسر بڑی درشت

مزاجی سے پیش آرہا تھا۔ اُس نے مجھے کافی زدوکوب کیا اور طمانچے مارے۔ یہ سی آئی ڈی والے مجھ سے ایک دہشت انگیز کا اتہ پتہ پوچھ رہے تھے۔ کیونکہ دو تین دن پہلے وہ دہشت پسند "ہند" کے دفتر گیا تھا اور اس نے ایک مضمون "ہند" میں اشاعت کے لیے دیا تھا۔ سی آئی ڈی والوں نے "ہند" کے دفتر سے مضمون کا مسودہ حاصل کرلیا تھا اور ایک پارٹی مجھ سے میرے فلیٹ پر اس کے بارے میں پوچھ گچھ کے لیے آئی تھی۔ ایک پارٹی دفتر میں ہی مولانا ملیح آبادی سے اور بعض دوسرے ورکروں سے پوچھ گچھ کررہی تھی۔ میں اُس روز چار گھنٹے سے زیادہ لیٹ ہوگیا اور دفتر نہ پہنچ سکا۔ سی آئی ڈی سے دفتر میں نمٹنے کے بعد مولانا کو معلوم ہوا کہ میں دفتر نہیں پہنچا ہوں تو انھیں شبہ ہوا کہ شاید مجھے گرفتار کرلیا گیا ہے۔ چنانچہ وہ فوراً کار میں میرے فلیٹ پر پہنچ گئے۔ مولانا نے دیکھا کہ میری حالت ناگفتہ بہ تھی۔ سی آئی ڈی والے مجھ پر جسمانی تشدد کررہے تھے۔ میں نے مختصراً مولانا کو بتایا کہ یہ لوگ مجھ سے جتندر نامی نوجوان کا پتہ پوچھ رہے ہیں اور مجھ پر سختی کررہے ہیں تو مولانا نے مداخلت کی۔ مولانا سے اُن کی کافی دیر تلخ کلامی ہوتی رہی۔ لیکن انھوں نے مولانا کے کسی احتجاج کی پروا نہیں کی۔ اُس زمانے میں مرحوم مولوی فضل الحق (شیرِ بنگال) بنگال کے وزیر اعظم تھے۔ مولانا کے اور اُن کے کچھ باہمی تعلقات بھی تھے۔ مولانا ملیح آبادی نے مسلم لیگ کے مقابلے میں مولوی فضل الحق کی کرشک پرجا پارٹی کی حمایت کی تھی۔ مولانا ملیح آبادی نے اُسی وقت مولوی صاحب کو کہیں سے فون کیا۔ مولوی صاحب کی رہائش گاہ جھاؤ تلہ سٹریٹ میں، میرے فلیٹ سے کوئی دو فرلانگ کے فاصلے پر تھی۔ چنانچہ وہ مولانا فضل الحق صاحب کے پاس پہنچ گئے اور پندرہ بیس منٹ میں مولوی صاحب اُن کے ساتھ ہی میرے فلیٹ پر پہنچ گئے۔ اور مجھے انگریزوں کی سی آئی ڈی کے ان کتوں سے نجات دلائی۔ اسی اثنا میں اینگلو انڈین آئی جی بھی مولوی صاحب کی طلبی پر وہاں پہنچ گیا اور اُس نے کھڑے کھڑے اُس ہندو انسپکٹر کو معطل کرنے کے احکام دے دیے جو مجھ پر سختی کررہا تھا۔ میں زندہ بچ گیا تھا لیکن اس واقعہ سے میرے اعصاب ہل کر رہ گئے تھے۔ فوری طور پر تو چھٹکارا ہوگیا تھا۔ لیکن مجھے معلوم ہوا کہ اس واقعہ کے بعد سی آئی ڈی مسلسل میری نگرانی کرتی رہی۔

کمیونسٹ صحافت سے پریشانی

کمیونسٹ ہاتھوں میں "ہند" کے چلے جانے کے بعد مینجنگ ایڈیٹر مسٹر سومناتھ لہری نے مجھے نکالنے کی کوئی کارروائی نہیں کی۔ لیکن میں نے کمیونزم کے صحافتی معیار اور اس کی پالیسی پر عمل درآمد کے لیے خود کو بالکل نااہل پایا۔ میں بڑی مصیبت میں گرفتار ہوگیا تھا۔ ترقی پسندی اور سوشلزم میں عقیدہ رکھنے کے باوجود لکھنے کی آزادی بالکل چھن چکی تھی۔ "ہند" کا اداریہ لکھنے میں جو مشکل پیش آتی تھی وہ محتاجِ بیان نہیں۔ تین کمیونسٹ لیڈروں کا ایک سیل (CELL) یا خفیہ کمیٹی بنائی گئی تھی جو اخبار کی پالیسی کی نگرانی کرتی تھی اور روزانہ کے کام کی جانچ پڑتال بھی۔ ایک ہفتے کے بعد ہی سومناتھ لہری نے میرے لکھے ہوئے اداریوں پر اعتراض شروع کردیے تھے۔ یہ اعتراض کچھ اس قسم کے ہوتے تھے کہ۔ "تم نے فلاں مسئلے پر جو بات لکھی ہے وہ ہماری پارٹی لائن کے مطابق نہیں۔ ہم کمیونزم میں فلاں لفظ بالکل استعمال نہیں کرتے۔ کانگریس کے فلاں مسئلے کے اُس پہلو سے ہم کو اتفاق ہے دوسرے پہلو سے اختلاف یا مسلم لیگ کا رول فلاں اعتبار سے صحیح ہے مگر اس خاص مسئلے پر بالکل غلط "۔۔۔۔۔۔ روز روز کے اس جھنجھٹ سے میں عاجز آچکا تھا اس لیے میں نے لہری کو تجویز پیش کی کہ اداریہ وہ خود لکھا کریں۔ لیکن یہ بات

نہیں مانی گئی۔ اس کے متبادل یہ تجویز پیش کی گئی کہ وہ مجھے روزانہ بریف کریں گے جس کے بعد میں اداریہ لکھا کروں گا۔
اب روزانہ صبح دس بجے میں سبق پڑھنے جاتا۔ لیکن اس سے پہلے صبح کے اخبار مجھے اس طرح پڑھنے پڑتے کہ کوئی سطر
چھوٹ نہ جائے۔ میری ایک بہت بڑی نااہلی یہ تھی کہ میں بنگلہ زبان نہ جانتا تھا نہ بنگالی اخبار پڑھ سکتا تھا۔ میری اس
کمزوری کا اکثر تذکرہ رہتا اور بار بار مجھ سے کہا جاتا کہ جلد از جلد بنگلہ زبان سیکھ کر اپنے آپ کو اس قابل بنالوں کہ بنگالی اخبار
پڑھ سکوں۔ یہ مطالبہ میرے لیے اخبار کی مصروفیات کے سبب قابلِ عمل نہ تھا۔ البتہ جب بھی فرصت ملتی تو میں ایک
بنگالی دوست سے دو تین مشہور بنگالی اخبار "آنند بازار پتریکا" اور "جگانتر" کے اداریے پڑھوا کر ان کا ترجمہ سمجھنے کی
کوشش کیا کرتا۔ لیکن یہ کوشش فضول تھی ——— صبح دس بجے سے ایک بجے دوپہر تک لہری مجھے اُس روز کے
اداریے پر ہدایات دیتے اور سمجھاتے کہ کس لب و لہجے اور کس انداز سے اداریہ لکھوں۔ دو بجے میں اداریہ لکھنا شروع کرتا۔
چار بجے کے لگ بھگ یہ اداریہ سنسر ہوتا اور پھر چار بجے تک اشاعت کے لیے بھیجا جاتا۔

میرے فرائض یہیں ختم نہیں ہو جاتے تھے۔ میں ساری خبروں کا بھی ذمہ دار تھا۔ میرا فرض یہ دیکھنا بھی تھا کہ کوئی خبر
کمیونسٹ پالیسی یا آئیڈیالوجی کے خلاف شایع نہ ہو جائے۔ اداریہ کی طرح خبروں میں بھی کوئی اصطلاح، کوئی جملہ، کوئی
لفظ "پارٹی لائن" کے خلاف نہ ہونا ضروری بلکہ لازمی تھا۔ اس لیے دن بھر اخبار بینی اور اداریہ نویسی کے بعد رات کو دو بجے
تک مجھے ہر خبر پڑھنی اور ترمیم و اصلاح کرنی پڑتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ اخبار روزانہ لیٹ ہو جاتا اور صبح نو دس بجے جب
اخبار چھپ کر آتا تو سیل میں پڑھا جاتا۔ ورکر اس پر بے تحاشا نکتہ چینی ہوتی، جس سے مجھے صدمہ پہنچتا۔ بالآخر کمیونسٹ
مالکوں کی مرضی کے مطابق جب میں کام انجام دینے سے قاصر رہا تو اوائل ۱۹۳۶ء میں اخبار سے مستعفی ہو گیا۔

"ہند" کے کمیونسٹ قبضے میں جانے کے بعد مجھے ادبی میدان میں بھی کافی پسپائیاں نصیب ہوئیں۔ ہفتہ وار یا
روزانہ "ہند" میں، بین الاقوامی مسائل پر جو آرٹیکل میں لکھا کرتا تھا وہ بند کر دیا گیا۔ ہفت روزہ ہند میں اب میرے
افسانے شایع نہیں ہو سکتے تھے، بلکہ دوسرے لکھنے والوں کی تخلیقات پر بھی ایک نوع کی پابندی لگ گئی تھی۔ اب
ان دونوں اخبارات میں پارٹی سے منظور شدہ افسانے یا ادبی مضامین چھپتے تھے اور یہ سومناتھ لہری کے توسط ہی سے
اشاعت کے لیے دیے جاتے تھے۔

مجھے کسی دوسرے اخبار میں کام نہ مل سکا۔ اردو کا کوئی کانگریسی اخبار کلکتہ سے نکلتا ہی نہ تھا۔ البتہ دو مسلم لیگی
اخبار تھے اور دونوں نے مجھے ملازم رکھنے سے انکار کر دیا تھا جس کی وجہ "ہند" سے وابستگی تھی۔ کلکتہ کے فلیٹ میں سامان
مقفل کر کے میں پٹنہ، پھر دہلی آیا۔ لیکن فوراً کام نہ ملنے کی وجہ سے کلکتہ لوٹ آیا۔ اب میرے پاس بالکل پیسے نہ تھے۔
کھانے پینے کے بھی لالے تھے۔ لیکن جب کلکتہ پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میرے فلیٹ میں ایک بنگالی بابو براجمان
ہیں۔ قفل توڑ کر میرا فلیٹ بنگالی مالک نے اُن کے حوالے کر دیا تھا۔ جب مالک مکان سے مل کر میں نے شکایت کی
تو اُس نے مجھی کو ڈانٹ پلائی۔ اور کہا کہ تم نے دو تین مہینے کا کرایہ بھی نہیں دیا ہے۔ بے شک میں نے کرایہ ادا نہیں کیا
تھا۔ لیکن قفل توڑنے اور سامان اِدھر اُدھر کرنے کا اُسے حق نہ تھا۔ چنانچہ میں نے دھمکی دی کہ میں اس سارے واقعہ
کی پولس میں رپورٹ کرتا ہوں۔ پولیس کے نام سے بنگالی مالک اور بنگالی کرایہ دار دونوں ہی خوف زدہ ہو گئے۔ دونوں نے

نرم رویہ اختیار کیا اور مجھے اطمینان دلایا کہ میرا سارا سامان محفوظ ہے، لیکن جائزہ لینے پر معلوم ہوا کہ میری میز، کتابیں، کرسیاں، برتن اور چھوٹی موٹی دوسری بہت سی اشیا غائب تھیں۔ میں محسوس کر چکا تھا کہ پولس کے نام سے مالک، مکان ڈر گیا ہے۔ دونوں نے میری کافی خوشامد کی کہ پولس میں نہ جاؤں۔ ساتھ ہی مجھے پیش کش کی کہ میں باقی کرایہ کی رقم بھی ادا نہ کروں اور جو سامان غائب ہے اُس کی قیمت لے لوں۔ دو تین گھنٹے کی جھک جھک کے بعد میں ساڑھے تین سو روپے معاوضہ لینے پر رضامند ہو گیا۔ پیسے کچھ دنوں کا سہارا بن سکتے تھے۔ لیکن میں رہتا کہاں ——؟ مجبوراً ایک رات ایک سستی سی سرائے میں گزار کر دوسرے ہی روز بھوپال کے لیے روانہ ہو گیا ——

چند مہینے بھوپال میں

میری غیر حاضری میں شاکر علی خاں اور انجمن خدام وطن کی تحریک جمہوریت نے بھوپال میں بڑی وسعت اور ہر دل عزیزی حاصل کر لی تھی۔ شاکر علی خاں مجھ سے سخت ناراض تھے۔ ان کی خفگی کا سبب میری غیر مستقل مزاجی تھی۔ اُن کا یہ خیال صحیح تھا کہ میں وقفہ وقفہ سے کبھی سیاست میں شرکت کرتا تھا اور کبھی اخبارات میں ملازمت کے لیے بھاگ کھڑا ہوتا ہوں۔ بات صحیح ہونے کے باوجود شاکر صاحب کے طنز سے مجھے سخت صدمہ پہنچا اور شدت جذبات میں میں نے شاکر علی خاں سے صرف یہ کہا کہ میں اب سیاسیات میں حصہ نہیں لوں گا۔ شاکر صاحب میرے بچپن کے دوست ہیں۔ مجھ سے لپٹ گئے اور معافیاں مانگنے لگے۔ انھوں نے کہا "میرے کہنے کا برا نہ مانو، تمھیں کیا معلوم، تم تحریک کو اخباروں میں رہ کر کتنی تقویت پہنچاتے ہو، تم نے جس جس پیرائے میں ہماری تحریک ذمہ دار حکومت اور اسٹیٹ پیپلز کانفرنس کی تبلیغ کی ہے اور اُس سے ہمیں جتنا فائدہ پہنچا ہے اس کا تمھیں بالکل اندازہ نہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ حکومت کے وزیر یہ چاہتے ہیں کہ تم اخباروں میں کام کرنا چھوڑ دو اور بھوپال واپس آ جاؤ۔ وہ اس سلسلے میں کیسی کیسی پیش کش کر چکے ہیں اس کا جلد ہی علم ہو جائے گا۔

شاکر علی خاں کا خیال صحیح تھا۔ میرے واپس آتے ہی حکومت کے حلقوں میں ایک گونہ اطمینان سا ہو گیا تھا۔ تھوڑے دن کے بعد ہی نواب بھوپال مرحوم کے ایک معتمد وزیر اور مشیر خاص مسٹر شعیب قریشی مرحوم (مولانا محمد علی جوہر مرحوم کے داماد) کا ایک رسمی دعوت نامہ مجھے ملا جس میں انھوں نے مجھے اپنے بنگلے پر چائے پینے کی دعوت دی تھی۔ دعوت نامہ میں نے شاکر علی خاں اور چتر نرائن مالوی کو دکھایا۔ انھوں نے کہا ایسے دعوت نامے ہمیں بھی ملے ہیں اور مولانا سعید رزمی اور اُن کی پارٹی کے بعض ارکان کو بھی۔ دو ایک دن میں ہم تم اس پر جماعت میں غور کریں گے۔ ہماری جماعت کی مجلس عاملہ نے یہ دعوت مسترد کر دی اور شعیب صاحب کو جواب دے دیا کہ ہم مجبور ہیں۔ البتہ اگر آپ پسند فرمائیں تو جماعت کے تین چار ارکان اس دعوت کے بعد کسی روز آپ سے مل سکتے ہیں۔

شعیب صاحب سے ایک ہفتے کے بعد ملاقات ہوئی، بالکل واجبی اور سرسری سی ملاقات تھی، جس میں شعیب صاحب نے صرف یہ تشریح کی کہ کسی سیاسی مقصد کی خاطر دعوت نہیں دی گئی تھی محض ملاقات مقصود تھی۔ سیاسیات پر بھی کچھ باتیں ہوتی رہیں کیونکہ شعیب صاحب خود بھی ہندوستان کے ایک مشہور سیاسی لیڈر رہ چکے تھے اور ہمیشہ ہندوستان کی آزادی کی باتیں کرتے رہتے تھے۔ انھوں نے یہ اعتراف کیا کہ ریاستوں میں بھی اصلاحات ضروری ہیں۔ لیکن مسئلہ الجھا ہوا ہے

ریاستی اور انگریزوں سے آزادی حاصل ہونے سے پہلے اسے حل نہیں کیا جاسکتا۔ اُن کا موقف یہ تھا کہ برطانوی ہند اور ریاستی ہند کی آزادی کے مسئلے دو مختلف النوع مسئلے ہیں۔ انھوں نے بڑے دعوے کے ساتھ یہ بات کہی کہ مہاتما گاندھی، مولانا ابوالکلام آزاد اور مسٹر رفیع احمد قدوائی کی بھی یہی رائے ہے اور ان تینوں لیڈروں نے پچھلے دنوں نواب صاحب بھوپال سے اپنی ملاقاتوں میں، انھیں خیالات کا اظہار کیا ہے۔ شعیب صاحب صحیح کہتے تھے۔ کیونکہ کانگریس کی ہائی کمان میں بھی اس مسئلے پر دو مختلف نقطۂ نظر تھے۔ جواہرلال نہرو، ڈاکٹر پٹابھی سیتا رامیہ اور کانگریس سوشلسٹ برطانوی ہند کے دوش بدوش ریاستوں میں بھی جمہوری اصلاحات کے پرزور حامی تھے اور مہاتما گاندھی کے چیلے وہی رائے رکھتے تھے جس کا شعیب صاحب نے اظہار کیا تھا۔ ہماری ملاقات بے سود رہی کیونکہ ریاستوں کی تحریک جواہرلال نہرو اور شیخ عبداللہ کی قیادت میں بہت آگے بڑھ چکی تھی اور بعض بڑی ریاستوں نے تحریک کے دباؤ سے جمہوری اور ذمہ دار نظام حکومت کی جانب کچھ قدم بھی اٹھائے تھے —— چند مہینے میں ریاستی سیاسیات میں اُلجھا رہا اور اپنے مستقبل کے بارے میں بھی سوچتا رہا۔

قیام بھوپال کے دوران میری ادبی سرگرمیوں میں، پھر جان پڑ گئی تھی۔ بھوپال کے نوجوان ادیبوں میں ترقی پسندی کے رجحانات بڑھ رہے تھے۔ ان میں ضیا لکھنوی، احمد علی خاں، اشتیاق عارف، رشدی، ابراہیم یوسف، قمر جمالی، محمد علی تاج، جوہر قریشی، سلمان الارشد اور کوکب جمیل وغیرہ کافی سرگرم تھے۔ ان کے علاوہ مرزا اشفاق بیگ، محمد مہدی اور مسعود علی خاں بھی ان نوجوانوں کے ہمدرد و معاون تھے۔ بھوپال کی انجمن ترقی پسند مصنفین بے حد سرگرم اور باعمل تنظیم تھی۔ میں بھی انجمن کے جلسوں میں شرکت کرتا رہتا تھا۔ امید افزا بات یہ تھی کہ ریاستی حکومت کے ایک بہت مقتدر وزیر مفتی انوارالحق (مرحوم) اکثر و بیشتر ترقی پسند نوجوانوں کو بلاتے اور مشورے دیتے رہتے تھے۔ وہ ترقی پسند ادبی تحریک کی نہ صرف ہمت افزائی بلکہ در پردہ مالی امداد بھی کرتے رہتے تھے۔ مفتی صاحب (مرحوم) ایک عظیم اسکالر اور عالم تھے۔ عربی فارسی، انگریزی اور اردو ادب پر اُن کی گہری نظر تھی۔ لیکن اُن کی عام شہرت یہ تھی کہ وہ شدید قسم کے متعصب مذہبی انسان ہیں۔ لیکن ترقی پسندوں کے سامنے انھوں نے کبھی ایسے خیالات کا اظہار نہیں کیا۔ اس کے برعکس وہ اُن کٹھ ملاؤں اور رجعت پسندوں کی شدید مخالفت کرتے تھے جو انجمن ترقی پسند مصنفین کو کمیونسٹوں کا آلۂ کار قرار دیتے تھے۔ حالانکہ اس انجمن سے قاضی عبدالغفار، مولوی عبدالحق، جوش ملیح آبادی اور کئی ممتاز اکابر وابستہ ہو چکے تھے اور یہ سب غیر کمیونسٹ تھے۔

کچھ عرصے کراچی اور بلوچستان میں

بھوپال میں بغیر کسی روزگار اور ذریعہ آمدنی کے جب میں عملاً بھوکا مرنے لگا تو گھبرا اُٹھا اور اخباروں میں کراچی اکاڈمی کا ایک اشتہار دیکھ کر میں نے ملازمت کی درخواست بھیج دی۔ اکاڈمی میں ہائی سکول ٹیچر کی چند آسامیوں کا اشتہار دیا گیا تھا۔ میری درخواست منظور ہو گئی اور میں کراچی روانہ ہو گیا۔ ستر روپے تنخواہ تھی اور اسکول میں میں انگریزی کا استاد تھا۔ مجھے یاد ہے یہ زمانہ اس قدر فراوانی کا تھا کہ بندر روڈ پر سندھ زمیندار ہوٹل کے ایک کمرے کا ماہانہ کرایہ مجھے صرف نو روپے ادا کرنے پڑتے تھے۔ اس کے

مالک ایک سندھی زمیندار تھے، جن کے صاحبزادے کا نام غلام حسین تھا۔ غلام حسین میرے دوست بن گئے تھے اور میرا بہت خیال کرتے تھے۔ اسی ہوٹل کے کمرہ نمبر ۹ میں میں مقیم تھا اور کمرہ نمبر ۱۰ میں میرے ہمسائے مسٹر امین کھوسو تھے۔ امین کھوسو سندھ اسمبلی کے ممبر تھے، بڑے ترقی پسند اور قوم پرست واقع ہوئے تھے۔ مجھ سے اکثر و بیشتر گفتگو باتیں ہوتی تھیں۔ میں انھیں اور وہ مجھے پسند کرتے تھے۔ وہ میرے سیاسی نظریات اور صحافیانہ زندگی سے بہت متاثر تھے۔ اور انھوں نے مختلف اوقات میں متعدد سندھی لیڈروں اور سیاسی کارکنوں سے میرا تعارف اور ملاقات کرائی تھی۔ ان میں سب سے اہم شخصیت خان عبدالصمد خان اچکزئی کی تھی جو اکثر کراچی آتے رہتے تھے اور اکثر اسی ہوٹل میں قیام کرتے تھے۔ خان اچکزئی (مرحوم) اور امین کھوسو بہت اچھے دوست اور ہم خیال سیاسی لیڈر تھے۔ خان عبدالصمد خان، "بلوچستانی گاندھی" کہلاتے تھے۔ اور بلوچستان میں کانگریس کے قیام اور اس کی نشو و نما میں اُن کا بڑا حصہ تھا۔ "مدینہ بجنور" اور "ہند کلکتہ" دونوں کے پُرانے خریدار تھے۔ اس لیے صحافت میں میرے نام اور میرے کام سے بھی واقف تھے۔ پہلی ملاقات میں جب انھیں معلوم ہوا کہ میں صحافت و ادب کے بجائے اسکول ٹیچری کر رہا ہوں، تو انھوں نے بڑا تعجب کیا۔ میں نے اُن سے اپنی معاشی حالت چھپائی نہیں۔ لیکن انھوں نے مجھے اس فیصلے پر ہمیشہ شرمسار کیا۔ وہ کہتے تھے کہ صحافی یا تو صحافت کر سکتا ہے یا بھوکا رہ سکتا ہے۔ اس لیے تم صحافت میں لوٹ جاؤ۔ مگر میں کہاں جاتا۔ خان اچکزئی سے کراچی میں چند ملاقاتیں ہوئیں۔ امین کھوسو بھی ان ملاقاتوں میں شریک تھے اور انھیں ملاقاتوں میں خان مرحوم نے ایک بار ارادہ ظاہر کیا کہ وہ بلوچستان سے ایک اخبار نکالنا چاہتے ہیں۔ مجھ سے دو چار دن وہ مشورہ کرتے رہے۔ اس کے دہلی گئے اور وہاں جمعیتہ العلما کے لیڈروں اور صحافیوں سے مشورہ کیا۔ واپسی میں وہ پھر کراچی آئے اور مجھے بتایا کہ انھوں نے ایک ہفت روزہ اخبار نکالنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ لیکن پہلے وہ پریس قایم کرنا چاہتے ہیں۔ بلوچستان لوٹ کر پریس قایم کرنے کی کوشش خان اچکزئی نے پوری سنجیدگی سے شروع کر دیں۔ مجھے اس اظہار میں ذرا بھی تامل نہیں کہ خان اچکزئی بلوچستان کے سب سے زیادہ ہر دل عزیز رہنما تھے۔ اسی کے ساتھ ساتھ وہ اتنے سرگرم، باعمل اور مستعد انسان تھے کہ چند ماہ کے عرصے میں خود انھوں نے "عزیز پریس" کے نام سے کوئٹہ کی پرنس روڈ پر ایک اچھا پریس قایم کر دیا۔ یہ بلوچستان میں پہلا مشینی پریس تھا۔ اس کے فوراً بعد انھوں نے اخبار نکالنے کی تیاریاں شروع کر دیں اور ہفت روزہ "استقلال" کا ڈکلریشن حاصل کر لیا۔

تین مہینے خان (مرحوم) نے "استقلال" کے مستقل خریدار بنانے کے لیے سارے بلوچستان کا دورہ کیا اور اس دورے میں آٹھ دس ہزار مستقل خریدار بنا لیے اور کم و بیش پچاس ہزار روپے کا فنڈ اکٹھا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ۱۹۳۸ء کے آخر میں خان موصوف پھر کراچی آئے اور مجھے "استقلال" کی ادارت کی پیش کش کی۔ میں خوشی سے راضی ہو گیا۔ کوئٹہ واپس جانے کے بعد انھوں نے کاتبوں کا انتظام کیا اور نومبر میں مجھے کوئٹہ بلا لیا۔ "استقلال" بلوچستان کی آواز تھا اور ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جاتا تھا۔ اچکزئی (مرحوم) اخبار کا اداریہ خود ہی لکھتے تھے کیونکہ بلوچستان کے مسائل سے میں اتنا واقف نہ تھا۔ لیکن فرصت کے اوقات میں وہ مجھے بلوچستان کے مسائل سے بھی آگاہ کرتے رہتے تھے۔ اُن کے رفیقوں میں شہباز خاں نوشیروانی اور ارباب عبدالقادر بھی تھے۔ ارباب عبدالقادر، ارباب کرم خاں کے صاحبزادے تھے جو اس زمانے میں قلات کی ریاست کے وزیر اعظم تھے۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ احباب اب کہاں ہیں۔ ؟

انکار

قدوس صہبائی

بلوچستان اُس دور میں پوری طرح قبائلی سوسائٹی کا مرقع تھا۔ اسی کے ساتھ فیوڈل نظام کا گڑھ بھی کہا جا سکتا تھا۔ وہاں صرف حکم حاکم چلتا تھا کسی نظام حکومت یا آئین وقانون کا نام نشان نہ تھا۔ انگریز حاکموں کی جتنی شدید گرفت بلوچستان پر تھی آج میں اُس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ "استقلال" کے دفتر اور خان اچکزئی (مرحوم) کے مکان کے گرد اگرد بیسیوں سی آئی ڈی کے لوگ ہمہ وقت موجود رہتے تھے۔ چند مہینے مجھے کام کرتے گزر گئے۔ ۱۹۳۹ء کا زمانہ اس اعتبار سے بڑا پرآشوب تھا کہ یہ ہٹلر کے عروج کا زمانہ تھا۔ یورپ پر جنگ کے بادل چھائے ہوئے تھے اور وقت کے ساتھ ساتھ محسوس ہوتا تھا کہ بس عالمگیر جنگ شروع ہونے والی ہے اور یہ اندیشہ درست ثابت ہوا۔

مجھے ٹھیک سے یاد نہیں کہ خان اچکزئی (مرحوم) کو اگست ۱۹۳۹ء میں نظر بند کر دیا گیا، انھیں صوبے سے نکال دیا گیا تھا۔ بہر حال وہ اُس وقت کوئٹہ میں موجود نہیں تھے۔ اگست کا ابتدائی زمانہ تھا کہ پولس نے عزیز پریس کو مقفل کر کے سیل کر دیا اور یوں اخبار بھی بند ہو گیا۔ میں حیران و پریشان ہوا اور بلوچستان سے چلے جانے کا ابھی فیصلہ بھی نہ کر پایا تھا کہ ایک روز صبح صبح سی آئی ڈی کے چند لوگ آئے اور مجھ سے کہا کہ سپرنٹنڈنٹ صاحب پولس نے آپ کو بلایا ہے۔ انکار کی گنجائش نہ تھی۔ ساتھ ہو لیا۔ یہ اگست کا آخری ہفتہ تھا۔

سپرنٹنڈنٹ صاحب نے میری بڑی خاطر مدارات کی نہایت عمدہ کھانا کھلایا اور گفتگو کے دوران مجھ سے پوچھا کہ میں آخر بلوچستان میں کیوں پڑا ہوا ہوں جب کہ اخبار بند ہو چکا ہے۔ میں کچھ اور تو جواب میں نہ کہہ سکا البتہ میں نے یہ کہا کہ خان اچکزئی سے ایک بار مل لوں، تو سوچوں گا۔ یہ سُن کر انھوں نے کہا کہ میں اُن سے نہیں مل سکوں گا اس لیے مجھے یہاں سے چلا جانا چاہیے۔ میں نے رواداری میں کہہ دیا کہ اچھی بات ہے۔ میں اپنا سامان ٹھکانے لگا دوں اور کچھ اور انتظام کر لوں اس کے بعد چلا جاؤں گا۔ لیکن سپرنٹنڈنٹ صاحب نے مجھ کو اطمینان دلایا کہ سب کچھ ہو جائے گا۔ دوپہر کو جب میں نے مکان واپس جانے کی خواہش ظاہر کی تو انھوں نے اُس انسپکٹر کو اشارا کیا، جو مجھے اُن کے پاس لایا تھا۔ چنانچہ یہ انسپکٹر مجھے بجائے گھر لے جانے کے سیدھا کوئٹہ ریلوے اسٹیشن لے آیا۔ میں پوچھتا رہا کہ آپ مجھے یہاں کیوں لائے ہیں، تو وہ مسکرا مسکرا کر مجھے جواب دیتا رہا کہ آپ مطمئن رہیں یہ ابھی معلوم ہو جائے گا۔ غالباً ساڑھے چار بجے شام کو کوئٹہ سے بلوچستان میل دہلی روانہ ہوتا تھا جب گاڑی پلیٹ فارم پر آ گئی تو انسپکٹر مجھے لے کر ایک سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں آیا۔ میں نے دیکھا کہ میرا بستر، صندوق، سوٹ کیس، ایک بکس میں کتابیں اور کاغذ غرضیکہ جو مختصر سا سامان تھا سب رکھا تھا۔ انسپکٹر نے مجھ سے کہا۔ دیکھ لیجیے آپ کا سب سامان موجود ہے یا کچھ کم ہے۔ میں کچھ سمجھ رہا تھا کچھ نہیں اور خاموش تھا۔ پھر اُس نے کہا کہ آپ کا وہ سامان جو آپ ساتھ نہیں لے جا سکتے تھے فروخت ہو گیا ہے۔ اس میں پلنگ، میز، کرسیاں اور ایک چھوٹی الماری شامل تھی۔ پھر اُس نے مجھے سیکنڈ کلاس کا ایک ٹکٹ دیا جو لکھنؤ تک کا تھا، سامان کی بلٹی، نیز مکان کے کرائے کی رسید حوالے کی اور کہا ذرا احتیاط سے ان چیزوں کو رکھ لیجیے۔ اس کے بعد اُس نے مجھے ایک لفافہ دیا جس میں پانچ سو روپے کے نوٹ تھے، اور کہا کہ یہ آپ کی اگست کے مہینے کی تنخواہ، سفر خرچ اور آپ کے فروخت شدہ سامان کی قیمت ہے۔ جب میں نے اُس سے کہا کہ میری کل رقم تو مشکل سے دو ڈھائی سو روپے ہوگی، تو انسپکٹر نے بتایا کہ اعلیٰ افسروں کا یہ حکم ہے کہ آپ کو یہ رقم دیدی جائے۔ اب آپ جائیے۔

خدا حافظ۔ دہلی سے پہلے کہیں قیام نہ کیجیے گا۔ دہلی میں پنجاب میل کی ایک سیٹ آپ کے لیے ریزرو ہے، تاریخ بدلوانا چاہیں تو بکنگ آفس سے کہہ کر بدلوا لیجیے گا۔ چنانچہ اگست کی ۲۸ تاریخ کو میں دہلی پہنچا اور وہاں اُتر پڑا۔ بکنگ آفس سے دریافت پر معلوم ہوا کہ سیٹ ریزرو ہے۔ میں نے بکنگ آفس میں یکم ستمبر روانگی کی تاریخ درج کرائی اور اسٹیشن سے سیدھا "الجمعیۃ" دہلی کے دفتر گیا۔ وہاں سے پتہ معلوم کرکے مولانا احمد سعید کی قیام گاہ پر اُن سے ملا اور انھیں اپنا احوال سنایا۔ مولانا احمد سعید میری داستان سُن کر بہت ہنسے اور مجھے مبارک باد دے کر کہا "بچو، شکر کرو کہ بچ کر آ گئے ہو۔ جنگ ہونے والی ہے۔ اگر جنگ شروع ہو جاتی اور تم کوئٹہ میں ہوتے تو جیل میں ہوتے۔ بہت خوش قسمت ہو" فضا میں جنگ کی سی گھٹن ضرور تھی۔ لیکن ابھی اعلان جنگ نہیں ہوا تھا۔ ۲ ستمبر کو میں بھوپال پہنچا اور دوسرے ہی روز ۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کو جنگ کا اعلان ہو گیا!

اعلانِ جنگ نے مجھے گم سم کر دیا تھا۔ بھوپال بلکہ ہندوستان بھر میں مخالف سامراج اور مخالف برطانیہ تحریکیں سرد پڑ گئی تھیں۔ ایک ہفتہ کے اندر اندر حکومت نے خدام وطن بھوپال کو ایک معطل سی جماعت بنا دیا تھا۔ لیڈروں کی زبان بندی کر دی گئی تھی اور پولس راج شروع ہو چکا تھا۔ میں تو ابھی سنبھلنے بھی نہ پایا تھا۔ مگر شاکر علی خاں بہت خوش تھے کہ میں واپس آ گیا ہوں۔ انھوں نے پیشین گوئی کی کہ اب ہم سب دو چار سال کے لیے جیل میں رہیں گے۔ لیکن میں جیل جانے کو تیار نہ تھا۔ میں نے شاکر صاحب سے کہہ بھی دیا کہ میں جیل نہیں جاؤں گا لیکن انھوں نے مضحکہ اڑاتے ہوئے کہا کہ اب چاہنے نہ چاہنے کا سوال نہیں تم کو ضرور جیل جانا پڑے گا۔ خیر یہ اچھا ہے کہ تم بھوپال کی جیل میں رہو گے۔ کوئٹہ میں ہوتے تو بہت سخت تکلیف اٹھانی پڑتی ——

جنگ عالمگیر

دوسری جنگ عالمگیر دنیا بھر کے انسانوں کے لیے بڑی بڑی مصیبتیں لے کر آئی۔ ہندوستان اگر آزاد ہوتا تو یقیناً اس جنگ میں شامل نہ ہوتا لیکن انگریزی سامراج کے تسلط نے ہندوستان کو بھی اس جنگ میں جھونک دیا۔ جنگ جو تکالیف اور آفات لاتی ہے اُن کا سب سے زیادہ اثر ملک کی سیاست ادب اور معیشت پر پڑتا ہے۔ بلاشبہ دفاعی جنگ ہر ملک کے لیے جائز ہے۔ اور اس میں جو مصائب بھی عوام کو پیش آئیں وہ انھیں جذبۂ ایثار اور حب وطن کی خاطر بخوشی برداشت کرتے ہیں۔ لیکن وہ جنگ جو لاکھوں کروڑوں انسانوں پر کسی نصب العین یا آئیڈیالوجی کے بغیر لاد دی جائے وہ ہزارہا مصیبتوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ آزادی خواہ جماعتوں اور افراد کے لیے یہ دور بہت ہی نازک اور شدید کرب کا تھا۔ ہم پر جو جو آفتیں اس جنگ کے زمانے میں گزر گئیں اُن سے کچھ وہی لوگ واقف ہیں جو اس تجربے سے گزر چکے ہیں۔ حکومت کا یہ مصمم ارادہ تھا کہ وہ تمام سیاسی لیڈر اور ترقی پسند افراد جو آزادی کی جدوجہد میں کسی عنوان بھی شریک تھے خاموش کر دیے جائیں۔ چنانچہ چند مہینوں کے بعد ہی سنہ ۱۹۴۰ء میں ہم پر ہاتھ ڈال دیا گیا۔ یکے بعد دیگرے سارے ترقی پسند اور سیاسی کارکن گرفتار کر لیے گئے۔ کافی عرصے بغیر مقدمہ چلائے بعض لیڈروں کو نظر بند رکھا گیا۔ پھر مقدمات بنائے گئے اور مختلف الزامات میں ہمیں ڈھائی ڈھائی سال کی سزا سنا دی گئی۔ یہ مہربانی ضرور کی گئی کہ ساری سزائیں ایک ساتھ ہی شروع ہوئیں۔

ڈھائی سال کے بعد ہم رہا ہو گئے۔ اگرچہ ساڑھے بارہ سال کی سزا تھی۔

قدوس صہبائی

جیل ایک ادیب کے لیے نعمت

پورے ڈھائی سال جیل میں بعض دوست بڑے خوش رہے۔ شاکر علی خاں کو تو "طائرِ زنداں" یا "جیل برڈ" کہا جاتا تھا۔ کیونکہ ابتدا ہی سے جب انھوں نے انتہا پسندانہ سیاست میں قدم رکھا تھا وہ کئی بار جیل جا چکے تھے یا نظر بند ہو چکے تھے۔ وہ قہقہے لگایا کرتے تھے یا موٹی موٹی مذہبی اور تاریخی کتب کے مطالعے میں مصروف رہتے تھے۔ میں نے بھی قید و بند کے اس زمانے میں ادب عالیہ، مشہور غیر ملکی مصنفوں اور اردو کے ممتاز ادیبوں کی تخلیقات کا مسلسل مطالعہ جاری رکھا۔ برنارڈ شا، ٹالسٹائی، میکسم گورکی، ٹامس ہارڈی، ایچ جی ویلز، پریم چند کی تصانیف اور مولوی عبدالحق مرحوم اور دیگر نقادوں کی تصانیف پڑھتا رہا اور مجھے محسوس ہوا کہ جیل کم از کم ایسے سیاست زدہ یا صحافت گزیدہ انسان کے لیے ایک ایسی نعمت ہے جو صدیوں کی آزادی بھی مہیا نہیں کر سکتی۔ مطالعہ انسان کی وسعتِ نظر اور فکری تربیت کا سب سے عمدہ ذریعہ ہے۔ چنانچہ مجھے اپنے جیل جانے اور کئی سال جیلوں میں گزارنے کا کبھی افسوس نہیں ہوا، بلکہ زندگی کے ان گرم و سرد تجربات نے میرے ذہنی افق کو روشن کیا اور مجھے ہر آزمائش میں ہمت و حوصلہ عطا کیا۔

رہائی کے بعد جب باہر آیا تو ہر طرف جنگ ہی جنگ کے شعلے رقصاں تھے۔

خودنوشت

کی آیندہ قسط میں

- ہندوستان چھوڑ دو کی تحریک
- ۱۹۴۴ء میں نظام
- ترقی پسند ادبی تحریک کا نشان
- بمبئی میں فسادات
- لاشوں کا شہر
- فروری ۱۹۴۶ء کی بغاوت
- فسادات میں روایتی باقاعدگی
- میں اور پریم ساگر
- بمبئی الٹ پلٹ ہو گیا تھا

اس کے علاوہ تازہ و غیر مطبوعہ تخلیقات کے لئے
آج ہی اپنی کاپی مقامی ایجنٹ سے محفوظ کرا لیجیے
— یا براہِ راست طلب کیجیے —

— افکار، کراچی

مدیر و ناشر: صہبا لکھنوی • طابع: ایجوکیشنل پریس کراچی • دفتر: رابسن روڈ کراچی • کتابت: انوری بیگم دہلوی

نیشنل بینک
آف پاکستان
وقت کے تقاضوں کے دوش بدوش
MNJ
RIO (K) PID

Head Office :
MAKTABA-I-AFKAR
Robson Road,
KARACHI

AFKAR

Bradford Office :
24, PARK HILL DRIVE,
BRADFORD-8.
(YORKS - U.K.)

UNIQUE LITERARY, CULTURAL AND FAMILY JOURNAL

جیٹ سے دھلے لباس
صاف اور ستھرے سارے کے سارے بے داغ اجلے
جیسے نئے ہوں
جیٹ
کے حیرت انگیز جھاگ میں
اُونی، سوتی، ریشمی، سبھی کپڑے بکفایت
دُھل کر فوراً صاف اور اُجلے ہو جاتے ہیں
اور ہاتھ بھی محفوظ رہتے ہیں۔

For White and
Jet

جیٹ سے گھر بھر کے کپڑے پل بھر میں اُجلے